اعلان بابت ملکیت و اشاعت رسالہ "نگار"

(فارم ۴)

۱ — مقام اشاعت = لکھنؤ — ۲ — وقفۂ اشاعت = ماہانہ

۳ - ۴ — پرنٹر و پبلشر کا نام - قومیت و پتہ :- قادر علی — ہندوستانی - نظیر آباد - لکھنؤ

۵ — اڈیٹر کا نام - قومیت و پتہ :- نیاز فتحپوری - ہندوستانی - باغ منو - لکھنؤ

۶ — نام و پتہ مالک :- نیاز فتحپوری - باغ منو - لکھنؤ

میں قادر علی تصدیق کرتا ہوں کہ اندراجات بالا میرے علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

دستخط = قادر علی پبلشر

تاریخ یکم مارچ ۱۹۶۲ء

نیاز فتحپوری کی تین تازہ مطبوعات

قاسم سے محمد بابر تک — اُردو میں اپنے رنگ کی پہلی تاریخ کی کتاب - قیمت :- چھ روپیہ پچاس پیسے (علاوہ محصول)

مشکلات غالب — غالب کے تمام مشکل اشعار کا حل نہایت صاف و سادہ زبان میں۔ قیمت - دو روپیہ پچاس پیسے (علاوہ محصول)

عرض نغمہ — (ترجمہ گیتانجلی ٹیگور) جو عرصہ سے نایاب تھا۔ قیمت :- ایک روپیہ پچیس پیسے (علاوہ محصول) - منیجر نگار

"نگار" کا ہندی شاعری نمبر (دوسرا اڈیشن مع اضافہ) قیمت: چار روپے علاوہ محصول

نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

اکتالیسواں سال	فہرست مضامین مارچ سنہ ۶۲ء	شمارہ ۳

ملاحظات

دستور پاکستان اور حکومت اسلامی کا بنیادی تصور

میرا مقصود اس وقت دستور پاکستان پر تبصرہ کرنا نہیں، کیونکہ نہ وہ ابھی تک سامنے آیا ہے اور نہ میں اس پر کسی رائے زنی کا مجاز ہوں۔ بلکہ صرف یہ خبر سن کر کہ پاکستان کا دستور مرتب ہوگیا ہے جو عنقریب شایع ہونے والا ہے، بے اختیار اب سے تقریباً چودہ سو سال قبل کا وہ زمانہ یاد آگیا جب سب سے پہلے سیاست اسلامی کا بنیادی تصور پیش کیا گیا اور اتنا عظیم الشان تصور کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مفکر، بڑے سے بڑا ریفارمر اور بڑے سے بڑا مقنن اس سے بہتر تصور پیش نہیں کر سکا۔ ایک ایسا محکم تصور ایسا مکمل تصور کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس میں کسی تغیر و تبدل کسی ترمیم و اصلاح کی گنجایش نہیں، پھر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی بسیط دفتر پیش کیا گیا تھا، اس آئین و دستور کی وضاحت کے لئے کوئی کتاب مرتب کی گئی تھی، بالکل نہیں بلکہ یہ سارا کانسٹی ٹیوشن صرف ایک فقرہ میں بند تھا:- "الملک للہ والملک للہ" (یعنی زمین بھی اللہ کی اور حکومت بھی اللہ کی)۔ پھر دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اول اول جب کوئی تنہا فرد اپنی قوی و مضبوط شخصیت سے ملک پر متصرف ہوگیا تو اس کا آئین حکومت مستبدانہ، مطلق العنان کہلایا گیا، لیکن وہ زیادہ نہ چل سکا، کیونکہ دوسرے اکابر و امراء کی جماعت نے اس جابرانہ تسلط کو عرصہ تک گوارا نہ کیا اور وہ اتنی اصول کو ترک کر کے خود اپنی حکومت قایم کی جسے ارسٹاکریسی کہتے ہیں، لیکن حکومت یہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور عوام نے اس کے خلاف بغاوت

اور کچھ عرصہ بعد اپنی حکومت قایم کی جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کہتے ہیں اور اس وقت انتہائی ترقی یافتہ تصور حکومت خیال کیا جاتا ہے، لیکن روس اور چین نے اسے بھی قبول نہ کیا اور اشتراکیت کو رواج دیا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بڑی حد تک جمہوریت کو متزلزل کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی حکومت کا کوئی ایسا بلند تصور نہیں، جو نوع انسانی کو مطمئن کرکے دنیا میں کامل امن و سکون پیدا کر سکے
آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل بنیاد حکومتوں کی اس ناپایداری اور باہمی اختلاف و نزاع کی صرف جذبۂ ملکیت پر قایم ہے وہ انفرادی اختلاف ہو یا جماعتی، قومی اختلاف ہو یا ملکی، سب جذبۂ ملکیت پر قایم ہیں اور اس جذبہ کو کوئی آئین حکومت دور نہیں کر سکتا۔
اشتراکیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے انفرادی ملکیت کے بجائے قومی ملکیت قایم کرکے نزاع ملکیت کو ختم کر دیا ہے، لیکن یہ بھی صرف ذہنی مغالطہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اب اور زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، کیونکہ وہ جذبہ جو پہلے چند افراد یا چند مخصوص جماعتوں میں پایا جاتا تھا اب اس نے قومی جذبہ کی صورت اختیار کر لی ہے، یعنی اگر پہلے یہ باہمی نزاع ہزاروں تک محدود تھی تو اب کروروں تک پہونچ گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے بتوں کی جگہ ایک بہت بڑے بُت یا مہیب دیوتے نے لی ہے پھر اگر یہ بُت ساری دنیا میں ایک ہی ہوتا اور تمام نوع انسانی اسی کی پرستش پر مجبور کر دی جاتی تو بھی غنیمت تھا، لیکن دشواری یہ ہے کہ اس بُت کے مقابلہ میں ایک دوسرا بڑا بُت جمہوریت کا بھی ہے اور انھیں دونوں کی کشاکش نے اس وقت تمام نوع انسانی کو پریشان و مضطرب کر رکھا ہے اور دُنیا سے حقیقی سکون کو مفقود!

اب اس کے مقابلہ میں آپ اسلام کے تصور حکومت و سیاست پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں سرے سے کسی اختلاف و نزاع یا کشمکش مسابقت کی گنجایش ہی نہیں، کیونکہ اس میں نہ ملکیت کسی انسان کی ہے اور نہ حکومت کسی خاص فرد یا جماعت کی۔ دونوں کا مالک خدا ہے اور اس کی وراثت اگر منتقل ہو سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ:-

"ان الارض یرثہا عبادی الصالحون"

یہ ہے وہ صحیح بنیادی تصور حکومت جس سے ہٹ کر اگر کوئی دستور و آئین بنایا گیا تو کبھی دیرپا ثابت نہ ہوگا اور کوئی قوم اس پر اعتماد کرکے عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ جب خود مسلم حکومتوں نے اس بنیادی اصول کو ترک کر دیا تو وہ بھی ختم ہوگئیں۔ خدائی قانون ساری دُنیا کے لئے ایک ہے اور مُسلم و غیر مُسلم دونوں سے بے نیاز!

اب آئیے اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سُن لیجئے:

اسلام نے یہ کہکر کہ زمین و حکومت دونوں خدا کی ہیں، ملوکیت یا آمرانہ حکومت کو تو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، لیکن دنیا کو اس اصول پر چلانے اور افراد نوع انسانی کو ایک ہی رشتۂ اتحاد سے وابستہ رکھنے کے لئے اس نے خلافت الٰہی و نیابت الٰہی کا منصب ضرور قایم رکھا، جس کی حیثیت امارت کی نہیں بلکہ محض قیادت کی تھی، حاکم کی نہیں بلکہ خادم کی سی تھی، اور اس خدمت کا تنظیمی معیار یہ تھا کہ "امرہم شوریٰ بینہم" اور اخلاقی یہ کہ:-

"ان تؤدوا الامانات الیٰ اہلہا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"

امانات بڑا وسیع لفظ ہے جس میں انسانی حقوق و جذبات بھی شامل ہیں اور خلافتی فرایض و واجبات بھی۔ انسانی حقوق کی حفاظت تو خیر لازم ہونا ہی تھی، لیکن اس میں حاکمانہ حقوق کو بھی شامل کرکے یہ تاکید کر دی گئی کہ وہ بھی کسی ایسے ہی شخص کے سپرد ہونا چاہئے جو محض نوع انسانی کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو اور عدل و انصاف سے سرمو انحراف نہ کرے۔

یہ تھی وہ تعلیم جس نے سب سے پہلے ملک و حکومت سے ذاتی ملکیت کے تصور کو ختم کیا اور اس کے بعد حکومت کے لئے اہلیت کو شرط اولین قرار دے کر اس کا فیصلہ اس نے مشورہ یا رائے عامہ پر چھوڑ دیا۔ گویا اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے ملکیت و ملکیت کے تصور کو ختم کرکے حکومت کی بنیاد خالص اخلاق پر قایم کی اور اسی کے ساتھ انتخابی حکومت کا وہ اصول مقرر کیا

(جس پر آج کل تمام جمہوری حکومتوں کا عملدرآمد ہے) لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جس کا انتخاب کیا جائے وہ عالم وفرزانہ ہو ملک کا محافظ وخادم ہو، اور نیابتِ خداوندی کے فرایض کو خالصۃً للہ پوری دیانت وامانت اور عدل وانصاف کے ساتھ انجام دے۔

پھر تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بنیادی تعلیم کے پیش نظر عہدِ نبوی اور خلفاء راشدین میں جو اصول حکومت وضع کئے گئے وہ کتنے بلند اور کس درجہ محافظ انسانیت تھے۔

انھوں نے صرف انتخابی حکومت اور نظام شوریٰ ہی کی ہدایت پر عمل نہیں کیا، انھوں نے صرف عدل وانصاف ہی کی پابندی نہیں کی، بلکہ انھوں نے اقتصادی نظام کو بھی جمہوری رنگ دے دیا اور معاشرتی اصلاح کی بنیاد بھی مواخات و مساوات پر قایم کی۔

اس نے غلامی کو دور کیا، اس نے عورت کی پوزلیشن کو بلند کیا، اس نے سرمایہ داری کی مخالفت کی اور اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی۔

پھر یہ سب کچھ زبانی یا کاغذی باتیں نہ تھیں بلکہ ان پر عمل ہوتا تھا اور اس سختی کے ساتھ کہ اگر کسی عامل کی طرف سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی تھی تو اسے فوراً معزول کر دیا جاتا۔

جمہوریت اسلام آج کل کی سی جمہوریت نہ تھی جس میں اقلیت کے جذبات ہمیشہ ٹھکرا دئے جاتے ہیں، بلکہ یہ وہ جمہوریت تھی جس میں غیر مسلم افراد مسلمانوں سے زیادہ امن وفراغ کی زندگی بسر کرتے تھے۔

جب حمص پر قبضہ ہو جانے کے بعد دوبارہ دشمن نے حملہ کی طیاریاں شروع کیں تو مسلمانوں نے اسے خالی کر دینا مناسب سمجھا، لیکن جب جانے لگے تو وہاں کے یہود ونصاریٰ سے جو رقم لاکھوں کی مقدار میں بطور جزیہ وصول ہوئی تھی وہ سب کی سب واپس کر دی، محض اس لئے کہ اب ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے۔

مسلمانوں کے اس اخلاق کو دیکھ کر نصاریٰ ڈھاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور یہود توراۃ کی قسمیں کھا کھا کر کہ رہے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں قیصر کو حمص میں داخل نہ ہونے دیں گے۔

کیا تاریخ عالم میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

یہ تھی جمہوریت اسلام کی وہ روح جس نے لوگوں کے جسموں پر نہیں دلوں پہ حکومت کی اور اب یہ چیز محض فسانہ ہو کر رہ گئی ہے کرنے کا بند وبست نہ کر لیا جائے تمام دستور سازیاں لغو وبیکار ہیں۔

جب ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا تو اس کے چچیرے بھائی نے بھی اپنے آپ کو مستحق حکومت قرار دے کر جنگ شروع کر دی۔ نظام الملک طوسی (ملک شاہ کے وزیر) نے، امام موسیٰ رضا کے قبر پہ جا کر اپنے آقا کی فتح کے لئے دعا مانگی۔ جب دعا مانگ کر واپس آئے تو ملک نے پوچھا کہ آپ نے کیا دعا کی تو انھوں نے کہا "آپ کی فتح وکامرانی کی دعا" ملک شاہ نے کہا دعا میں نے بھی کی ہے مگر وہ یہ ہے کہ اگر میرا بھائی حکومت کا زیادہ اہل ہے تو اے میرے رب، میری جان اور میرا تاج مجھ سے واپس لیلے۔

گبن (عیسائی مورخ) ملک شاہ کے اس جذبہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ روح صرف اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ ان کے یہاں حکومت کسی کا ذاتی حق نہیں تھی بلکہ خدا کی امانت تھی اور یہ امانت انھیں کو ملنا چاہئے جو اس کے حقیقی مستحق ہیں — پھر اس فریضہ کو جس خلوص وخشیت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آپ کی زبان سے بار بار یہی نکلتا تھا کہ "اللھم لاعلیّ ولالی" (یعنے خدا مجھے معاف کر دے) حالانکہ خدمت اسلام کے سلسلہ میں، آپ کی قربانیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ تھا خشیت الٰہی وسیاست ملکی کا وہ امتزاج جو دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پاکستان کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ سے ایک استفسار

دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل یا دیول، سندھ کا ایک مشہور تاریخی شہر تھا جس کا ذکر یعقوبی، طبری، مسعودی، البیرونی نے بھی کیا ہے اور طبقاتِ ناصری، مراصد الاطلاع، آئینِ اکبری اور ساسانی تاریخ میں بھی اس کا حوالہ ملتا ہے۔ ان تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریائے سندھ کا مشہور تجارتی بندرگاہ تھا جہاں عرب تاجر اکثر آیا کرتے تھے۔ بعد کو سنہ ۱۵ھ میں وہ یہاں فاتحانہ داخل ہوئے، لیکن کوئی حکومت قایم نہیں کی۔ اس کے تقریباً ۸۰ سال بعد جب سنہ ۹۳ھ میں محمد قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو عرب حکومت بھی قایم ہوگئی۔

عرب جغرافیئین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل دریائے مہران کے دہانہ پر واقع تھا۔ یاقوت نے یہاں کے بعض محدثین کا بھی ذکر کیا ہے اور اٹھارھویں صدی تک کے مغربی سیاحوں نے بھی اس کا نام لیا ہے۔ ایلیٹ نے دیبل، کراچی، ٹھٹھا اور لاہوری بندر کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے جو غالباً صحیح نہیں۔ ہیگ (HAIG) کا خیال ہے کہ نہر باگھار کے دا ہنے کنارے کاکربکیرا کے کھنڈر دراصل دیبل کے کھنڈر ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے ضرور اس طرف توجہ کی ہوگی، اس لئے میں شکر گزار ہوں گا اگر وہ مجھے بتا سکیں کہ دیبل کی جائے وقوع کیا تھی اور اب اس کے کھنڈر کہاں ہیں اور کس نام سے موسوم ہیں۔ اسی کے ساتھ ممکن ہو تو دریائے مہران، باگھار اور کاکربکیرا کے متعلق بھی اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج سے مطلع فرمائیں۔

میرزا مظہر کے فارسی خطوط

(خلیق انجم)

خطوط اپنے لکھنے والے کی شخصیت وسیرت اور اس کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں، کسی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ ممکن نہیں خطوط کے بعد سوانح عمری کا درجہ ہے، لیکن بعض اوقات سوانح لکھتے ہوئے انسان حق اور صداقت سے کام نہیں لیتا۔ اور حقیقت پردوں میں چھپی رہ جاتی ہے، کبھی تو ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ سوانح نگار دروغ گوئی پر مجبور ہوتا ہے یا ارادتاً حقایق کی پردہ پوشی کرتا ہے اور کبھی اُسے خود بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے اور لکھ رہا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس خطوط میں دروغ گوئی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، کیونکہ شاذو نادر ہی مکتوب نگار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے خطوط صرف مکتوب الیہ ہی نہیں ہزاروں اور لاکھوں لوگ پڑھیں گے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کے روز مرہ کے واقعات بے کم وکاست بیان کر دیتا ہے، اور خطوط میں بیان کی گئی یہ چھوٹی بڑی باتیں حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور مکتوب نگار کے ذہن کو سمجھنے میں ہماری مدد ومعاون ہوتی ہیں۔

اگر کوئی صنفِ ادب فنِ تاریخ سے بہت زیادہ قریب ہے تو وہ خطوط نویسی ہے مورخ کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے جو اسے واقعہ کو ایک مخصوص عینک سے دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے، اُسے حاکمِ وقت کا خوف بھی ہوتا ہے، کبھی ایک مخصوص مذہب یا سیاسی جماعت کی طرفداری منظور ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات وہ حقایق کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے کہ واقعات کی شکل وصورت بالکل بدل جاتی ہے۔ خطوط میں انسان اپنے چہرے پر کتنا ہی دبیز نقاب کیوں نہ ڈال لے۔ حقیقت کی تلاش زیادہ مشکل نہیں ہوتی، اور مکتوب نگار کی کوششوں کے باوجود اُس کے ذہن کے تمام گوشے روشنی میں آجاتے ہیں۔

ہندوستان میں صدیوں قبل پہلے فارسی مکتوب نگاری نے باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی تھی، آج بھی ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کے سیکڑوں مجموعے مل جاتے ہیں، جن میں خسرو، محمود گاواں، فیضی، ابوالفضل، ظہوری، چندربان برہمن، عالمگیر، نعمت خان عالی اور بیدل وغیرہ کے رقعات قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا مظہر کے خطوط بھی اس نقطۂ نظر سے اہم ہیں کہ ان کی مدد سے ہم مرزا کی شخصیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مرزا رشد وہدایت کے کام میں اس طرح مصروف رہے کہ انھیں زندگی بھر تصنیف وتالیف کی فرصت نہیں مل سکی۔ اسی لئے ان کا سرمایۂ تصانیف بہت مختصر ہے۔ انھوں نے خود ۱۱۔۔ھ میں بیس ہزار میں سے ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ اس انتخاب کا دیباچہ مرزا نے خود ہی لکھا تھا، اس دیباچہ سے دو اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرزا نے شعر وشاعری میں دلچسپی صرف ہنگامِ جوانی میں لی تھی، اور آخری عمر میں یہ مشغلہ ترک کر دیا تھا۔ دوسرے ۱۱۵۰ھ میں مرزا کا ایک دیوان مرتب ہوا تھا، اور اس پر بھی مرزا صاحب نے دیباچہ لکھا تھا۔ مگر وہ دیوان اب نایاب ہے۔ البتہ دوسرا دیوان شایع ہو چکا ہے، انھوں نے فارسی اشعار کی ایک بیاض خریطۂ جواہر کے نام سے مرتب کی تھی، یہ بیاض بھی شایع ہو چکی ہے، اگرچہ اردو شاعری میں مرزا

کی وہی اہمیت ہے جو فلسفہ میں ہستی و افلاطون کی ۔ لیکن انھوں نے اُردو شاعری کو ہمیشہ " دون مرتبہ " سمجھا ۔ اور اسی لئے اُردو میں کبھی دیوان مرتب نہیں ہوا ۔ مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اور بیاضوں میں ان کا اُردو کلام بکھرا ہوا ہے ۔ میں نے ان کے تمام اُردو اشعار مرتب کئے ہیں جو میرے پی ایچ ڈی کے مقالے " مرزا مظہر جانجاناں کا عہد اور شاعری " میں شامل ہیں ۔ عبدالرزاق قریشی نے بھی اپنی کتاب مرزا مظہر جانجاناں میں ان کے اشعار مرتب کئے ہیں ۔ فارسی اور اُردو میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے ، صرف فارسی خطوط ہیں ۔ البتہ تین اور نثری تحریریں ملتی ہیں ۔ دیوان فارسی پر دیباچہ ، غلام یحییٰ کی کتاب پر تقریظ اور وصیت نامہ ملتا ہے ۔ اپنے خطوط کے بارے میں وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

" دبستان تحقیق کے اس بے سواد میں کتاب کی تصنیف کی استعداد نہیں ہے ۔ دوستوں نے بعض شریعت اور طریقت کے مسایل دریافت کئے تھے ، ان کے جواب مکاتیب کے طور پر لکھے ہیں ، جنھیں عزیزوں نے فراہم کیا ہے "[۱]

(بنام شاہ ابوالفتح)

آزاد لائبریری علی گڑھ میں رقعات مرزا مظہر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں صرف ۲۳ خطوط ہیں ۔ یہی ۲۳ خطوط شاہ غلام علی کی مقامات مظہری[۲] میں بھی شامل ہیں ۔ غالباً مرزا کے مکتوبات کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو مرتب ہوا ۔ بعد میں اضافے ہوتے رہے ، مرزا کے مطبوعہ مکتوبات کے دو مجموعے ملتے ہیں کلمات طیبات اور رقعات مرزا مظہر ۔ کلمات طیبات میں حضرت غوث الثقلین ، مرزا قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور شاہ غلام علی کے مکتوبات ہیں ۔ مرزا کے مکتوبات کی کل تعداد ۸۸ ہے ۔ کلمات طیبات کے آخر میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے ایک رسالے " اسرار العارفین " کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے ۔ یہ کتاب پہلی بار غالباً ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں مطبع العلوم مراد آباد سے زیر اہتمام محمد امجد علی مالک اخبار " نیر اعظم " ۶ ۱/۴ اور ۱۰ کے سایز پر شایع ہوئی تھی ۔ مولوی حافظ علی مراد آبادی اس کے مرتب اور مولوی محمد قمر الدین مراد آبادی اور مولوی صدیق حسن سنبھلی نے اس کی تصحیح کی اور حاشئے لکھے ۔ اس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء میں پھر اسی مطبع سے شایع ہوا ۔ اس دفعہ مولوی قمر الدین کے ساتھ جو مولوی صدیق حسن کا نام تھا ، وہ نکال دیا گیا ۔ پہلے اڈیشن میں منشی انوار حسین تسلیم کی تقریظ شامل ہے ۔ دوسرے اڈیشن میں یہ تقریظ بھی نکال دی گئی ، اور سایز بھی بدل کر ۶ ۱/۴ × ۹ " کر دیا گیا ۔ عبدالرزاق صاحب قریشی نے ایک اور اڈیشن کا بھی ذکر کیا ہے ، جو میری نظر سے نہیں گزرا ۔ یہ اڈیشن ۱۳۰۹ھ میں مجتبائی پریس دہلی سے حافظ عبداللہ کے زیر اہتمام چھپا تھا اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی[۳] ۔

مرزا کے خطوط کا ایک اہم نسخہ رقعات کرامت سعادت شمس الدین حبیب اللہ مرزا جان جاناں مظہر شہید رضی اللہ عنہ کے نام سے مطبع فتح الاخبار سے زیر اہتمام محمد عثمان خان چھپا تھا ۔ اس کا سنہ طباعت ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء ہے ۔

اس نسخہ میں کل ۶۳ خطوط ہیں ، جن میں دو بالکل نئے ہیں ۔ اس نسخہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں چند خطوط کے علاوہ تمام پر مکتوب الیہم کے نام دئے گئے ہیں اور اس نوعیت کا یہ واحد نسخہ ہے ۔

جاگیرداری دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف ، تصنع اور مبالغہ آرائی ہوتی ہے ۔ اس کا لازمی اثر خطوط نویسی پر بھی

---

[۱] اس مقالہ میں مرزا کے تمام فارسی خطوط کے اقتباسات کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے ۔

[۲] مقامات مظہری کا اُردو ترجمہ ۱۹۱۵ء میں کتب قومی ، منزل نقشبندیہ ، کشمیری بازار ، لاہور سے چھپا تھا ۔ جس پر مترجم کا نام نہیں ہے ۔ میں نے اس ترجمہ سے بھی استفادہ کیا ہے ۔

[۳] مرزا مظہر جانجاناں ، ص ۲۴۸ ۔

پڑتا تھا۔ مرزا مظہر کے دور میں فارسی خطوط میں رنگینیِ عبارت، دور از قیاس تشبیہات، استعارات اور تکلف و تصنع ہوتا تھا اور عبارت اتنی مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی کہ اکثر و بیشتر مطلب خبط ہوجاتا تھا۔ اردو شاعری میں مرزا کو نقاش اول ریختہ کا اس لئے نہیں کہا گیا کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہلی بار اردو میں شعر کہنا شروع کئے بلکہ یہ اعزاز اس لئے ملا ہے کہ انھوں نے ایہام جیسی غیر فطری چیز کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی۔ اور اپنی اس مخالف آواز کو باقاعدہ تحریک کی صورت دی انھوں نے اردو شاعری کی اُن تاریک راہوں کو روشن و منور کیا ہے۔ جس پر گامزن ہوکر درد، میر، سودا، آتش اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے بقائے دوام حاصل کی۔ اسی طرح مرزا صاحب نے فارسی، اردو مکتوب نگاری میں بھی سادہ گوئی کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کرنا چاہی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی طرح ڈالی تھی۔ اس کی ابتدا ستر، اسی سال قبل مرزا صاحب نے فارسی میں کی تھی۔ مرزا مظہر خواہ مخواہ طویل اور پر تکلف اور مبالغہ آمیز القابات کے خلاف تھے۔ وہ خود بھی سیدھے سادے القاب لکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ مرزا اکثر مخدوما، جانِ من اور برادرِ من جیسے القابات استعمال کرتے ہیں، وہ خط کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔" بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر مولوی صاحب مہربان سلمہ الرحمٰن مطالعہ فرمانید" اور کبھی صرف" حمد و صلوٰۃ" یا" حامداً و مصلیاً" یا باعث تحریر آنکہ سے خط شروع کرتے ہیں۔ مرزا بہت سادہ القاب لکھ کر فوراً مطلب کی بات پر آجاتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں انھوں نے بغیر کسی القاب یا توطیہ و تمہید کے مطلب کی بات کہنی شروع کردی ہے۔ خود اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بھی اس کی تاکید کرتے ہیں۔ میر اجنبی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔

> "معلوم ہے کہ بھائی اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھتے۔ جو لکھتا ہے اس سے کہ دیں کہ یہ لکھا ہوا القاب (حقایق و معارف آگاہ) لکھنا چھوڑ دے۔ کیونکہ ہمارے اور آپ کے تعلقات میں ان الفاظ کی گنجایش نہیں ہے اور وہاں کے لوگوں کا سلیقۂ تحریر معلوم ہے۔ بے مزہ تکلف کو دخل نہ دیں۔ اس کے بعد اس طرح لکھیں کہ میر اجنبی کی طرف سے مرزا جانجاناں مطالعہ کریں اس کے بعد مطلب لکھیں"۔

میر سلیمان نے غالباً مرزا کو پر تکلف القاب لکھا تھا۔ مرزا جواب میں انھیں لکھتے ہیں :۔

> " امید ہے کہ مراسلات اور مخاطبات میں پرانی رسم کے مطابق لفظ" مرزا صاحب" پر اکتفا کریں گے"۔

مرزا خط کے مضمون میں بھی سادگیِ بیان کا پورا التزام کرتے ہیں۔ اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی انسان سے مخاطب ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں وہی بے تکلفی اور بے ساختگی ہوتی ہے جو صرف گفتگو میں ممکن ہے۔ غالب کی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اس وقت اردو مکتوب نگاری کی اصلاح کی جب فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی نثر نے غالب کے لئے میدان ہموار کردیا تھا، اور عوام کا ذہن اس اصلاح کو قبول کرنے کے لئے طیار ہوچکا تھا۔ لیکن مرزا کی وہی حالت تھی جو محمد شاہ تغلق کی تھی، یعنی وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوگئے تھے۔ جب انھوں نے فارسی مکتوب میں مشکل پسندی، نکتہ آفرینی، دقتِ مضامین اور تکلف و تصنع کے خلاف آواز بلند کی اور خود ایسی فارسی نثر کے نمونے پیش کئے جن میں سادگی، صفائی، سلاست و فصاحت، بے تکلفی و بے ساختگی اور روزمرہ کا لطف تھا۔ تو وہ فارسی داں طبقہ جس کا مزاج دربار اور امرا دونوں کی مصاحبت میں بنا تھا اسے قبول نہ کرسکا۔

مواد کے اعتبار سے بھی ان خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے، بعض خطوط میں مرزا نے تصوف کے مسایل پر روشنی ڈالی ہے خاص طور پر ابتدائی ۳۰ خطوط اس سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔ پہلے خط میں اپنا حسب و نسب اور مختصر سے خاندانی حالات بیان کئے ہیں، باقی خطوط میں مریدوں اور معتقدوں کے شبہات کے جوابات دئے ہیں۔ یہ خطوط مرزا کے مسلک، ان کے مقاصد اور

نظریات کو سمجھنے کا بہترین اور واحد ذریعہ ہیں۔ انھیں خطوط میں تصوف کے اہم ترین مسایل جبر و اختیار، سماع، کرامات و خرق عادات، وحدت وجود، نسبت، علم حضوری و حصولی، اتباع اور ذکر جہر وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے عقاید کے سلسلہ میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہندو دھرم کے بارے میں ان کے نظریات ہیں۔ جن سے ان کی ذہنی کشادگی، وسعت قلب اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں ہمیں اس کا علم ہے کہ مرزا اتباع سنت کے سخت پابند ہیں، وہاں انھیں خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرکان ہند کے دین کو کفار عرب کی طرح باطل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک خط میں کسی مرید کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ نوع انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے دنیا اور عاقبت کی اصلاح کے لئے برہما نامی ایک فرشتے کے ہاتھ ایک کتاب مسمّی بہ "وید" بھیجی تھی، مرزا صاحب وید کے چار علوم کی پوری تفصیل بیان کرکے لکھتے ہیں کہ ان ویدوں کو ماننے والے تمام فرقے خداوند تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں، اور دنیا کو حادث و مخلوق جانتے ہیں، دنیا کے فنا ہونے، حشر جسمانی اور جزائے اعمال نیک و بد پر یقین رکھتے ہیں، اور جہاں تک ان لوگوں کی بت پرستی کا تعلق ہے تو یہ لوگ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و مکاں پر تصرف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترک تعلق کے بعد بھی اس کائنات پر تصرف باقی ہے یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرت خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں، ان کے بت بناکر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب سے کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے ربط پیدا کرلیتے ہیں۔ مرزا کے خیال سے ہندوؤں کا یہ عمل صوفیوں کے ذکر رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان صوفی اپنے پیر کا بت نہیں تراشتے، کفار عرب کی بت پرستی اہل ہند کی بت پرستی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ اہل عرب بتوں کو اپنی ذات سے موثر اور متصرف جانتے تھے۔ ان تمام شواہد و دلایل کی روشنی میں مرزا یہ یقین رکھتے تھے کہ ہندو دھرم خدا کا بھیجا ہوا ہے جو ظہور اسلام کے بعد منسوخ ہوگیا۔ رام چندر اور کرشن جی وغیرہ کی عزت کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ممکن ہے یہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوں، اسی خط میں مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ تناسخ پر اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا مرزا کی یہ ذہنی کشادگی محض خیال اور فکر تک محدود نہیں تھی۔ عملی زندگی میں بھی ہندوؤں سے ان کا ہمدردانہ اور پرخلوص رشتہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں متعدد لوگ ہندو تھے۔ جن میں بساون لال بیدار اور کشن چند مجروح کے نام قابل ذکر ہیں۔

مقامات مظہری اور معمولات مظہریہ میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے مرزا کے توکل اور استغنا کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کی دولت کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا۔ جب کبھی ان لوگوں نے مرزا کی خدمت میں کوئی پیش کش کی۔ مرزا نے کمال استغنا کے ساتھ انھیں ٹھکرا دیا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ جس مکان میں مرزا کی شہادت ہوئی ہے وہ کیول رام نامی ایک بنئے نے ان کے لئے بنوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ قبولیت کا یہ شرف صرف دلی تعلق کی وجہ سے بخشا گیا ہوگا۔ مرزا نے خطوط میں اکثر لوگوں کی سفارش کی ہے بلکہ ایک خط میں اپنے ہمشیر زادوں کی سفارش بھی کی ہے۔ لیکن اس خط میں ان کا لہجہ اور الفاظ اتنے زوردار اور موثر نہیں ہیں جتنے کہ اس خط میں ہیں۔ جو انھوں نے برج لال نامی ایک نوجوان کی سفارش میں صرف کئے ہیں، وہ محمد قاسم کے نام ایک خط میں برج لال کی تعریف و توصیف اور ملازمت کی سفارش کے بعد لکھتے ہیں :-

"تم کو معلوم ہے کہ ہم نے اس اہتمام سے تم سے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ اور ہم کو مبالغہ کی عادت نہیں"۔

ان خطوط میں سے ہمیں مرزا کے تصور اخلاق کا علم ہوتا ہے، انھوں نے اکثر خطوں میں اپنے مریدوں کو نصیحتیں کی ہیں جو زندگی میں ان کے اپنے طرز عمل کی آئینہ دار ہیں، وہ اپنے ایک مرید شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں :-

"اپنی بدخلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی تمہارے طریقہ کی طرف آئے تو اس سے خدمت لینے کی بجائے خود اس کی

خدمت کرو، ہاں اگر وہ محبّت کے غلبہ سے خود تمھاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے۔"

آخری عمر میں مرزا صاحب نے قیمتی لباس پہننا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب ان کے مرید محمد قاسم نے انھیں قیمتی کپڑے کے دو تھان بھیجے اور منت سماجت کی کہ مرزا اس کا لباس ضرور پہنیں، تو وہ انکار نہ کرسکے۔ مرید کے اصرار کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"اب فقیر کم قیمت کا لباس استعمال کرتا ہے، چونکہ تم نے بہت سماجت کی ہے۔ اس لئے تمھاری خاطر سے پہنوں گا ورنہ عدم قبول کی صورت میں تمھیں تکلیف ہوگی۔"

ایک اور خط میں مرزا صاحب، صاحبزادہ مرید حسین کو لکھتے ہیں:-

"فقیر نے خواب میں معلوم کیا ہے کہ تمھاری والدہ باطن میں تم سے ناخوش ہیں۔ والدہ کی ناراضگی آخرت اور دنیا دونوں میں نقصان کا باعث ہے۔"

ایک اور خط میں مرزا نے کسی خاتون مرید کو لکھا ہے:-

"اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کریگا شوہر کی خدمت، اور اطاعت کی پوری کوشش کرنا چاہئے ..... غصہ و غضب پی جانا چاہئے۔"

مرزا کی بیوی کو سودا ہو گیا تھا، لیکن انھیں طلاق دینا یا اُن سے کنارہ کشی کرنا ان کے مسلک اور آئین کے خلاف تھا۔ اگرچہ یہ خاتون زندگی بھر دردِ سر بنی رہیں۔ مرزا کی جبیں پر کبھی شکن نہیں آئی۔ ہمیشہ ان کی خاطر داری اور دیکھ بھال میں کوشاں رہے ایک مرتبہ وہ پانی پت گئیں، اور غالباً قاضی ثناء اللہ کے ہاں قیام کیا، مرزا ان کے بارے میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:-

"تمھیں چاہئے کہ جب وہ (مرزا کی بیوی) پہونچیں تو ان کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اور وعظ و نصیحت میں اُن پر سختی نہ کرنا، ان کی بہت دلجوئی کرنا، اگر فقیر کو پیٹ پیچھے برا کہیں تو ہرگز ان سے بددل نہ ہونا، کیونکہ ہماری اور تمھاری خیریت اسی میں ہے۔"

مرزا اتنے وسیع القلب اور انسان دوست تھے کہ کبھی کسی انسان کا دل دکھانا اور اسے معمولی سی تکلیف دینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حد تو یہ تھی کہ اگر کسی انسان کا زہد اور تقویٰ کسی دوسرے آدمی کی تکلیف کا باعث ہو تو وہ ایسے زہد سے دامن بچانا پسند کرتے تھے۔ قاضی ثناء اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میرے بھائی، عجیب بات ہے، پانی پت کا ہر شخص تمھاری شکایتوں سے بھرا ہوا آتا ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرتے ہو اگر تمھاری سچائی اور دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔"

وہ کسی سے ناراض بھی نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی وجہ سے تھوڑی بہت رنجش ہو گئی۔ تو معمولی معذرت سے دل صاف کر لیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:-

"فقیر تمھارے اندازِ تحریر سے ناراض تھا، چونکہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے میں نے خود کو زبردستی باز رکھا اور تمھارے حق میں دعائے خیر کی۔ تاکہ خاطر جمع ہو۔ اب جو تم نے معذرت کی ہے دل صاف تو ہو گیا، ہم نے معاف کر دیا۔ خاطر جمع رکھو۔"

محمد قاسم کے نام ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں:-

"فقیر دل کی ناراضگی تو ایک مٹھی خاک کی طرح ہوتی ہے، جو دریا میں ڈال دی جائے، اب مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ تم نے اس خط میں حد سے زیادہ معذرت کی ہے۔ اس نے میرے دل کا غبار دھو دیا ہے، بے فکر رہو۔"

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں مرزا کے بارے میں لکھا ہے:-

"مرزا صاحب کی تحصیل عالمانہ نہ تھی، مگر علم حدیث باصول پڑھا تھا۔"[1]

یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے مرزا سے ذاتی رنجش ہو۔ مرزا نے ان رقعات میں جس انداز سے تصوف کے مسایل پر روشنی ڈالی ہے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ ان کی علمیت اور قابلیت کی دلیل ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ شواہد موجود ہیں۔ جن سے ان کے علم وفضل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں ان کتابوں کے نام جو مرزا کے زیر مطالعہ رہیں اور جن کا حوالہ مرزا نے اپنے خطوط میں دیا ہے۔ اگر ان کتابوں کی فہرست بنائی جائے تو یہ ایک طویل فہرست ہوگی، اور پھر ظاہر ہے کہ مرزا نے صرف انھیں کتابوں کا مطالعہ نہ کیا ہوگا۔

ان رقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کے مریدوں میں سب سے زیادہ تعداد روہیلوں کی تھی۔ کتنے روہیلے ان کے مرید تھے اور روہیلوں کو ان سے کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ مرزا کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ روہیلکھنڈ کے کسی شہر سے محمد احسان احمدی کو لکھتے ہیں :-

"اخذ طریقہ کے لئے روہیلوں کا اتنا ہجوم ہے کہ تمام دن توبہ دینے سے فرصت نہیں ملتی ..... فقیر کے پہونچنے کی خبر سن کر یہ لوگ دور دراز علاقوں سے احرام بستہ آتے ہیں ..... سنبھل اور امروہہ سے لے کر شاہجہاں پور تک تمام منزلوں میں ٹولی ٹولی بنا کر ایک گروہ نے قوم روہیلہ میں سے اکثر اور ہندوستانی لوگوں میں سے کم تر نے اخذ طریقہ کیا ہے ..... ان میں سے ایک جماعت ساتھ آتی ہے اور میرے ہمراہ دہلی جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

مرزا نے اکثر خطوط میں ان روہیلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہی روہیلے مغل حکومت کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ نجف خاں جب برسر اقتدار آیا تو اس نے ان سے نجات پانے کی کوشش کی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان روہیلوں کی اچھی خاصی تعداد دہلی میں آباد ہو گئی تھی۔ جن میں اکثر آستانۂ مظہر سے وابستہ تھے۔ اور مرزا کی وجہ سے دہلی میں روہیلوں کی آمد و رفت برابر جاری تھی۔ اس لئے نجف خاں کو مرزا کے قتل کی سازش میں حصہ لینا پڑا۔ اس کی ایما اور سازش سے، محرم الحرام ١١٩٥ھ کی رات کو ایک مغل بچے نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ زخمی ہو گئے اور تین دن زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔ اس قتل میں نجف کے مذہبی تعصب کو بھی دخل تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جاگیرداری دور میں خانقاہ کا ایک اہم رول رہا تھا۔ چونکہ عوام اور خود امرا دونوں کے دل و دماغ پر اہل خانقاہ کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہوں کو ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ ان برگزیدہ ہستیوں کے اشارہ ابرو سے حکومت کا تختہ پلٹا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہمیشہ اہل خانقاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی عام زندگی میں جو زوال آیا، اس کے اثر سے معدودے چند کو چھوڑ کر باقی خانقاہیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، اور یہ بھی دنیاوی عیش وعشرت، شعر وشراب، رقص و سرود اور غیر اخلاقی اور غیر فطری حرکتوں کی آماجگاہ بن گئیں مرزا کی خانقاہ کا شمار ان معدودے چند خانقاہوں میں ہے جو نہ صرف اس زوال کے اثر سے محفوظ رہیں، بلکہ جنھوں نے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن کئے اور انسان کی فلاح و بہبودی کے لئے ہر ممکن کام کیا۔ مرزا تمام سیاسی واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے خطوط میں اکثر ان واقعات کا ذکر آ گیا ہے، جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں۔ مرزا نے بعض سیاسی واقعات پر تبصرہ کیا ہے، نواب عماد الملک اور غلام عسکری خاں کے نام جو مرزا کے خطوط ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ انسانی فلاح و بہبودی کے لئے سیاست میں حصہ لینے کو مرزا ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے نواب کو کئی خطوط میں سیاسی مشورے دئے ہیں — اس مختصر سے مقالے میں بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ مرزا کے سوانح اور اس دور کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ خطوط کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے مرزا کے تمام خطوط کا اردو ترجمہ کر دیا ہے، جو مکتبۂ برہان دہلی سے شایع ہو رہے ہیں۔

---

[1] آب حیات (مبارک علی ایڈیشن) ص ٤٠٠۔

شاہ عالم کا ہندوستان

۱۱۷۳ھ تا ۱۲۲۱ھ

(تاریخ ہند کا نہایت پُر آشوب زمانہ)

(خان رشید)

سکھوں، مرہٹوں، ابدالیوں اور جاٹوں کی لوٹ مار نے جس "سماج" کو جنم دیا اس کی رگ رگ میں خود سری اور مطلق العنانی کا زہر کچھ اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ کوئی تدبیر اس کی سمیت کو زایل نہ کر سکی اور دلی اُجڑ گئی۔ بقول میر ؎

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ
بود فردِ دفترِ احوال صاحب خانۂ

جو علاقے دلی سے جتنے قریب تھے وہ اتنے ہی زیادہ متاثر ہوئے، لیکن دور دراز گوشے بھی محفوظ نہ رہ سکے، ادبار کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں دو افراد بھی ایسے نہ رہ گئے تھے جنھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے ہوں ——— ہی [illegible] میں سلطنت مغلیہ کے افق پر ایک اور "آفتاب" نمودار ہوا۔ مگر یہ صرف تخلص کا آفتاب تھا۔ اس میں جوت ناپید تھی، احمد شاہ ابدالی نے جاتے جاتے شاہ عالم ثانی کو بادشاہ مقرر کیا۔ مگر اس کی شاہی محض "تہمت" ہی ثابت ہوئی۔ نام کو شاہ عالم تھا، مگر حقایق نے جلد ایک مثل مشہور کر دی کہ ـــ "بادشاہی شاہ عالم، از دہلی تا پالم" ـــ سکہ اس کا ہی چلتا رہا جس پر

حامیٔ دینِ محمدؐ ہاشد از فضل الٰہ
بادشاہ ہفت کشور شاہ عالم بادشاہ ـــ کندہ ہوتا تھا۔

مگر نہ وہ بادشاہ ہفت کشور بن سکا نہ حامیٔ دین محمدؐ اور ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں ہی کا حکم چلتا رہا۔ شاہ عالم دس برس تک الٰہ آباد میں رہا۔ معرکۂ بکسر کے بعد شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی ۲۶ لاکھ سالانہ کے عوض انگریزوں کے نام لکھ دی، جہانداری کی سکت نہ رہی تو پنشن خواری غنیمت نظر آئی۔ ہند کے مشرق و مغرب میں حکمرانوں کے طلوع و غروب کا تماشہ جاری تھا۔ شمالی اور دکنی ہند سے کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی۔ لیکن جنوبی ہند میں اسی زمانہ میں حیدر علی نے سرکش پالیگاروں اور مرہٹوں کے فساد کو فرو کر کے ۱۱۷۴ھ میں سلطنت خداداد میسور کی بنیاد رکھی۔ [illegible] میں اسے بدنور کے مقام پر سب سے بڑی اور اہم فتح حاصل ہوئی۔ مالابار پر قبضہ کرنے کے بعد حیدر علی نے [illegible] میں چیتلدرگ اور شاہنور پر چڑھائی کی۔ [illegible] میں مرہٹوں نے حیدر علی پر فوج کشی کی۔ دو سال جنگ جاری رہی آخر حیدر علی نے صلح کر لی۔ انگریز [illegible] میں بکسر سے فراغت پانے کے بعد شمالی ہند میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے اور اب انھوں نے حیدر علی کی طرف توجہ کی جسے وہ اپنے اقتدار کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ علاوہ محمد علی والی ارکاٹ اور نظام علی خاں، نظام دوم والی حیدرآباد انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزوں نے نظام سے سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض میسور کے تمام علاقے کی سند اپنے نام لکھوالی۔ والاجاہ محمد علی کو ارکاٹ کا آزاد حکمراں اور انگریزوں کو اس کا ایجنٹ تسلیم کیا گیا۔ مرہٹے بھی انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ اب متحدہ فوجوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران میں ٹیپو سلطان نے مدارس میں انگریزوں کا محاصرہ کر لیا، قریب تھا کہ ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے نجات مل جاتی

لیکن حیدر علی سے منسوب ایک جعلی خط نے ٹیپو کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا اور انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں حیدر علی کا انتقال ہوا۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے احیائے دین کی ایک ایسی تحریک پیدا کر دی تھی جس کے تحت جنوبی ہند میں مذہب اور ملی مفاد سے وابستگی بڑھ گئی تھی۔ غیر مسلموں اور انگریزوں کی دشمنی نے اسے اور ہوا دی۔ جنوبی ہند کی شاعری میں اس کے نمایاں نقوش موجود ہیں۔ دکن کی اس شاعری کے علاوہ بھی جس کے مراکز حیدر آباد اور گولکنڈہ تھے، جنوبی ہند کے مدراس اور پٹن جیسے دور دراز گوشوں میں بھی یہ رجحان نمایاں تھا۔ تاہم جنوبی ہند میں یگانگت اور یک جہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلافات کو مفاد پرست قوموں نے خوب بھڑکایا۔ نام نہاد علماء نے وقت کی آواز کے خلاف تفرقہ پردازی کو شیوہ بنایا۔ کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا تو دور کی بات ہے، بات بات پر مسلمانوں کو بلا تکلف دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کے فتوے صادر کئے۔ صوفیہ نے تبلیغ کی طرف توجہ کی، لیکن دین کی بدحالی ان سے بھی دیکھی نہ گئی اور انھوں نے حسب موقع اس باب میں بھی کوشش کی کہ غلط روایات اور گمراہ کن نظریات سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر ان کے سامنے اسلام کی حقیقی روح کو بے نقاب کریں۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں پٹن کے ایک شاعر شاہ کمال الدین کمال نے اسی مقصد کے تحت قطب شاہی شاعر طاقی کے معراج نامے سے غلط روایات کو خارج کرکے خود بھی معراج نامہ لکھا، جس کے اشعار اس قسم کے ہیں :-

> جس کو ہے اللہ اکبر اسم ذات اس کو لائق ہے کمالات و صفات

کمال کی ایک مثنوی فقہ پر بھی ہے۔ یہ اور اس دور کی ایسی تمام مثنویاں انھیں مذہبی اختلافات کا ردِ عمل ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔

۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء کو فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ میر صادق اور پورنیا دیوان اور وزیر ہوئے۔ تاریخ فتوحات برطانیہ میں لا فیروز اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

> میران سپہ محفل آراستند همه دست بر سینه برخاستند
> بگفتند کاے شاہ گردوں سریر همه چاکر اینم فرماں پذیر
> چو سلطاں لقب یافتی از نخست کنوں تخت و تاج شہی زان تست
> پسر در جہاں آں بود نیک نام کہ برتر نہد از پدر چند گام

آخر میں دعا دی ہے کہ ؎

> سر حاسداں زیر پائے تو باد همه عیش عالم برائے تو باد

لیکن سلطان ٹیپو کو سکون و اطمینان کا ایک دن بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں ٹیپو کے نے پاک بیٹے ایاز خاں نے انگریزوں سے سازش کرکے بغاوت کر دی۔ کوڑیال بندر اور بھٹی بلا مزاحمت انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ دوسری طرف اپنچے شامیا نے دار الخلافہ یعنی سرنگا پٹم پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور تیسری جانب نواب کڈپہ عبد الحلیم خاں کے بھائی نے مچھلی بندر میں انگریزوں سے معاہدہ کرکے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ٹیپو جو قوم و ملک کے درخشاں مستقبل کی امید پر انتھک کوششوں سے اپنے ذاتی آرام کو حرام کئے ہوئے تھا، نادان اہلِ ملک کی سازشوں اور خود غرضیوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ ٹیپو نے میسور کی خوشحالی اور از سرِ نو تعمیر کے لئے بے مثل اصلاحی اقدام کئے مگر سازشوں کی فضا نے بار آور نہ ہونے دیا۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں سروش غیبی نے "حیدر نگر گرفتہ" کا غلغلہ بلند کیا کہ ٹیپو نے انگریزوں سے حیدر نگر واپس چھین لیا۔ اور اسی سال کڈلور میں انگریزوں سے جنگ کی۔ فرانسیسی، ٹیپو کے ساتھ تھے۔ ٹیپو کے حملے اس قدر شدید تھے کہ انگریزوں نے زچ ہو کر مجبوراً اسی کی شرائط پر صلح کر لی مگر ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء کو ان کے اشارے پر نظام اور مرہٹوں نے ایت گیر میں معاہدہ کرکے اچانک مملکت خداداد پر دھاوا بول دیا۔ ٹیپو نے نظام کو لاکھ مذہب و ملت کا واسطہ دیا، مابین بیٹی بیٹوں کی شادی کی پیشکش کی اور اسے اپنا حلیف بنا کر انگریزوں اور مفسد مرہٹوں کا

قلع قمع کرنا چاہا لیکن نظام رضامند نہ ہوا ۔ بہرکیف جنگ ہوئی اور ٹیپو کو کامیابی ہوئی ۔ یہ جنگ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء سے ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء تک جاری رہی ۔ شاہ نور کی فتح کے فوراً بعد ٹیپو نے فوج کے دو حصے کرکے ایک حصہ کو حیدر آباد اور دوسرے حصہ کو پونہ کی مہم پر روانہ کر دیا تھا اور خود سرنگاپٹم کی طرف توجہ کی جہاں محمد علی کمیدان جیسے رکن رکین سلطنت نے نمک حرامی کرکے قبضہ جما لیا تھا ۔ جائے فرار نہ دیکھ کر محمد علی کمیدان نے خودکشی کرلی ۔ تاہم طوطا چشم امراء کی اب بھی کمی نہ تھی ۔ زوال و انحطاط کی وبا سے اعتبار معدوم ہو چکا تھا ۔

بہرحال سرنگاپٹم سے فراغت کے بعد افواج کی کمک اور رسد کا انتظام کرنے کے لئے شاہ نور میں قیام کیا ۔ اس انتظام کی خبر نے حیدر آباد اور پونہ میں کھلبلی پیدا کردی ۔ سلطانی امیر برہان الدین نے بنکاپور اور مصری کوٹہ پر قبضہ کرلیا اور سید حمید اور سید غفار نے مندری ورگ پر دھاوا بولا ۔ خود سلطان ٹیپو کے زیر کمان فوج ہری پنڈت پھڑکیا کے عساکر کی طرف بڑھی ۔ اس جنگ کا مفصل حال فتح نامہ ٹیپو سلطان موجود ہے اور مصنف کا دعوےٰ ہے کہ ؎

جو کچھ میں لکھا ہوں یو سب بے اختلاف — ہیں سب سچ نہیں اس میں یو بر خلاف
جو کوئی یہ سخنہا کوں جانے دروغ — نہیں اس میں بھی نور دل کا فروغ
سخن سب میں روشن تر از آفتاب — ہیں خفاش منکر نہیں اس میں آب

اس مثنوی کا گمنام مصنف کچھ اس درجہ نالاں ہے کہ وہ مرہٹوں اور عساکر نظام کے سربراہوں کو بلا تکلف گالیاں دیتا ہے ۔ مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے :۔

عجائب سنو دوستو داستاں — کہ جس کے بیاں میں ہے قاصر زباں
مراہٹہ مغل فوج سب جمع کر — خوشی سات سلطاں کی سن جب خبر
کئے سب نے یوں شرط سوگند سات — لیویں ملک جلدی سوں اب ہات ہات
سبھی مال ملک و دریا و حصار — دونوں لیویں ہم بانٹ ہے یہ قرار
حجام للی راستہ معمول کر — بھی بالاجی پنڈت سنگ بدسیر
ہری پنڈت کے لڑکے فاجیرہ — لے سنگات افواج سب باکرہ

....

مثنوی کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سنہ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کے فیصلہ کن معرکے کا مذکور ہے ۔ اس وقت سلطان شاہنور سے سرنگاپٹم آچکا تھا ۔

پٹن بیچ پہونچی ہے جب یہ خبر — کہ لڑنے کو باندھے ہیں رنداں کمر
خوشی سات سلطاں سب فوج لے — ملاقات خاطر انو کی سپلے

....

خبر سُن یہ حجام للی سنے او — اپس ہات سے آبرو اپنی کھو
کیا مشورت بخشی بیگم کے سات — میں سمجھا تھا کچھ ہوئی کچھ اور بات
اٹا کیا کروں مگر کاں بھاگ جاؤں — نہیں ہے مجھے سر چھپانے کو ٹھاؤں

دراصل سلطنت خداداد کی اندرونی شورشوں اور بغاوتوں نے نظام اور مرہٹوں کے حوصلے بلند کردئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ آسانی ٹیپو کو شکست دے کر اس کی مملکت کو آپس میں تقسیم کرلیں گے ، لیکن جب سلطان نے بیک وقت تین چار محاذوں پر نہ صرف لڑنے کا فیصلہ کیا بلکہ خود آگے بڑھ کر حملہ آور ہوا تو مخالفوں کے حوصلے پست ہوگئے ۔ اسی دوران اندرونی شورشیں فرو ہوگئیں اور جب سلطان اس

اتحادی محاذ کی طرف بڑھا تو مخالف افواج میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ سلطانی فوج نے کوچ پر کوچ کر کے تنگ بھدرا کو پار کیا اور اس مقام کا رخ کیا جہاں ہری پنڈت اور نظام کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں ؎

ادتر تنگ بھدرا کوں لے سات فوج — چلے جوں کہ دریا پہ چلتی ہے موج
خبر سُن مرہٹہ مغل تلملے — لگے رونے یک یک کے لگ لگ گلے

آخر مغل سردار ڈر کر حیدرآباد کی طرف بھاگے اور بالاجی نے پونہ کی راہ لی ؎

گیا بھاگ کر حیدرآباد تب — دیا ننگ ناموس برباد سب
بھی بالاجی کر اپنی دھوتی خراب — چھپا جاکے پونہ میں جلدی شتاب
ہری پنڈت و راستہ ہولکر — بھی دو سرے خراں سب یہ سُن کر خبر

سربراہوں کی روانگی سے افواج میں بددلی پھیل چکی تھی اور وہ جم کر مقابلہ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ سلطانی فوج نے بمشکل انھیں گھیرا اور شبخون مارتی ہوئی مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئی ؎

بھی سلطاں کئے انپو شبخون چار — دلے ہو کے ہشیار وہ بدشعار

غفار حکیم خاں نائطہ اہل و عیال کو لے کر بھاگا۔ ہری پنت کا بیٹا اور اس کے اہل و عیال نیز دیگر کتب تاریخ کے مطابق ہلکر اور بہت سے سرداروں کے اہل و عیال بھی گرفتار ہوئے، لیکن سلطان نے انتہائی سیر چشمی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں پورے اعزاز و احترام کے ساتھ پالکیوں میں بٹھا کر مرہٹوں کے پاس پونہ بھیج دیا۔ دربار پونہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اور بعد کے دور انگریزوں کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ سلطان پر جب انگریز فوج کشی کریں تو کہیں مرہٹے اس کے ساتھ نہ ہو جائیں اس لئے انھوں نے مختلف حیلوں سے ہلکر اور سندھیا کو شمال کی طرف اُلجھا دیا۔ بہرحال اس مثنوی میں سلطان کی اس فیاضی کے واقعہ کو اس طرح سراہا گیا ہے:۔

کئے معاف سلطاں نے سب لوٹ کوں — مگر فیل گھوڑے سبھی اونٹ کوں
دئے قیمت کوں ان سے خریدی کئے — بھی انعام ہر یک کوں بجھد دئے
اُو تر کر منادی سے کئے جابجا — کسی کا نہ کوئی مال لیوے چھپا

مرہٹوں کی جو فوجیں بھاگ سکیں ان میں ہری پنڈت اور اس کے رفقائے خاص بھی تھے ؎

نہ لا تاب جنگ و جدل بھاگ کر — ادترنے کوں جاتے ہیں کشنا ادپر (دریائے کرشنا)

انھوں نے قلعہ بہادر بندہ کا رخ کیا جسے سلطان نے جلد ہی فتح کر لیا۔ ہری پنڈت کی افواج قلعہ سے جا چکی تھیں۔ اہل قلعہ کو امان مل گئی ؎

اماں دی قلعہ پرسوں سب کو دوتار — کتوں پر کئے نور دیں آشکار

ہری پنڈت اور ہلکر نے اہل قلعہ سے خفیہ ساز باز کی اور انھیں سلطانی افواج پر شبخون کے لئے آمادہ کرنا چاہا ؎

ہری پنڈت و راستہ ہولکر — بلا ان کو پوچھا کہو کیا خبر
ہمیں آئے تھے تم نے جلدی کئے — ہو کیوں گھابڑے تم قلعہ کوں دئے

مگر اہل قلعہ نے جو سلطان کی رواداری اور بلند نظری سے متاثر تھے انھیں بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر بھی مرہٹے ان سے رسد اور ہتھیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور جنگلوں میں جا چھپے۔ سلطانی لشکر برابر ان کا تعاقب کرتا رہا، لیکن وہ جم کر مقابلہ نہ کرتے تھے اور عموماً شبخون مارتے رہتے تھے۔ پھر بھی سلطانی افواج نے ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا ؎

ہری پنڈت لڑنے کی نالا کے تاب — بجا گیئی اپنی سب سے شتاب

گئے بھاگتے کوڑیاں ہار کر　　اسی طرح سوں پوستہ ہولکر
ہری پنڈت لے سات سب خاص عام　　گئے جاکے نزدیک کشنا مقام

وہاں سراسیمگی اور فاقہ کشی کے علاوہ انھیں وبائی امراض نے گھیر لیا۔

کئی ہول دل کے مرض سے مرے　　دگئی تپ ولرزہ سوں جانکوں دئے

اسی اثنا میں سلطانی افواج کی آمد آمد کی خبر نے بھگدڑ مچادی۔ اور انھوں نے طلابہ کی راہ لی۔ طلابہ کے لوگوں نے انھیں سلطان سے صلح کرنے کا مشورہ دیا۔

بھلا ہے کسی طرح سلطاں کے ساتھ　　صلح کر یو آفت سوں پانا نجات

سلطان خود بھی ان کے تعاقب سے پریشان ہو چکا تھا۔ معرکۂ طلابہ میں اس نے ایک اور حربہ استعمال کیا اور مرہٹوں کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے کنجڑیوں اور ہیجڑوں کو بلاکر اس کام پر مامور کیا کہ وہ زنانہ لباس میں اجناس کی خرید و فروخت کے بہانہ مرہٹہ لشکر میں جائیں اور رات کے وقت قریبی جنگل میں چھپ کر وہاں سے "شہاب" سر کریں۔ جب یہ شہاب آسمان سے مرہٹہ لشکر پر گرے تو انھوں نے اسے بلائے آسمانی سمجھا۔ زنانہ لباس میں دو ہیجڑے پکڑے گئے جنھوں نے ہری پنڈت اور ہلکر کو بتایا کہ تم بھاگتے پھرتے ہو اس لئے۔

نپٹ ہو کے لاچار سلطاں دیں　　بلاکر کنجڑیاں و ہیجڑیوں کتیں
تمھارے سوں لڑنے کوں میداں کے سات　　روانہ کئے دے شہاباں سنگات
شباشب ہمیں لڑنے تم سات آئے　　طلابہ کے اوپر شہاباں چلائے
شہاباں کا آواز سنتے تم　　گئے سب حواس ہائے غزرہ کوگم؟

تاہم انھیں یقین نہ آتا تھا اور وہ اسے دیوتاؤں کے قہر سے منسوب کرتے تھے۔ یہ 'شہاب' دراصل آتشبازی کی قسم کی کوئی چیز تھی جسے راکٹ کی طرح دور سے سر کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطانی لشکر سے بدرالزماں خاں اور محمد رضا خاں خطیب مزید گفتگو کے لئے مرہٹہ لشکر میں گئے۔ آخر صلح ہوگئی اور مرہٹے سوا مادی بالاجی پیشوا کے پاس چلے گئے۔

ٹیپو سلطان نے اپنے دشمن ہری پنڈت پھڑکیا کی جوانمردی پر اسے کنجن گڈھ کا علاقہ بطور جاگیر دے دیا۔ اور اسی کی سفارش پر عبدالحکیم خاں نائطہ کو معافی دے کر شاہنور کی ریاست اسے دوبارہ عطا کر دی۔ یہی ہری پنڈت پھڑکیا ہے، جس نے بہت جلد سلطان کے سارے احسانات فراموش کر دئے اور اس کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔

اودھ یہی وہ زمانہ ہے جب آصف الدولہ کے زیر اقتدار صوبۂ اودھ روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ دولت کی فراوانی اور عیش و نشاط کی فضا نے شعر و شاعری کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ خود آصف الدولہ، سوز کی شاگردی کے باوجود اپنی شاعری میں سوز و گداز اور اثر آفرینی سے محروم رہے۔ بہت کہا تو صرف اس قدر کہ۔

گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں　　کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں

ورنہ حقیقت یہی تھی کہ۔

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف　　تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

عیش و عشرت کے ماحول میں درد و غم کے بیانات بے وقت کی راگنی بن گئے۔ خود دہلوی شعراء بھی دلّی اُجاڑ کر لکھنؤ پہنچے تو اسی رنگ میں رنگ گئے۔ فراغت اور اطمینان نے ان کے قویٰ اتنے مضمحل کر دئے کہ ہندوستان کی ابتری اور بے چینی انھیں خواب تھرا

دی گئی اور جب روہیلوں کو تباہ کردیا گیا تو شادیانے بجائے گئے۔ ادھر دلّی کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ضابطہ خاں، شاہ عالم سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے بلا تکلف مرہٹوں سے سازباز کی اور دہلی پر حملہ کردیا۔ متھرا کی سڑک پر تغلق آباد کے قریب چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ان ہی معرکوں میں غوث گڈھ کے مقام پر ضابطہ خاں کو زک اٹھانی پڑی۔ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد ضابطہ خاں نے روہیلوں کی تھوڑی بہت قوت جمع کرلی تھی۔ سوداؔ نے اس واقعہ کی تاریخ یوں کہی ہے :-

کھیت رہنے سے یار و حافظ کے — قوم افغاں کا رہ گیا تھا بھرم
ضابطہ خاں نے لڑ نجف خاں سے — نہ رکھا کچھ سپہ گری کا دھرم
تھا تو تتا دلے نہ دیکھا تھا — کچھ زمانے کا اپنے سرد اور گرم
شیر میداں سے خاسکر بھاگا — منڈ کے رونہ کا اپنے منھ پہ چرم
تب بڑے پیر کی کہی تاریخ — غوث گڈھ سے گیا وہ کھو کر شرم

کلیات سوداؔ، صفحہ ۲۲۴ - مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۶ء

مگر انجام کار شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے نجف خاں کو علحدہ کرکے ۱۱۹۹ھ میں ضابطہ خاں کو قلمدانِ وزارت سونپ دیا ۱۱۹۸ھ میں ضابطہ خاں کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا غلام قادر روہیلہ وزیر ہوا۔ مرہٹوں اور روہیلوں کی کشمکش میں بادشاہ اور عوام کا جینا یونہی حرام ہو چکا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اسی سال شاہ عالم نے خود کو مرہٹوں کی سپردگی میں دیدیا جو سندھیا کے ماتحت تھے۔ اب انگریزوں نے بھی جن کی دلّی دربار پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت اب تک نہ ہوئی تھی، شاہ عالم کی پنشن بند کردی۔ ادھر سندھیا نے شاہ عالم سے پٹیل کا خطاب پایا جو غلام قادر کو ایک آنکھ نہ بھایا، اور وہ مرہٹوں سے جنگ آزما ہوا۔ ۱۱۹۹ھ میں ادبار و نحوست نے ہر طرف۔ شکنجوں میں جکڑ لیا تو شاہ عالم نے سنبھل کر مرہٹوں کی گرفت سے نکلنے کی بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا بلکہ اس کا نتیجہ الٹا یہ ہوا کہ اب مرہٹوں کی ایک مستقل فوج دلّی میں رہنے لگی۔ غلام قادر نے جو اپنے اقتدار کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا، مرہٹوں کو رشوت دے کر دلّی سے ہٹادیا۔ جب راستہ صاف ہو گیا تو حملہ کرکے شاہ عالم کو گرفتار کرلیا۔ اور نہایت سختی سے چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ پوچھا۔ اس کے انکار پر نجیب الدولہ کے اس رذیل فطرت پوتے نے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ یہ واقعہ ۱۲۰۲ھ میں پیش آیا۔ میر تقی میرؔ نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر کہا ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

یہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے چاردانگ ہند میں زلزلہ برپا کردیا۔

غلام قادر نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالنے کے بعد اس سے پوچھا "بول اب تجھے کیا سوجھتا ہے ؟" اور شاہ عالم صرف اس قدر جواب دے سکا کہ "مجھے وہ قرآن پاک دکھائی دیتا ہے جو میرے اور تیرے درمیان ہے"۔ اس عبرتناک سانحے پر دوسرے شعراء کے علاوہ اس نے بھی[1] خود اپنا مرثیہ کہا ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد بر باد سر و برگ جہانداریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودم — بردر شام زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشم من کندہ شد از جورِ فلک ابتر شد — کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزائش ایں بود — چیست امید کہ بخشد گنہ گاریِ ما
حق طفلاں کہ ز سی سال فراہم کردند — کردہ تاراج لحو دند وفاداریِ ما[1]

---

[1] شاہ عالم نے تیس برس تک غلام قادر کی پرورش اولاد کی طرح کی تھی۔

عہد وپیمان نہ دادہ و نمودند وفا   محلیاں خوب نمودند وفا داری ما
شمشیر دادیم بہ افعی بچۂ پروردیم   عاقبت گشت بجور پئے خونخواری ما
قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی دادند   بسکہ گشتند مجوز بہ گرفتاری ما
این گدا زادۂ ہمدان کہ بہ دوزخ برود   بانی جور و ستم شد بہ دل افگاری ما

اسی مرثیہ میں شاہ عالم نے ان تمام نمک حراموں اور غداروں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بدولت اسے یہ دن دیکھنا پڑا ؎

گل محمد کہ زمرواں بہ شرارت کم نیست   چہ قدر کرد وکالت پئے آزاری ما
نامراد او وسلیماں و بدل بیگ لعیں   ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاری ما
شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من   زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

وفاداروں اور بہی خواہوں کا بھی ذکر ہے ؎

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست   ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

اور انگریزوں اور آصف الدولہ سے بھی دادرسی کی توقعات وابستہ کی ہیں ؎

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند   چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما
راجہ و راؤ، زمیندار امیر و فقیر   حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما

محلات کی طوطا چشمی کا بھی گلہ کیا ہے ؎

نازنیناں پری چہرہ کہ ہمدم بودند   بنیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

آخر میں امید افزا حالات یہ بھی کہلواتے ہیں کہ ؎

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدم   باز فردا دہد ایزد سر سرداری ما

بہر حال یہ دردناک مرثیہ ایک شہنشاہ کی بے بسی کا عبرتناک مرقع ہے۔ شاہ عالم، سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید تھا۔ اسی اثناء میں مدھیا، مرہٹوں کی فوج لے کر آگیا۔ غلام قادر محلات میں آگ لگا کر شاہدرہ میں اپنی فوج سے جا ملا۔ میرٹھ میں مرہٹوں اور غلام قادر کی مڈبھیڑ ہوئی۔ غلام قادر بھاگا، لیکن گرفتار ہوا، زباں درازی کی پاداش میں زبان کاٹی گئی۔ گدھے پر سوار کرکے گشت کروایا گیا پھر بڑی اذیت دے کر قتل کیا گیا۔ انشاء نے تاریخ کہی ؎

نطفۂ ابلیس وشئے بدسرشت   آنکہ قضا ایشش بجہنم رساند
خانۂ تیموریہ برباد داد   زاقمشہ وامتعہ چیزے نماند
کند لعیں چشم شہنشاہ را   طرفہ کرند بخلافت رساند
سانحہ افگندہ سر خود بہ پیش   فاعتبروا یا اولی الابصار خواند

۸۹ ۱۷ ۶

جب دلی پر یہ گزر رہی تھی، شعرائے لکھنؤ زلف و کاکل کے پیچ میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں میر حسن کی سحر البیان ہی منظر عام پر آئی تو اس کا رنگ کچھ یہ تھا ؎

کھولئے شوق سے بند انگیا کے   لپٹ کر ساتھ نہ شرمائیے آپ   (رنگین)
تیرے پستان پر نظر آتا ہے عالم نور کا   اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا   (مصحفی)

اہل دلی کی معاملہ بندی اقتصادی بدحالی اور آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے اس حد تک کبھی نہ کر سکی، گو اس سانحہ سے

پہلے خود شاہ عالم کا یہ حال تھا ؎

صبح تو جام سے گزرتی ہے شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گزرتی ہے

آخرکار اس کی شاعری کا رنگ یہ ہوگیا:۔

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا ہم تو بندے اسکے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اسنے آہ ہو جیو یارب بھلا اس چشم آتشبار کا
اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

"نادرات شاہی" میں اس کا ہندی کلام بھی موجود ہے۔ اردو دیوان میں مثنوی "منظوم اقدس" یعنی شاہ چین مظفر شاہ کا قصہ بھی ہے اور نثر میں چار جلدوں میں "شاہ عالم کا قصہ" بھی پایا جاتا ہے، لیکن اس کی یہ عجیب خصوصیت ضرور حیران کن ہے کہ اس نے آنکھ کے مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا ہے ؎

دلبر سے مل کے آہ ان آنکھوں نے کیا کیا کی ایسے بت سے چاہ ان آنکھوں نے کیا کیا
کرتی ہیں میرے دل پہ جو کچھ بلا سو آنکھیں تقصیر نئیں کسو کی جو ہیں بلا سو آنکھیں
مجھ سے سلونی آنکھوں نے کیا کچھ کیا ہے ہائے دل میرا دام عشق میں پھنسوا دیا ہے ہائے
دلبر سے دل لگایا ان آنکھوں کا برا ہو جی مفت میں پھنسایا ان آنکھوں کا برا ہو

اس آڑے وقت میں سندھیا نے مغل بادشاہ سے وفاداری کا ثبوت دیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے بھی اسے فرزند دلبند کا خطاب دے کر مختار کل بنا دیا۔ بادشاہ نابینا ہونے کے باعث کاروبار سلطنت سے دست کش ہو چکا تھا اور اب تمام قلعے اور شہر میں سندھیا کا طوطی بولنے لگا، لیکن لال قلعہ کی حفاظت کی ذمہ داری کا اعزاز مرہٹوں کی قسمت میں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔

وارن ہیسٹنگز جس نے شاہ عالم کی پنشن بند کی تھی اکثر کہا کرتا کہ کلایو کو اتنا گراں بہا تحفہ دینے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ یہ اس کی اپنی چیز نہ تھی۔ اب بنگال انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ بادشاہت کے خاتمے کے لئے کڑا اور الہ آباد کے اضلاع بھی شاہ عالم سے لے کر نواب اودھ کو دے دئے گئے۔ ہیسٹنگز جلد از جلد حکومت دہلی کی مرکزیت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ عوام کی بادشاہ پرستی انگریزوں کا سکہ نہ چلنے دے گی۔ اسی مقصد کے تحت نوابان اودھ کو سلطنت دہلی کے خلاف شہ دی جا رہی تھی۔ شاہ عالم نے وارن ہیسٹنگز کو خطاب بھی دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں ہیسٹنگز کے بعد لارڈ کارنوالس نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمانے کے بعد میسور کی طرف توجہ کی اس لئے کہ سلطان دہلی کے مقابلہ میں سلطان ٹیپو کا تدبر اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت انگریزوں کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھے۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں مرہٹوں اور نظام سے جنگ کے بعد سلطنت خداداد کی سرحدیں پونہ اور حیدرآباد تک پہونچ گئی تھیں۔ اندرون ملک شورشیں بھی دبا دی گئی تھیں۔ سلطنت خداداد فروغ پا رہی تھی مگر انگریز بھی غافل نہ تھے اور برابر فوجی طیاریوں اور جوڑ توڑ میں مشغول تھے۔ ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں جب ٹیپو، کالی کٹ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد راجہ کوچین اور راجہ ٹراونکور کی چالاکیوں کے نتیجہ میں شکست سے دوچار ہوا تو انگریزوں نے اس موقع سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کی اور مدراس کے گورنر میڈوز نے اچانک میسور پر حملہ کر دیا۔ لیکن سلطان نے اسے بری طرح پسپا کر دیا اور گورنر جنرل کارنوالس نے اس شکست کا انتقام لینے کے لئے کمر کس لیں۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں انگریز، نظام اور مرہٹوں نے ایک معاہدہ کیا کہ ٹیپو کی طاقت کو مٹا کر اس کا ملک آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔

جنوری ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء میں کارنوالس، مدراس پہونچا اور ایک ماہ کے اندر ہی تمام معاہدوں سے انحراف کرکے اس کی فوجوں نے بغیر اعلان جنگ کے بنگلور پر قبضہ کرلیا اور دوسری طرف سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نظام اور مرہٹوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ نظام کی فوجوں نے کڈپہ اور سرھوٹ پر قبضہ کرلیا۔ مرہٹوں نے پرسرام کی سرکردگی میں دھارواڑ پر اور ہری پنڈت پھڑکیا نے ہرپن پلی پر قبضہ جمایا۔

انگریز، ٹیپو سے اتنے خوفزدہ تھے کہ اتحادی طاقت کے باوجود انھوں نے حملہ سے پہلے کرنل ریڈ کی وساطت سے سلطنت خداد میں سازشوں کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ اہل مغرب کا یہ وہ حربہ تھا جس سے مشرق ابھی تک نا آشنا تھا۔ بنگلور پر انگریزی قبضہ دراصل کشن راؤ کی نمک حرامی کا نتیجہ تھا۔ اب سرنگاپٹم کا محاصرہ کیا گیا۔ جہاں عبدالغفار خاں ناظم کی نمک حرامی سے کنجام کے مورچے پر انگریزی قبضہ ہوگیا۔ پھر بھی موسلادھار بارش، رسد کی کمی اور سلطان کے جوابی حملوں کی تاب نہ لاکر انگریزوں کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ انگریزی فوج اسی وقت تباہ ہوجاتی لیکن اس کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا کہ پرسرام بھاؤ اور ہری پنتھ کے زیر کمان ایک مرہٹہ فوج اس سے آکر مل گئی وافر سامان رسد ان کے ساتھ تھا۔ اب مالکڑی اور نندی درگ کے قلعوں پر قبضہ کرکے انگریزوں نے دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا ادھر حیدرآبادی فوج نے حافظ فریدالدین کے تحت گرم کنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نظام کی فوج بھی سرنگاپٹم کے محاصرہ میں انگریزوں کی شریک ہوگئی۔ پھر بھی پہلے ہی حملے میں یہ اتحادی فوج بری طرح پسپا ہوئی لیکن شام ہوچکی تھی اس لئے تعاقب نہ کیا گیا۔ یہ ایسی فوجی غلطی تھی جس نے جنگ کا انداز ہی بدل دیا۔ اور ۱۳ فروری ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء کو ٹیپو کو انگریزوں سے دب کر صلح کرنی پڑی۔ انگریزی رشوت قصر سلطنت میں رخنے ڈال چکی تھی۔ مجبوراً یہ شرط بھی ماننی پڑی کہ تین کروڑ روپیہ بطور تاوان انگریزوں کو دیا جائے اور جب تک روپیہ ادا نہ ہو دو شہزادے انگریزوں کی حراست میں بطور یرغمال رکھے جائیں۔ مگر جب شہزادے انگریزوں کے قبضہ میں آگئے تو رشوت خور اس بات کی بھی طالب ہوئی کہ کورگ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے اور نتیجہ میں تقریباً آدھا ملک سلطان کے قبضہ سے نکل گیا!

۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں تاوان ادا ہوا۔ شہزادے واپس آئے۔ قلعوں کی مرمت کی گئی اور سرداروں سے حلف وفاداری لیا گیا۔ بحری اور بری فوج کی ازسرنو تنظیم کی گئی۔

۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں اودھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔ کمال الدین حیدر مرتب تاریخ اودھ نے ایک دوہا بھی لکھا ہے ؎

ایک ہزار آٹھ سو سمت کا پرمان ۱۲۱۲ھ جانت سکل جہان
ربیع الاول ۲۸ اور جمعرات مدوان سری پریا کوار کی جب آصف تجیو پران

وقتی طور پر لکھنؤ کی رنگ رلیوں پر اوس پڑ گئی۔ قریب قریب تمام شعراء نے سوگ منایا اور قطعات تاریخ کہے۔ نمونے کے لئے ناسخ کا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے:-

الٰہی آصف الدولہ بہادر بحق تائب تو باد مغفور
نوشتم سال تاریخ وفاتش بود باحیدر کرار محشور
۱۲۱۲ھ

(کلیات ناسخ، مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۰ء صفحہ ۳۱۲)

اس کے بعد وزیر علی خاں نے قلمدان وزارت سنبھالا۔ سوجھ بوجھ کے آدمی تھے مگر عجلت پسندی سے سیاسی ابتری کے تدارک کی فکر کرنے لگے انگریز ایسے آدمی کو بھلا کیونکر برداشت کرسکتے تھے۔ انھوں نے رقابتوں اور خود غرضیوں کو خوب ہوا دی اور جب نواب ناظر تحسین علی خاں کی درخواست پہونچی تو انگریزوں کو حیلہ ہاتھ آگیا اور انھوں نے اس الزام کے ساتھ کہ وزیر علی، آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں، انھیں تخت سے علٰحدہ کرکے درگا کنڈ بنارس میں نظربند کردیا۔ وزیر علی نے بعد میں راجہ بندیلکھنڈ، ہمت راؤ سے سازش کرکے علم بغاوت بلند کرنا چاہا لیکن راز فاش ہوگیا اور اب انھیں کلکتہ میں نظربند کردیا گیا۔ جہاں ریزیڈنٹ چیری کی بدتمیزی پر اسے قتل کرکے فرار ہوئے مگر مشی اقرار اور

راب بچے ہوں کی عنایتوں سے پھر گرفتار ہو گئے۔ اب قید تنہائی نصیب ہوئی۔ اسی زمانہ میں یہ اشعار کہے ہیں جن میں انگریزوں کے الزام کا بھی ذکر ہے ؎

جوں سبزہ رندتے رہتے ہی پاؤں کے تلے ہم ۔۔۔ اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں ۔۔۔ بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں ۔۔۔ رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے ۔۔۔ نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم

قید ہی کے عالم میں ۳۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۲ھ میں انتقال کیا۔ بہرحال ۱۲۱۳ھ خاصا پر آشوب سال تھا۔ انگریز ستم ڈھاتے تھے مگر زندہ دلانِ لکھنؤ وقت کی رفتار سے بے خبر عموماً گل و بلبل کی راگنی ہی الاپ رہے تھے۔ معاملہ بندی ریختی کی طرف رجوع کر رہی تھی اور غزل واردات سے بے نیاز تکلفات کا شکار ہو چکی تھی۔ مسایل حیات کی جگہ نفسیاتی اُلجھنیں شاعری کا مطمع نظر بن گئی تھیں، مصنوعی انداز بیان مقصد فن تھا۔ صناعی اور اختراع کی ساری کوششیں زبان و بیان کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ قریب قریب ہر شاعر اسی انداز پر سوچ رہا تھا ؎

بنت انگیا میں لگے زور تڑاقے کی پھبن ۔۔۔ دیکھ کر مارے مزے کے جنھیں جی جائے اُلٹ (انشاء)

خال خال ایسے شعراء بھی تھے جنھوں نے اس انداز پر بھی سوچا کہ ؎

قسمت میں جو لکھا سو وہی ہووے گا امیر ۔۔۔ دُنیا کے واسطے تو لجاجت نہ کیجئے
اس دہر خرابات میں رہنے کا نہیں کام ۔۔۔ جاتے رہے رفقاء تو اسی راہ گزر سے

(کلیات نواب امیر الامراء - قلمی)

نہ کیجے زعم دولت پر کہاں ہے ۔۔۔ سریر حشمت و صاحبقرانی
کہاں ہے شوکت تختِ سلیماں ۔۔۔ کدھر ہے وہ درخشِ کاویانی

مگر غالباً یہ سب وقتی تاثر کے نتائج تھے ورنہ لعبتان فرنگ کے جمال نے عموماً ان کی آنکھیں کچھ اس قدر خیرہ کر دی تھیں کہ فرنگی سیاست کی تباہکاریوں کو نہ دیکھ سکے ؎

چشم کا فر دلِ بیمار کی کو صحت بخشا ۔۔۔ یہ فرنگی نے مسیحا کا سا اعجاز کیا

لکھنؤ کی دماغ سوز شاعری سے ہٹ کر دلی پر نظر کیجئے تو وہاں اب بھی دل کی واردات ہی سب کچھ تھی۔ تاہم دونوں جگہ غزل پر سارا زور قلم صرف کیا جا رہا تھا۔ دکن میں ابھی تک مثنویوں کا دور تھا۔ مگر اکثریت مذہبی مثنویوں کی تھی۔ عشقیہ مثنویاں بھی عام تھیں، تاہم سیاسی ابتری کا ذکر وہاں بھی نہ تھا۔ اور جنوب میں بھی مذہبی اور عشقیہ مثنویاں ہی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں۔ ۱۲۰۹ھ میں مدراس کے مولانا باقر آگاہ کی ہشت گلزار اور خمسۂ متحیرہ میں ان کے نمونے ہیں۔ خمسۂ متحیرہ میں دونوں قسم کی مثنویاں ہیں۔ صبح نو، جو ۱۵۰۰ اشعار پر مبنی ہے مسایل تصوف سے متعلق ہے، زبان بہت صاف ہے جس کا اندازہ ذیل کے شعر سے کیا جا سکتا ہے ؎

مجھے کر نشۂ وحدت سے مسرور ۔۔۔ سدا رکھ دردِ توحید سے دور

'نمنت عشق' میں 'چندر بدن و مہیار' کا قصہ نظم ہوا ہے ؎

عدم تھے جو ظلمت میں بے ماہ من ۔۔۔ ہوئے نور سے تیرے چندر بدن

'حیرت عشق'، 'حسرت عشق'، المیہ مثنویاں ہیں۔ عزیز الدین خاں مستقیم جنگ نامی ارکاٹ کے ایک شاعر کی لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، بلقیس سلیمان وغیرہ مثنویاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ (ظفری بھی اسی زمانے میں دلی سے مدراس آگیا تھا۔ ایسے قادر الکلام شعراء

کی موجودگی میں یہ قرینِ قیاس نہیں کہ سیاسی حالات پر انھوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تاہم ٹیپو کی کوششوں اور انگریزوں، فرانسیسیوں اور مرہٹوں وغیرہ کی چیرہ دستیوں کی منظوم داستانیں شاذ ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہی ہے کہ انگریزوں نے اپنے عہد و اقتدار میں ایسی تمام چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلف کر دیں۔

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء لارڈ ویلزلی نے گورنر جنرل ہو کر ہندوستان کے حکمرانوں کا زور توڑنے کے لئے "سب سی ڈیری سسٹم" کا جال بچھایا اور ان کے حلیف بھی اس سے بچ نہ سکے۔ خود نظام حیدر آباد، عظیم الامراء ارسطو جاہ کی غداری سے مجبور ہو گیا کہ انگریزی فوج اپنے یہاں رکھ کر اس کے سارے اخراجات برداشت کرے۔ حیدر آباد کے فرانسیسی ملازمین بھی برخواست کروا دئے گئے، نیز مرہٹوں میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ ابدالی کا پوتا شاہ زماں ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسی طرح مرہٹوں کو نظام کے خلاف اکسایا گیا اور خود مرہٹوں میں پھوٹ ڈالی گئی۔ غرضیکہ دولت راؤ سندھیا شمالی علاقوں کی حفاظت کے لئے پونہ سے گوالیار چلا گیا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے مراد آباد کے ایک شیعہ کو بھیج کر ایران کو افغانستان سے الجھا دیا۔ سلطان ٹیپو جو اندرون ہند حکمرانوں کی خود غرضی اور دوں ہمتی کو بھانپ چکا تھا ترکی اور افغانستان سے خط و کتابت کر رہا تھا کہ انگریزوں کا استیصال کر سکے۔ لیکن ان کی ایسی ہی چالوں کی وجہ سے بیرونی امداد سے محروم رہا۔ اس کے علاوہ ویلزلی نے خفیہ خفیہ سلطان کے خاص عمایہ میر صادق، میر معین الملک، بدر الزماں خاں نائطہ، میر غلام علی لنگڑا میر قمر الدین اور پورنیا کو بھی جن پر سلطان کو بڑا اعتماد تھا، رشوت اور وعدوں کے ذریعے توڑ لیا۔ ذاتی اغراض اور انفرادی مفاد نے ملک ملت کو فروخت کرنے میں ذرا تامل نہ کیا۔ پورنیا، میسور میں ہندو راج کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ معین الدین اور قمر الدین کو کرم کنڈہ کی ریاست کے خواب دکھائے گئے اور میر صادق کو میسور میں جھنڈا گاڑنے کا سبز باغ دکھایا گیا تھا۔

میر قمر الدین کی غداری سے سرنگا پٹم کے محاصرے میں انگریزوں کو کسی مزاحمت سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ اور ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ / ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو پورنیا اور معین الملک کی غداری سے انگریزی فوج قلعہ کے گرد آ گئی۔ سلطان جو دسترخوان پر بیٹھا تھا خبر ملتے ہی باڈی گارڈ کے ساتھ موقعہ پر پہونچا۔ اور دوپہر سے چار بجے تک شمالی فصیل پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ لیکن پورنیا نے جنوبی فصیل سے انگریزوں کو قلعہ میں داخل کر لیا۔ میر صادق نے انگریزی فوجوں کی رہنمائی کی۔ غداروں اور دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا ٹیپو دست بدست جنگ کرتا رہا۔ اتنے قریبی لوگ بھی غدار ہو چکے تھے کہ سخت پیاس کے باوجود ٹیپو کے خاص غلام نے پانی کی چھاگل دینے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ خود کو گرفتار کروا لے لیکن ٹیپو نے یہی جواب دیا کہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"۔

آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا　　جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود
شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی　　یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود؟　　(ظفر علی خاں)

آخر اسی روز مغرب کے وقت ملک و ملت کے آبرو باختہ افراد کے طفیل خود انھیں کی بہبود کے لئے شیرانہ جنگ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔

اسی دور کا ایک نامعلوم شاعر ان واقعات کو یوں نظم کرتا ہے ؎

تھا میر صادق لعنتی امراؤ یزید نابکار　　سونپا تھا شہ اس کے تئیں قلعہ کا سب اختیار
کر کر فتور او بدبخت کتیا فرنگی سے قرار　　مردود نے کر اقرار یہ پٹن کو گھیرا نابکار　　(سرنگا پٹم)

. . . . پھر سلیمانی کہاں

[illegible] آن کر پٹن کو گھیرا ایک بار　　میر صادق نے کہا اس کو اتر ندی کے پار
شہ نے جا بیٹھا کر و قلعہ کے تئیں تم استوار　　فوج کو اپنی بادشہ نے کہا ہے وقت کار

پاؤ گے درجہ شہادت حق سے در ہر دو جہاں

کرنل بیٹسن کے مطابق جو اس جنگ میں شریک تھا۔ ۴ تاریخ کی صبح کو مسلمان اور برہمن نجومیوں نے سلطان سے آکر کہا کہ آج کا دن

سلطان کے [illegible] مخمس ہے۔

تاریخ تھا انیسویں ذیقعدہ روز ہفت تھا تقویم کے احوال پر آکر منجم نے کہا
تقدیر کی تحریر پر راضی ہوں بولا بادشاہ از برائے دینِ احمد جانِ خود سازم فدا
ذلتِ اسلام تا ہوئے الٰہی در جہاں

دوپہر کا وقت تھا غوغا کئے کافر تمام چھوٹے سلخ توپوں کے اکرم نہ رہا کوئی سقف و بام
میر صادق لعنتی کا جس طرف تھا اہتمام کردیا ہلا فرنگی اس طرف سیتی تمام
تاب نا لا بھاگ نکلا لعنتی ولد زناں

الغرض ضرب تفنگ از گوش تھا گوش جگر دوسرے شنبہ مبارک ہو رکھا خونِ جگر
دینِ شہ سیتی ہوا اللہ اللہ تکمر روح اعلا پر کیا پرواز ہر شمس و قمر
آواز پر آواز تھا کلمہ شہادت برزباں

یہ وہ مقتدر ہستی تھی جس کا ثانی ہندوستان پھر کبھی نہ پیدا کرسکا۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں اس کی سبق آموز وطن پرستی سے حریت پسند شعور کو ہمیشہ چونکایا گیا۔ اور صدہا نظمیں آزادی کے اس علمبردار کو خراج عقیدت پیش کرتی رہیں۔ دورِ حاضر میں درج ذیل اشعار اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

آں شہیدانِ محبت را امام آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر خاک قبرش از من و تو زندہ تر
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسین
رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز نوبت او در دکن باقی ہنوز (اقبال)

ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا ساماں تھا ورنہ تو تمہید آزادی کا اک عنواں تھا
مصر سے تا روم پہونچی تیری آوازِ بلند گونج اس کی آج بھی باقی ہے باندازِ چند
ہند میں جو چاہتا تھا ہندیوں کی برتری خود شناسی اور خودداری تھی جسکی خودسری (سیماب)

وہ بادہ جس کا کہ خوانِ شہید تھا شیدا وہ نوش جس کو کہ تغلق نے تھا پسند کیا
وہ زہر جس کا کہ ہیموں نے پی لیا پیالہ ازل کے دن سے وہ حصہ نصیب ٹیپو تھا
مراد وہ موت جسے کہئے عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں اس کو سپاہیانہ موت (محمود شیرانی)

مگر جب بھی ٹیپو کا ذکر آتا ہے غداروں کی نمک حرامی ہمارے لئے ایک لمحۂ فکر ضرور عطا کرتی ہے ؎

کشورِ ہند کا رنگ اور ہی کچھ ہوتا آج مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخ کبود (ظفر علی خاں)
آہ خود اس کے وطن نے اسے کیں غداریاں یاد ہیں وہ ذہن قومیت کی سازش کاریاں (سیماب)
وہ تو کہئے کہ اپنے ہی پرائے ہو گئے مٹ گیا تھا ورنہ سطحِ ہند سے نقشِ فرنگ (ماہر القادری)

اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد ملتے از کارِ شاں اندر فساد

نقشے کو بند ہر ملت کشاد ملک ودینش از مقام خود فتاد (اقبال)

دشمن بھی ٹیپو کی عظمت کے معترف تھے۔ اس کی موت در اصل ہندوستان کی آزادی کی موت تھی۔ جنرل ہارس اس کی لاش دیکھ کر فرط مسرت سے چیخ اٹھا۔ "آج ہندوستان ہمارا ہے" اور یہ بات غلط نہ تھی اس لئے کہ ٹیپو کی شہادت کے بعد ہی انگریزی تسلط کا ہراول دستہ "دو عملی حکومت" کی شکل میں پورے ہندوستان پر چھا گیا۔ ملت فروش غدار اور ان کے طفیل جنوبی ہند قدیت کے عبرتناک انتقام کا شکار ہوئے۔

سرنگاپٹم کے ایک یہ بھی دن تھے کہ ؎

ندیدہ کس چنیں آب و ہوائے بدیں خوبی ہمہ نزہت جائے
زباں در وصف آں فرخندہ کشور بود لال و کند خامہ نگوں سر
دکن زیں او شدہ دار الخلافہ کہ مصئوں باد از ہر آسیب و آفت

لیکن انگریزوں نے ایسا تباہ کیا کہ ۴ - ۵ لاکھ مسلمانوں کا یہ شہر آج چند سو مسلمانوں کا مسکن ہے، عوام کی اقتصادی خوشحالی کی نعش پر انگریزوں کے ایوان ہائے اقتدار تعمیر ہوتے رہے۔ اور دو چار برس کے اندر ہی لوگ دانے دانے کو محتاج کر دئے گئے میسور کے علاوہ ارکاٹ وغیرہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ عمدۃ الامراء غلام حسین خاں والی ارکاٹ کی تعریف میں اس کے درباری شاعر نامی نے تو یہ لکھا ہے کہ ؎

سب فرنگی روبرو اس کے ذرا کر نہیں سکتے ہیں کچھ چون و چرا

مگر خود عمدۃ الامراء نے نظام علی خاں آصف جاہ کو تحائف کے ساتھ جو نظم بھیجوائی تھی اس میں اپنی بے بسی کا اشارہ کیا ہے؛

ہماری کچھ نہ پوچھو اور تم بات ہمارا ملک ہے انگریز کے ہات
ہمیں ہر روز آبا کر کرو ہے ہماری زندگانی پر تم طو ہے

اسی نظم میں وہ حیدر آباد کی رونق کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس لئے کہ ابھی انگریزوں نے حیدر آباد کی طرف نظر عنایت نہ کی تھی ؎

چل اے دل دیکھ آئیں حیدر آباد جہاں کہتے ہیں عشرت کی ہے بنیاد
جہاں دار ہیں کا نقش نگیں ہے جہاں اسلام کا آئین دیں ہے
جہاں رکتا ہے تخت سرفرازی نظام الدولہ آصف جاہ غازی

بہرحال ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں جنوبی ہند سے فراغت کے بعد انگریزوں نے اپنی ساری توجہ شمالی ہند کی طرف مبذول کی۔ اور حسب دستور جنوبی ہند کے مرہٹوں اور مسلمانوں کو اپنی 'ڈپلومیسی' یا مکاریوں سے اس طرح الجھا دیا کہ وہ شمالی ہند کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت ہی نہ پا سکیں۔ دولت خداداد کے وہ اضلاع جو حیدر آباد کے حصے کے تھے وہ اپنی تحویل میں لے لئے۔ تنجور، سورت، اور ارکاٹ جیسی چھوٹی موٹی ریاستوں پر مختلف بہانوں اور طریقوں سے قبضہ کیا۔ اودھ میں وزیر علی خاں کو معزول کرنے کے بعد ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء ہی میں سعادت علی خاں کو مسند وزارت سونپ دی گئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں ایک عہد نامے کے ذریعے الہ آباد کا قلعہ خود غصب کر لیا اور لاکھوں روپیہ سالانہ معاوضہ میں مزید اضافہ کروا لئے۔

تاریخ نے تاریخ جلوس یوں کہی ہے :-

خداوندا یمین الدولہ در دہر حکومت را صد و سی سال باشد
خرد سال جلوس مسندش گفت بجاہ و حشمت و اقبال باشد
۱۲۱۴ھ

انشاؔ نے قطعہ تہنیت لکھا ہے ؎

سعادتے کہ علی داد نام پاکش را — حصول ایں ہمہ باشد بشہریار محال
یمین دولہ بہادر کہ ناظم الملک است — جناب عالی فرخ شیم استقلال
جلوس کردہ امسال و سال عالی الحال — فزوں دوازدہ است از دوازدہ صد سال
مدد ائمہ اثنا عشر نمودندت — خوشا سعادت طالع زہے ہمایوں فال

اسی موقع پر انشاؔ کا وہ شاہکار قصیدہ جس کے آخر میں مختلف زبانوں کے مصرعے ہیں - اسی قصیدہ کے آخر میں دعائیہ کا اشعار لکھنؤ کے کارخانۂ نشاط کی غمازی کرتے ہیں :-

تیرے ہی ہجر میں گایا کریں سب اہلِ نشاط — قول و آہنگ ودھوا، ا ٹھا، ترانہ، سرگم
بھیرویں، گن کلی اور مالسری اور سارنگ — پوربی، گوری، یمن، برج میں اور جھنجھوٹی ہم
سامنے تیرے ہی ہر وقت رہے ان کی صدا — تانیں لہراتی رہیں ایسی ہی جوں موجۂ یم
راجہ اندر کے اکھاڑے میں ہو جوں پریوں کا ناچ — درِ دولت پہ رہے یونہی ہمیشہ چھم چھم

لیکن خود سعادت علی خاں نے عوام کے رجحان کے برعکس اس 'چھم چھم' کی طرف زیادہ التفات نہ کیا بلکہ اس ادھیڑبن میں مشغول ہو گیا کہ کسی طرح روپیہ اکٹھا کر کے انگریزوں کا قرضہ ادا کر دے تاکہ ان کی گرفت سے نکل سکے اور اپنے علاقے واپس لے انگریز ایسے بیدار مغز شخص کو بھلا کیونکر برداشت کر سکتے تھے - ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں اسے دبا کر انگریزوں نے ایک اور معاہدہ کیا جس کی رُو سے وہ تمام علاقے جو انگریزی فوجوں کی مدد سے حکومت اودھ کے ہاتھ آئے تھے نکل گئے - (پھر بھی سعادت علی خاں اپنی کوششوں میں لگا رہا، لیکن قبل اس کے کہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء میں خود انتقال کر گیا)

ناسخ نے تاریخ لکھی ؎

افسوس کہ نواب یمین الدولہ — از ملک فنا رفت بحکم تقدیر
تاریخ وفات او نوشتم ناسخ — 'افسوس وزیر بو آصف تدبیر'

۱۲۲۹ھ

۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں انگریزی سازشوں کے نتیجے میں ہلکر اور سندھیا میں حصول اقتدار کی زور آزمائی شروع ہوئی - ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں باجی راؤ ثانی کو انگریزوں نے بہ رُوئے معاہدہ بسین اپنے سلسلۂ عاطفت میں لے کر سندھیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا - ۱۱ ستمبر ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک کی سرکردگی میں ان مرہٹوں پر حملہ کیا گیا جو دلی میں موجود تھے اور مرہٹوں کے آپس کے نفاق کی برکت سے ۱۴ ستمبر کو انگریز فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے دلی میں داخل ہو گئے - اس سے پہلے سندھیا کو ملا کر ناگپور کے بھونسلا کو غلام بنایا گیا تھا - بہرحال دسمبر ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں سری ارجن گانو کے معاہدے پر سندھیا سے دستخط لئے گئے جس کی رُو سے اسے دوآب کا سارا علاقہ بشمول آگرہ و دہلی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا - جنرل لیک کو شاہ عالم کی جانب سے 'صمصام الدولہ، اشجع الملک، جنرل دوراں جنرل لیک بہادر فتح جنگ' کے خطابات عطا کئے گئے - خلعت و انعام سے بھی نوازا گیا - شاہ عالم، مرہٹوں کی گرفت سے نکلا بھی تو اس لئے کہ انگریزوں کا طوق غلامی پہن لیا - بہرحال سب کرنل اکٹرلونی کمپنی کے ڈپٹی اینڈ جوائنٹ جنرل دلی کے ریذیڈنٹ ہوئے - بادشاہ کا سکہ چلتا رہا لیکن اسے ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ

سالانہ پنشن دے کر امورِ ملکی سے بیدخل کر دیا گیا۔ سندھیا سے فراغت کے بعد اندور کے مرہٹہ راجہ جسونت راؤ ہلکر کی طرف توجہ دی گئی۔ ولزلی نے "سب سڈی ایری سسٹم" کا جال پھینکا لیکن وہ فریب میں نہ آیا تو ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں اس پر حملہ کر دیا گیا۔ امیر خاں روہیلہ اور چند چھوٹی چھوٹی جاٹ ریاستیں ہلکر کے ساتھ تھیں انھوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ اور اگست ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں انگریزی فوج کے پرخچے اڑا دئے۔ ہلکر کی فوجیں دو آبہ تک بڑھ گئیں، مگر جنرل لیک کی چالاکی اور انگریزی توپخانہ کی آتش فشانی کی وجہ سے گڑھیوں میں محصور ہو گئیں۔ آخر نومبر ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء جنرل لیک نے ڈیگ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اب انگریزوں نے مرہٹوں اور جاٹوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور ڈیگ کی فتح کے بعد اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انشا نے اپنی ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

مروڑی فوج انگریزی نے دی اک ایسی بے بل سے　　کہ رسی کٹ گئی ہولکر کی ٹوٹا جاٹ کا جوڑا

اسی زمانہ میں یورپ میں نپولین نے انگریزوں کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ ولزلی کی تشدد پسند پالیسی نے انھیں اور مسایل میں الجھا دیا اور ولزلی کو معزول کر کے کارنوالس کو دوبارہ بھیجا گیا تاکہ کسی طرح مرہٹوں سے صلح کر لے۔ مگر ہندوستان پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں وہ مر گیا۔ اس کے جانشین بارلو نے ہلکر اور سندھیا سے دب کر صلح کر لی۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں اندھے بادشاہ شاہ عالم کا بھی انتقال ہو گیا۔

اور تاریخ کے مطابق ؎

ختم شد سلطنت حضرت تیمور امروز　　کرد ملک عدم آباد شہ کشورِ ہند
سال تاریخ پے رحلتِ شاہ عالم　　گفت دل زیر زمیں بود شہ کشورِ ہند

۱۲۲۱ھ

"افسانہ از افسانہ ....."

(ولے برزندش)

(ع - ر)

ایک انگریز انشاپرداز کا قول ہے کہ "کہانیاں شروع نہیں ہوتیں بلکہ پودوں کی طرح اگتی ہیں۔"

اسی طرح سعید حسن کی کہانی اُس وقت شروع ہوئی جب وہ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا کہ خادمہ نے آکر کہا :-

"چھوٹے میاں دروازے پر ایک آدمی آپ کو بلاتا ہے۔"

سعید حسن نے پوچھا "کون ہے ؟"

خادمہ نے جواب دیا ۔ "فقیر سا معلوم ہوتا ہے اور نام نہیں بتاتا ۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

سعید حسن نے خادمہ سے کہا "پوچھو تو سہی کیا چاہتا ہے۔"

خادمہ نے دروازے پر جاکر تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا : "وہ کہتے ہیں کیا کام ہے ؟"

اس آدمی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت ٹوکری تھی جس کے ڈھکنے پر پیازی رنگ کا فیتا بندھا ہوا تھا - وہ ٹوکری کو اٹھا کر اپنے منہ کے قریب لے آیا اور اس کے چھیدوں میں سے دیکھ کر کہنے لگا کہ "بلی ہے۔"

خادمہ نے پوچھا "سعید میاں کے لئے ؟ کس نے بھیجی ہے ؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں، سامنے سڑک پر سے ایک بند گاڑی جا رہی تھی ایک دایا نے دروازہ کھول کر مجھے بلایا - ایک چونی دی اور اس مکان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ ٹوکری سعید حسن صاحب کو جو اس مکان میں رہتے ہیں دے آؤ۔"

خادمہ نے کہا :- "اچھا تو ٹھہرو میں انھیں بلاتی ہوں۔" اور کھانے کے کمرے میں جاکر کہنے لگی :- "چھوٹے میاں وہ کہتا ہے کہ آپ کے لئے کسی نے بلی بھیجی ہے۔"

سعید حسن نے حیران ہوکر کہا "بلی ؟ میں نے تو کوئی بلی نہیں منگائی تھی۔"

خادمہ نے جواب دیا : "نہیں صاحب وہ کہتا ہے کہ ایک زنانہ گاڑی میں سے کسی نے اُسے پیسے دے کر بلی آپ کو پہونچا دینے کے لئے بھیجا ہے۔"

سعید حسن کی والدہ مسکرائی "خوب !" اور سعید حسن کی طرف دیکھا - اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں -

اس کی والدہ نے خادمہ سے کہا "بلی کو اندر لے آؤ۔"

سعید حسن نے بھی دبی زبان سے کہا "اس آدمی سے کہنا کہ ٹھہرے۔" اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی عورت یا لڑکی اُسے بلی یا کوئی اور تحفہ بھیج سکتی تھی، کیونکہ وہ ان کے احاطۂ اثر سے ابھی کوسوں دور تھا۔

خادمہ ٹوکری اندر لے آئی اور اس میں سے ایک ہلکی باریک غم زدہ سی "میاؤں" کی آواز آئی ۔ سعید حسن نے اٹھکر ٹوکری لے لی اور اسے میز پر رکھ کر کھول دیا ۔ ایک بڑی بڑی آنکھوں والا چھوٹا سا ایرانی بلی کا سفید بچہ نکل کر باہر آگیا ، جو بمشکل ایک

سے ہوتی۔ جہاں تک سعید حسن کو بلیوں کے متعلق واقفیت تھی
[illegible] نہایت اطمینان سے کا تا

سعید حسن کی والدہ نے کہا "اسے دودھ پلائیں" اور ایک پرچ میں دودھ ڈال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ سعید حسن نے کمرے سے باہر آکر اس آدمی سے پوچھا:-

"یہ بلی کا بچہ تمھیں کس نے دیا تھا؟"

"ایک زنانہ بند گاڑی وہاں کھڑی تھی"۔ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں سے ایک نرس نے سر نکال کر مجھے بلایا اور یہ ٹوکری دے کر مجھ سے کہا کہ آپ کو پہونچا دوں جب میں نے آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو گاڑی چلی گئی۔"

سعید حسن نے پوچھا "نرس؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں نرس جو اسپتال کی وردی پہنے ہوئے تھی۔ گاڑی میں کوئی اور بھی تھا، غالباً پردہ دار عورت ہوگی، کیونکہ وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتی تھیں، اور نرس نے بہت تھوڑا دروازہ کھول کر مجھ سے گفتگو کی تھی۔"

"تو لو، یہ تمھارا انعام ہے" سعید حسن نے ایک اور چونی اسے دیدی، اور جب وہ چلا گیا تو کھانے کے کمرے کی طرف واپس آیا۔ آتے ہی اس کی والدہ نے کہا:-

"ٹوکری میں کچھ اور بھی تھا سعید"۔

"کیا؟"

اس کی والدہ نے ایک سادہ کارڈ اس کے ہاتھ میں دیدیا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:-

"اس نوجوان کے لئے جسے بلیوں سے پیار ہے"

"لانے والے سے کچھ پتہ چلا؟" اس کے ابا نے پوچھا۔

"کیا اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟"

"نہیں"

سعید حسن کہنے لگا "اس بچے کا نام عطیہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ بھی تو عطیہ ہی ہے"

وہ ایک چھبیس سالہ نوجوان تھا، نہ بہت حسین اور نہ بدصورت بلکہ جس طرح صحیح و توانا اوسط درجے کے نوجوان ہوا کرتے ہیں وہ بھی تھا، گریجویٹ ہو جانے پر بھی کالج کی زندگی اس کے اطوار کو بگاڑ دینے میں کامیاب ثابت نہ ہوئی تھی اور چونکہ وہ ولایت نہیں گیا تھا اس لئے جنس لطیف سے زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اب بھی جب کبھی اس کے والدین اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑتے تو اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی اور وہ آنکھیں نیچی کرکے کہا کرتا "فی الحال اس کی کیا ضرورت ہے"۔

ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ اُسے پالتو جانوروں، خصوصاً بلیوں سے بہت اُنس تھا۔ جب کبھی بازار میں کچھ خریدنے جاتا اور وہاں کسی دوکان پر بلی بیٹھی ہوئی نظر آتی تو سب کام بھول کر وہ اسے گود میں لے لیتا اور پیار کرنے لگ جاتا، راستہ میں چار پانچ بلیوں سے اس نے دوستانہ تعلقات پیدا کر رکھے تھے اس لئے روز دفتر جاتے وقت ایک دو منٹ ہر ایک کے پاس ٹھہر کر اسے پیار کرتا اور اس کے کان میں میٹھی میٹھی باتیں کہتا۔ کبھی کبھی ان کے لئے گھر سے کوئی لذیذ چیز جیب میں ڈال کر لے جایا کرتا۔ اور وہ بھی اپنے مکان کے احاطہ کی دیوار یا پھاٹک کے سامنے چشم براہ بیٹھی رہتیں کہ ابھی ہمارا چاہنے والا اس راستے سے گزرے گا۔

عطیہ نے دودھ ختم کرکے سب کی طرف دیکھا۔ پھر سعید کی طرف آئی اور اس کے شانے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کون ہوگا جس نے اُسے تحفہ بھیجا تھا، محبت سے کبھی اسے سابقہ نہیں پڑا لیکن اس وقت اس کے دل میں ایک عجیب سی محسوس ہو رہی تھی، اسے خیال آرہا تھا، اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی

اسی طرح دن گزرتے گئے اور گھر کے افراد بھول گئے کہ عطیہ کس طرح ان کے پاس آئی تھی، لیکن سعید نہیں بھولا، اکثر جب وہ تھکا ماندہ دفتر سے گھر آتا اور عطیہ کسی مکھی کے تعاقب میں

بھاگتی، یا اپنی ننھی ننھی بانہیں پھیلائے کی آرزو میں اس کے گرد گھومنے لگتی یا جب وہ گود میں اچھل کر بیٹھتی اور تھرتھرانے لگتی تو وہ اس سے پوچھا کرتا "عطیہ تو کس کا عطیہ ہے؟ وہ کون ہے؟"

وہ خیالی حسینہ اس کے دماغ میں سیکڑوں شکلیں اختیار کرتی اور کبھی کبھی خواب میں بھی آجاتی لیکن جب عطیہ کو آئے ہوئے دو مہینے گزر گئے تو بتدریج وہ تصویر مدھم ہونا شروع ہوگئی، تاہم وہ بدستور دفتر کے راستے میں بلیوں سے ملتا رہتا تھا، ان میں سے ایک بلا عطیہ کا رشتہ دار بھی تھا، جو اپنے لمبے لمبے ناخنوں، سیاہ بالوں کو سنوار کر اور بڑی بڑی زرد آنکھوں سے "چشم بہ انتظار" دیوار پر بیٹھا رہتا اور جب سعید آتا تو اپنی پشت کو محراب کی طرح بناتے ہوئے غرا کر اس سے اپنے حسن کی داد لیا کرتا۔

سعید نے اس کا نام سہراب رکھا تھا اور جب وہ اپنی نذر تحسین پیش کر کے دفتر کی طرف چلا جاتا ....

...... تو اس کی "مالکہ" اسے بلا کر ان بانہوں میں جنہیں سعید کے مضبوط ہاتھوں نے چھوا تھا، اپنا خوبصورت لیکن زرد چہرہ چھپا لیا کرتی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا اور عطیہ میں وہ شاہانہ وقار پیدا ہونا شروع ہوگیا جو اسے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا تھا، سعید مکان میں اکیلا تھا کیونکہ اس کے والدین پہاڑ پر گئے ہوئے تھے ایک ناول جس میں بقول ایک مصنف کے "حسن و عشق کی نیرنگیاں" دکھائی گئی تھیں، فرش پر پڑا تھا اور سعید سوچ رہا تھا کہ کیوں بعض لوگوں کو زندگی میں عجیب و غریب واقعات کا سامنا ہوتا ہے اور دوسروں کو باوجود خواہش کے کوئی واقعہ پیش نہیں آتا وہ بھول گیا تھا کہ عطیہ کا آنا ایک عجیب واقعہ تھا اور اگر اس کے بھیجنے والے کی تلاش کی جاتی تو ممکن تھا کہ عجیب تر ثابت ہوتا۔ لیکن شاید یہ بھی ہو کہ عجیب واقعات تلاش کرنے سے نہیں ملتے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عطیہ اچھل کر میز پر جہاں گھنٹی بج رہی تھی جا بیٹھی، سعید حسن نے جمائی لی اور آلہ کو اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

اس آلہ پر جیسے لوگ بغیر کسی قسم کے احساس کے بے پروائی سے استعمال کرتے ہیں، عام طور پر آوازیں کرخت اور بے سری معلوم ہوتی ہیں ....

...... لیکن بعض آوازیں دلی جذبات کی کیفیتوں سے پر ہوتی ہیں۔ یہ آواز اسی دوسری قسم کی تھی۔

آواز نے پوچھا: "کیا آپ سعید حسن ہیں؟"

"ہاں" سعید حسن نے جواب دیا "آپ کون ہیں؟"

"صبر کیجئے صاحب" آواز نے کہا "پیشتر اس سے کہ میں آپ کو اس کا جواب دوں، آپ یہ بتائیں کہ کسی ضروری کام میں مشغول تو نہیں ہیں اور کیا آپ کے پاس ایک روح سے گفتگو کرنے کے لئے وقت ہے؟"

اسے احساس ہوا کہ یہ کسی عجیب واقعہ کا آغاز ہے اس لئے وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا، اور ٹیلیفون کے آلہ کو منہ کے قریب رکھ کر بولا "نہیں مجھے بالکل فراغت ہے — تاہم —"

"بہانے بنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں تو میں کہنا شروع کردوں، کیا آپ بیٹھ گئے ہیں؟"

سعید نے کہا "ہاں بیٹھ گیا ہوں۔ اب بتائیے کہ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا بات کرنا ہے؟"

آواز نے کہا "میں — میں ایک لڑکی ہوں"۔

"یہ تو مجھے آپ کی آواز بتا رہی ہے"۔

"غالباً ناخوش آیند تو نہ ہوگی؟ — اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ شریف اور بالکل قابل اعتماد ہیں؟"

سعید حسن نے کہا "غالباً ہوں تو سہی"۔

"اچھا تو شریف اور قابل اعتماد صاحب کیا آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گے؟"

سعید حسن نے پوچھا "کیسا وعدہ؟"

"آپ دور اندیش بھی ہیں؟ خوب! لیکن میں آپ سے کسی کام کے کہنے کا وعدہ نہیں چاہتی ۔ میں صرف یہ وعدہ چاہتی ہوں کہ آپ کچھ نہ کریں گے"۔

"مجھے منظور ہے"۔

"تو آپ "باست" کی قسم کھائیے کہ آپ یہ دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں گے کہ میں کون ہوں"۔

سعید حسن نے حیران ہو کر پوچھا "باست کون؟"

"بیوباسٹس ۔ مصری پیتھاہ کی بیوی، بلیوں کی دیوی! کیا اس کی قسم کھاتے ہو؟"

سعید حسن نے کہا "ہاں قسم کھاتا ہوں ۔ لیکن ۔ مجھے دریافت کرنے کا اشتیاق ضرور ہے"۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کو اشتیاق ہے، لیکن قسم کھانے کے بعد آپ اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ نے قسم کو توڑ دیا تو تمام شہر کی بلیاں جمع ہو کر آپ کو نوچ لیں گی ۔ کیا اس خیال سے آپ کو خوف نہیں آتا؟"

سعید حسن نے کہا "بے شک خوف آتا ہے ۔ لیکن کیا یہ پوچھنا بھی ناجائز ہوگا کہ آپ کو کیونکر علم ہے کہ اس دیوی کا نام مجھ پر موثر ثابت ہوگا؟"

آواز نے پوچھا "تو کیا آپ وہ نوجوان نہیں ہیں جسے بلیوں سے پیار ہے؟"

"تو کیا عطیہ کے لئے مجھے آپ کا ممنون ہونا چاہئے؟"

"خوب، اے بیوباسٹس کے پرستار! آپ کو بلیوں کا نام رکھنا خوب آتا ہے ۔ کیا عطیہ خوبصورت ہے؟"

سعید حسن نے جواب دیا "اب تو وہ اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے ۔ وہ ہماری باتیں سن رہی ہے اور نہایت سمجھدار اور عقلمند ہے"

آواز نے کہا "میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو پسند ہے لیکن اب مجھے آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے، میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کہہ سکتی"۔

"تو کہہ ڈالئے نا"۔

"جب کبھی رات کے وقت میری طبیعت چاہے کیا میں آپ سے باتیں کر لیا کروں؟"

سعید حسن نے کہا "بڑی خوشی سے"۔

"میں زیادہ مدت تک آپ کی سمع خراشی نہیں کروں گی، اب غالباً بہت تھوڑا زمانہ باقی ہے، پھر میں چلی جاؤں گی"۔

آواز میں غمگینی کی جھلک تھی ۔

اس نے پوچھا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا "مجھے خود علم نہیں"۔

سعید حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ خوش تھا کہ کسی نے دیکھا نہیں ۔

"مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن بعض وقت انسان کا دل کسی سے بات کرنے کو خواہ مخواہ چاہتا ہے ۔ اے مہربان آواز کیا آپ اکیلی ہیں"۔

مہربان آواز نے غمزدہ لہجہ میں جواب دیا "بے شک، سوا آپ کے میں بالکل تنہا ہوں ۔ ورنہ آپ سے باتیں کس طرح کر سکتی ۔ آپ براہ عنایت کسی سے نہ کہیں کہ میں آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں ۔ یہ ہمارا باہمی راز ہے"۔

سعید حسن نے کہا "میں کسی سے نہ کہوں گا ۔ تاہم آپ کو مجھ سے باتیں کرنے کی کیوں خواہش ہے؟ کیا ہم نے ایک دوسرے کو کہیں دیکھا ہے؟"

اس کے کان میں ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی "کیا معلوم! شاید صدیاں گزریں بیوباسٹس کے مندر میں دیکھا ہوگا، لیکن کیا میرا آپ سے باتیں کرنے کا خیال عجیب نہیں ہے ۔ کسی وقت بعض لوگ تنہائی سے اس قدر گھبرا جاتے ہیں کہ اگر یہ آواز گفتگو ان کی مدد کرے تو کوئی عیب کی بات نہیں ۔ کیا آپ نے اس لڑکی کی کہانی سنی ہے جس نے تنہائی سے عاجز ہو کر ایک شخص کو

جسے وہ چاہتی تھی کئی محبت نامے لکھے لیکن اسے یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ وہ کون ہے جب تک کہ اس جہان سے سفر نہ کر گئی۔"

"میں نے نہیں کہا۔" سعید حسن نے کہا۔ "لیکن کیا آپ تنہائی سے عاجز ہیں ؟"

"بے شک"

"تو آپ کو میرا ہی خیال کیوں آیا؟"

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی، اگر آپ خود نہیں سمجھ سکتے۔"

اس کے بعد ٹیلیفون کا تعلق علیحدہ کر لیا گیا اور سعید حسن گویا کسی نہایت دل خوش کن خواب کے درمیان بیدار ہو گیا۔

رات کے نو بجے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ سعید حسن کا تمام دن ایک عجیب قسم کی بے قراری میں گزرا تھا، شام کا کھانا کھا کر وہ نشست کے کمرے میں ٹیلیفون کے پاس ایک ناول ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا تھا، اور اگرچہ اس واقعہ کو ایک گھنٹہ سے زاید عرصہ گزر چکا تھا، کتاب کا وہی صفحہ اس کے پیش نظر تھا، وہ اسے بار بار شروع سے اخیر تک پڑھ جاتا تھا، لیکن چونکہ اس کے دماغ میں ناول کے واقعات کے ساتھ تلیاں اور ٹیلیفون کی گھنٹیاں اور نرم و نازک نمکین سی آواز کے ساتھ کسی خیالی حسینہ کی سیکڑوں مختلف تصاویر پھر رہی تھیں، ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

وہ گھنٹی کی آواز سے چونکا، اور ٹیلیفون کی طرف جھپٹا۔ آلہ کو کان سے لگانے پر اسی میٹھی میٹھی آواز نے یہ سوال کیا۔

"کیا آپ خود ہی ہیں ؟"

"بیشک میں ہی ہوں"

"آپ کیا کر رہے تھے ؟"

"انتظار"

"کس کا ؟"

"آپ جانتی ہیں کس کا"

"خوب! آپ کیا جانیں کہ میں کون ہوں، آپ کے پڑوس کے مکان میں ہوں یا دو میل کے فاصلہ پر، خوبصورت ہوں یا بدصورت، تار گھر کی ملازمہ ہوں یا کسی شاندار محل میں رہنے والی مالدار دوشیزہ۔ کسی کے گھر کی نو عمر خادمہ ہوں یا کوئی ستر سالہ کنواری خاتون، غرض یہ کہ آپ کو کیونکر علم ہے کہ میں کون ہوں ؟"

سعید حسن نے کہا "آپ جو کچھ ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بہت عجیب ہیں۔"

آواز نے جواب دیا "ہاں میں بے حد عجیب ہوں اور بہت حسین بھی، میں آپ کا دل چرا لوں گی اور ہر روز رات کے وقت آپ سے گفتگو کیا کروں گی۔"

سعید نے پوچھا "آپ کون ہیں، خدا کے لئے بتائیے کیا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ؟"

"ممکن بھی ہے اور غیر ممکن بھی۔ میں نے تو آپ کو ضرور دیکھا ہے، مگر آپ نے ایک ایسی ہستی کو کئی بار دیکھا ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے،..... لیکن پھر بھی آپ کی نسبت کم۔"

"تو..... کیا آپ مجھے چاہتی ہیں ؟"

"بے شک، ورنہ میں آپ سے ہمکلام کیوں ہوتی۔ میں ضرور آپ کو چاہتی ہوں اور کئی مہینے سے۔ اس وقت سے بھی پہلے جب کسی نے آپ کو وہ ایرانی تحفہ بھیجا تھا، کیا آپ کو یہ سکر خوشی ہوئی ہے یا افسوس ؟"

"میں..... میں کہہ نہیں سکتا۔" سعید حسن نے کہا۔

"بڑا عجیب معاملہ ہے"۔

"اسی لئے تو مجھے اس میں لطف آتا ہے۔" آواز نے کہا۔

(سعید حسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ دونوں اندھیرے میں کسی خفیہ جگہ بیٹھے ہیں اور وہ اس سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی ہے) "کیونکہ ہم عورتوں کو کبھی موقع نہیں ملتا کہ بغیر بے حیا کہلائے کسی سے پہلے اپنی محبت کا اظہار کریں باوجودیکہ بعض اوقات ہمارے دل محبت سے بھرے ہوتے ہیں، آپ کو

میری باتوں میں بڑھاپے کی سی عقلمندی اور تجربہ کار کی سی بے شرمی محسوس نہیں ہوتی ؟"

سعید حسن کے دل میں ایک فوری خوف سا پیدا ہوا۔

"اگر آپ ایسی باتیں کرتی رہیں تو غالباً آپ کی طرف سے مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا پڑے گا۔"

"کیوں ؟"

"کیونکہ آپ ——"

"—— اتنی سمجھدار ہیں ؟"

"بے شک" سعید حسن کو ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی اس نے پوچھا :-

"آپ ہنستی کیوں ہیں ؟"

"کیونکہ اب آپ پہلے کی نسبت زیادہ عقلمند معلوم ہونے لگے ہیں۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ آج تک آپ نے کبھی کسی لڑکی کو چاہت کی نگاہ سے دیکھا ہے ؟"

"نہیں، عملی طور سے نہیں، تصور میں ضرور کبھی کبھی۔"

"اچھا تو پھر آپ مجھے چاہئے نا، میرے لئے یہ ایک بڑی بات ہوگی اور میں اس آدھ گفتگو پر پھولوں کے ہار چڑھایا کروں گی۔ غالباً میں دنیا میں پہلی لڑکی ہوں جس نے اس طرح باتیں کی ہیں۔ اچھا تو اب آپ کہدیں نا کہ آپ مجھے چاہتے ہیں۔"

سعید حسن نے کہا "آپ واقعی عجیب و غریب ہیں۔ لیکن میں کس طرح کہہ سکتا ہوں۔"

"آپ کو مجھ سے نفرت تو نہیں ؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ کا نام کیا ہے ؟"

"جو آپ رکھ دیں۔"

"جو میں رکھ لوں ؟ تو گویا یہ بھی آپ نہیں بتائیں گی ؟"

"آج کل ہر قسم کے اُلٹے سیدھے بے معنی اور بے معنی نام رکھنے کا دستور ہے۔ آپ بھی کوئی گز بھر لمبا نام تجویز کر لیں —— امۃ الم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بابت آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"نہیں نہیں"

"تو بیچاری' ہی کافی ہوگا۔ یہ بھی حسب حال" لہجہ تبدیل ہو گیا تھا اب اس میں معصومیت کا اثر تھا۔

"نہیں میں آپ کو "نادیدہ خانم" کہا کروں گا۔ لیکن ایک بات میں ضرور پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ علیل ہیں ؟"

"ہاں لوگ کہتے تو یہی ہیں۔ لیکن ... کسی دن مجھے صحت ہو جاوے گی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اس کی آواز میں حد درجے کا اندوہ بھرا ہوا تھا اور سعید حسن اسے محسوس کر رہا تھا، آواز پھر آئی "کوئی آرہا ہے آپ کو بھی نیند آرہی ہوگی، اس لئے کل رات تک —— خدا حافظ۔"

سعید حسن کو امید تھی کہ اسے خواب میں دیکھے گا لیکن یہ امید بر نہ آئی۔ شاید اس کے خواب، دن اور عالم بیداری کے لئے مخصوص تھے، وہ ہر وقت سوچتا تھا اور حیران تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے ؟ اس کی عمر کیا ہے، صورت کیسی ہے ؟ اسے خیال آیا کہ اب کی دفعہ اس سے پوچھے گا کہ اس کی بلی کس قسم کی تھی، اور اس روز راستے میں جتنی بلیاں ملیں انھیں بڑے غور سے دیکھتا رہا لیکن جب رات آئی اور سلسلۂ کلام شروع ہوا تو مایوسی ہوئی کیونکہ جب عطیہ کا ذکر چھڑنے پر اس نے سوال کیا کہ آپ کی بلی کس قسم کی ہے تو جواب ملا کہ اس کی چار ٹانگیں ہیں، دو زرد آنکھیں ہیں، ایک دُم ہے، بدن پر بال ہیں اور پیار کرنے پر خُر خُر کرتی ہے" اس کے بعد قہقہہ کی آواز آئی۔

"اس کا مطلب تو فقط یہی ہے کہ وہ بلی ہے اور بس" ؟

"ہاں، اور کیا۔ اچھا جب آپ کی شادی ہو جائے تو جب آپ اُداس ہوں اور آپ کی بیوی آپ کی اُداسی دور کرنے میں ناکامیاب رہیں تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ میری خاک کے ذرے ستاروں کی طرح چمکنے لگیں گے۔"

"آپ [illegible] آپ کی [illegible] کیوں ؟ کیا آپ بے حد علیل ہیں ؟"

"ہاں، سب لوگ اب یہی کہتے ہیں، گو زبان سے نہیں بلکہ حسرت بھری نگاہوں سے۔"

"تو کیا آپ قریب الموت ہیں؟"

"آپ کیسے ذکی الحس ہو گئے؟ ہاں، بیشک میرا آئینہ یہی کہتا ہے"

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں، ایک بار، صرف ایک بار!"

"اس کا وقت گزر چکا ہے، ——— میں چاہتی ہوں کہ آپ اسی صورت کو یاد رکھیں جو آپ کے دل میں ہے کیونکہ اگر اب کبھی میں حسین ہو سکتی ہوں تو صرف اس دل میں جس میں میری محبت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔"

"میں واقعی آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ کیا آپ کی زندگی کی کوئی امید نہیں ہے؟"

"نہیں، لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس آخری وقت میں جب میں قریباً خاک ہو چکی ہوں میں آپ سے گفتگو کر سکی، کیونکہ میری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کوئی دل میرے لئے بے قرار ہو، اور کوئی چہرہ ایسا بھی ہو جس پر میرا خیال آنے سے سرخی آجائے۔"

سعید حسن نے کہا "میں اب محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

اس شب اور کوئی گفتگو نہ ہوئی پھر بھی سعید حسن جانتا تھا کہ وہ اس آواز کو دل دے چکا ہے، تمام دن جہاں کہیں بھی ہوتا وہ آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ اس کے احباب اس کی حالت دیکھ کر حیران تھے لیکن ایک دوست جو غالباً سب سے زیادہ سمجھدار تھا کہا کرتا کہ "سعید عبادت کرنے لگ گیا ہے"، اور وہ سچ کہتا تھا کیونکہ عبادت محبت نہیں تو محبت عبادت ضرور ہے۔

یہ برقی ملاقات کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور لڑکی کے زرد چہرہ پر رونق آنے لگی، اس کے تیمار دار دل کو خیال ہوا کہ شاید وہ روبہ صحت ہے، لیکن وہ خود مایوس تھی۔ وہ اپنی قسمت و جرات کی شکر گزار تھی جس نے محبت کے حصول کو ممکن بنا دیا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا گویا وہ صرف اسی کے لئے دنیا میں آئی تھی، وہ خوش تھی کہ جب وہ نہ ہوگی تو کسی کے دل میں اس کی یاد باقی ہوگی، کیونکہ کسی شے کی یادگار باقی رہنا گویا اس کا غیر فانی ہو جانا ہے۔

ایک روز ڈاک میں سعید حسن کو ایک پارسل ملا جس میں ایک چھوٹی سی رنگین تصویر تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چنگاریاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں، سیاہ بال تھے اور صورت نہایت دلفریب تھی، اسے فوراً اپنی ٹیلیفون والی ساحرہ کا خیال آیا اور اس کے منہ سے نکلا یہ "وہی ہے"۔ لیکن تصویر اگر اسی کی تھی تو کچھ عرصہ پہلے کی تھی ——— کیونکہ اس میں علالت کا کوئی نشان چہرہ پر نہ تھا، رنگت صاف، سرخ و سپید تھی اور چھوٹے چھوٹے ہونٹوں میں جن پر ہلکی سی شوخی بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی ایک خاص قسم کی شیرینی آمیز مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔

اس نے وہ تصویر کسی کو نہ دکھائی۔ بازار سے ایک طلائی لاکٹ خرید کر اسے چھاتی پر اپنے دل کے قریب آویزاں کر لیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

آخرکار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور سعید حسن نے پوچھا:-

"کیا تم ہی ہو؟"

"ہاں میں ہی ہوں۔"

"آپ نے جو چیز بھیجی تھی مجھے مل گئی۔"

"کیا چیز؟"

"وہی ننھی سی دلفریب تصویر"

"کسی اور لڑکی نے جسے آپ سے محبت ہے آپ کو اپنی تصویر بھیج دی ہوگی، میری نہیں۔"

"آپ کی تصویر ہے، میں جانتا ہوں۔"

"یہ سچ ہے کہ مجھے آپ سے اُلفت ہے، لیکن میں صرف آواز ہوں اور آواز بغیر شخصیت کے ایک خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ کیا وہ لڑکی جس نے اپنی تصویر آپ کو بھیجی ہے، حسین ہے؟"

"بے حد"

"تو مجھے اس سے نفرت ہے، شاید کسی گزشتہ زمانے میں میں بھی ویسی تھی، لیکن اب آپ اسے ایک طرف رکھ دیں اور میری بات سنیں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"آج ایک اور ڈاکٹر میرے معالج کے ساتھ آیا تھا....."

"اس نے کیا کہا۔ کچھ امید دلائی؟"

"بہت کم۔ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اس کی بھویں ملتی رہیں، میں جانتی تھی وہ سوچ رہا ہے، یک لخت اس نے کوئی ایسی بات کہی کہ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر وہ چپ ہو کر سوچنے لگ گیا اور اس کے بعد مجھ سے کہنے لگا کہ تم بہت حوصلہ مند ہو۔ اس کی شکل نپولین کی تصویر سے ملتی تھی۔"

"اس نے کچھ کہا بھی؟"

"اس نے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں۔ ایک یہودی لڑکے کی کہانی سنائی جو بہت علیل اور بمشکل چھ سال کا تھا، اس کے باپ نے اس سے کہا کہ اگر تم جلدی تندرست ہونے کی کوشش کرو گے تو میں تمھیں بہت سے روپے انعام دوں گا۔ لڑکے نے آنکھیں کھولے بغیر فوراً سوال کیا "کتنے؟" مجھے فقط یہی بات یاد رہ گئی ہے، کیونکہ اس کے بعد نپولین کہنے لگا کہ اب ہمیں باتیں چھوڑ کر کچھ کرنے کا خیال ہونا چاہیئے۔"

"کیا؟ خدا کے لئے بتاؤ کیا؟"

"وہ کہتا تھا کہ مجھے بیمار ہونے کی سزا ملنی چاہیئے، بیمار ہونا اور تندرست ہونے کی کوشش نہ کرنا بہت بری بات ہے اور اس کی پاداش میں وہ مجھے..... اور، تو میں کچھ نہیں جانتی فقط اتنا میری سمجھ میں آیا کہ اس میں کلوروفارم اور نشتروں اور اوزاروں کا ذکر تھا اس کے بعد ڈاکٹر نے اپنی ٹھوڑی کو ٹٹولا، اور کہنے لگا کہ تم تندرست ہو جاؤ گی۔"

"اللہ کا شکر ہے، اس ڈاکٹر کا نام کیا ہے؟"

"نپولین، میں اسے یہی کہہ کر بلاتی ہوں اور آپ کی تسلی کے لئے بھی اتنا ہی نام کافی ہونا چاہیئے ورنہ مجھے خوف ہے کہ آپ اپنی قسم توڑنے کی فکر شروع کر دیں گے۔"

"خیر کوئی بھی ہو، ایک بار آپ تندرست ہو لیں، مجھے ایک ایک کر کے ان تمام باتوں کی آپ کو سزا دینا ہو گی۔"

"تو آپ کو میری صحت کا یقین بھی ہو گیا کیا؟ اتنے خوش نہ ہو جائیے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور ڈاکٹر سے بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ یہ اس کی آخری کوشش ہے۔"

"نہیں نہیں آپ [illegible] یہ کب ہو گا؟"

"کل صبح دس بجے۔ اب میری نرس آ رہی ہے [illegible] مجھے کیا آپ مکان ہی پر ہوں گے؟ اس وقت میں خدا حافظ کہوں گی۔"

"ضرور، میں آپ کی آواز کا انتظار کروں گا۔"

سعید حسن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے آواز افسردہ تھی۔

صبح آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی آواز آئی "خدا حافظ"

سعید حسن نے کہا "تم بڑی ظالم ہو۔"

"میں ظالم؟ کیونکر؟"

"میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا، کچھ کر نہیں سکتا، خدا کے لئے مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں آپ کے والدین سے اجازت لے لوں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہ کریں گے۔"

"واہ کیا کہنے! آپ اتنی محنت سے بنائے ہوئے طلسم کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اگر مجھے صحت ہو گئی تو انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ اور اگر نہیں تو مجھے آپ اس لڑکی کی شکل میں یاد رکھیں جس کی تصویر آپ کے پاس ہے اور جو آپ کو دل سے چاہتی ہے، جب اور سب لوگ مجھے بھول جائیں گے تو آپ کے دل میں میری یاد باقی ہو گی۔ میرے لئے فقط اتنا ہی کافی ہے۔"

"آپ کی یاد اب فراموش نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے علم کس طرح ہو گا؟ اب غالباً کئی دن تک مجھ سے گفتگو نہ کر سکیں گی۔"

لڑکی نے آہ بھر کر جواب دیا "ہاں کئی دن تک، لیکن میں نے دو خط لکھ کر ایک جگہ رکھ دئے ہیں جن میں سے ایک آپ کے نام ہے، اگر میں شہر خموشاں کو سفر کر گئی، تو وہ آپ کو مل جائے گا، میں بالکل خوش ہوں اور موت کے نام سے مجھے بالکل خوف نہیں آتا... کیونکہ آپ مجھے چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو ہمیشہ چاہوں گا۔"

"اچھا تو اب آپ اس تصویر سے جو آپ کے پاس ہے باتیں کریں اور میرے لئے دعا۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ،" سعید حسن کا گلا گھٹا جا رہا تھا اور آواز بمشکل نکلتی تھی۔

اس روز دفتر سے واپس آتے وقت وہ راستے سے ایک مکان

کی طرح بجھ رہا تھا۔ کہ کہیں کسی کے جنازے کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔ لیکن اسے کوئی ایسا مکان نظر نہ آیا اور اس بات سے اس کے دل کو قدرے راحت محسوس ہوئی گو رات میں وہ وحشت انگیز خواب ہی دیکھتا رہا اور بار بار اس خیال سے چونک پڑا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن جب بیدار ہوتا تو سناٹا نظر آتا۔

دوسرے دن وہ راستہ میں سہراب کو پیار کر رہا تھا کہ یکلخت اسے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی "نادیدہ خانم" کی تھی کیونکہ اس کے بالوں میں سے ہسپتال کی سی بو آ رہی تھی۔ غالباً وہ اپنی مالک کے کمرے میں بیٹھی رہی تھی اور وہاں سے اس کے بالوں میں ان دواؤں کی بو بس گئی تھی جو اس کمرے میں استعمال ہو رہی تھیں۔

سعید کی نظر مکان کی کھڑکیوں کی طرف اٹھ گئی اور گو اور کوئی ثبوت سوا بو کے موجود نہ تھا تاہم اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی جگہ رہتی ہے۔ یہ مکان اس کے مکان سے نزدیک ہی تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس میں ایک معزز اور شریف سرکاری عہدہ دار کا قیام تھا جس کے اس کے والد سے کافی مراسم تھے وہ اسی کی لڑکی ہوگی۔۔۔ اور چونکہ قومیت وغیرہ میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غالباً رشتہ ہو جانے میں کوئی مشکل نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔ یا خدا!

اے میرے پروردگار! اس کو صحت عطا کر دے!

اگلے روز صبح کو جب وہ دفتر جا رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک موٹر اس کی معشوقہ کے مکان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور اس میں سے ایک انگریزی وضع قطع کا شخص بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے اترا، اس کے چہرہ پر نظر پڑتا تھی کہ سعید حسن کو نپولین والی تشبیہ یاد آگئی، کیونکہ اس ڈاکٹر کے خط و خال نپولین سے مشابہ تھے۔

وہ ٹھہر گیا اور سڑک پر ٹہل کر ڈاکٹر کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کھڑکیوں کی طرف نظر اٹھانے پر اس نے دیکھا کہ بالائی منزل کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سہراب بیٹھا ہوا دھوپ کے مزے لے رہا ہے۔ اسے خیال آیا "یہ اس کا کمرہ ہے" ہر منٹ ایک گھنٹہ کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آخرکار ڈاکٹر مکان سے نکلا اور سعید حسن نے آگے بڑھ کر مکان کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ کے خیال میں صحت ہو جائے گی؟"

"امید تو ہے، انشاءاللہ"

سعید حسن نے بشکل شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اس کے منہ سے بات دشواری سے نکلتی تھی اور دفتر کو چلا گیا۔ دوسرے اور تیسرے دن انتظار میں رہا۔ لیکن ڈاکٹر سے نہ مل سکا، اگلے روز اتنا بیتاب تھا کہ دفتر بھی نہ گیا، اور تمام دن اپنے صحن میں ٹہل کر گزار دیا لیکن خیالات کی محویت کی وجہ سے ڈاکٹر آیا بھی اور چلا بھی گیا اور اسے خبر نہ ہوئی اس کا کئی بار اپنے احاطہ سے نکل کر دوسرے مکان کی طرف دیکھنا بیکار ثابت ہوا۔

اس نے رات کا کھانا نہ کھایا اور لیٹ گیا۔ مدت کے بعد نیند آئی تو خواب میں دیکھا کہ ایک روح سفید لباس پہنے ہوئے اس سے کہہ رہی ہے کہ:۔ "میں مر گئی ہوں اور اب ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں" وہ گھبرا کر اٹھا۔ اس کے دماغ پر سیکڑوں من کا بوجھ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سو گیا۔ پھر جاگا اور پھر سو گیا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے تر تھا اور اس یقین سے کہ جس بات کا اسے خوف تھا وہ سامنے آگئی، اس کے ہیجان میں قدرے تسکین کی صورت پیدا ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن دفعتاً وہ چونک اٹھا اور سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

کیونکہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی اور جب وہ گھبرا کر اٹھا اور فون لیا تو صرف ایک طویل قہقہہ سنا اور اس کے بعد کامل خاموشی!

باب الاستفسار

(۱)

رسول اللہ کے معجزے

(سید رحمت اللہ صاحب - کراچی)

سیرت کی کتابوں میں رسول اللہ کے معجزوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے اور عام طور پر جو معجزے آپ سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سب سے بڑا معجزہ شق القمر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد معجزے آپ کے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کی کنکریوں کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا، استنِ حنانہ کا آپ کے فراق میں آنسو بہانا، آپ کے جسم کا سایہ نہ ہونا، آپ کی پشت پر مہر نبوت کا پایا جانا وغیرہ وغیرہ۔ سو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے ان معجزوں کے بارہ میں کیا ہے۔ نیز یہ کہ رسول نے کوئی معجزہ پیش کیا بھی تھا یا نہیں، اگر کیا تھا تو وہ کون سا معجزہ تھا۔

(نگار) آپ نے رسول اللہ کے جن معجزوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے میں کسی کا قایل نہیں۔ آیئے سب سے پہلے اس امر پر غور کریں کہ معجزہ کسے کہتے ہیں اور ضرورت و نتیجہ کے لحاظ سے اسے کیا اہمیت حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں، لمبی چوڑی بحث کرنا غیر ضروری ہے جو فقہ و کلام کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ علماء کے نزدیک معجزہ کا مفہوم ہے کسی نبی کی طرف سے ایسے امر کا ظہور جس کے کرنے پر دوسرا قادر نہ ہو۔ اور اگر کسی غیر نبی کی طرف سے کوئی محیر العقول امر ظاہر ہوگا تو اسے معجزہ نہ کہیں گے بلکہ اسے نظر بندی یا شعبدہ کے نام سے موسوم کریں گے، اسی لئے مذہبی کتب میں نبی اور معجزہ کا جو ملا جلا مفہوم پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "نبی وہ ہے جو کوئی معجزہ پیش کرے اور معجزہ وہ ہے جو نبی کی طرف سے پیش کیا جائے"۔ دلیل و بیان کی سطحیت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح معجزہ و نبوت دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہو جاتے ہیں اور حقیقت ان میں سے کسی کی واضح نہیں ہوتی۔

"شرح مواقف" میں علامہ سید شریف نے معجزہ کا اصطلاحی نام یہ ظاہر کیا ہے:-

"المعجزۃ عندنا ما یقصد بہ تصدیق مدعی الرسالۃ وان لم یکن خارقاً للعادۃ"

(یعنی ان کے نزدیک معجزہ وہ ہے جس سے کسی مدعی رسالت کی تصدیق مقصود ہو خواہ وہ عادتاً محال نہ ہو)

شاہ ولی اللہ بھی اپنی مشہور کتاب "تفہیمات الٰہیہ" میں بھی لکھتے ہیں:-

"انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم تترک الاسباب قط ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکابر علماء کے نزدیک معجزہ کا تعلق محالات عقلی سے نہیں بلکہ ان امور سے ہے جو عام طور پر ظہور میں نہیں آتے لیکن اسباب کے تحت ان کا ظہور ممکن ہے۔

بنا براں معجزہ کا تعلق محالات عادی سے ہے محالات عقلی سے نہیں اور اس صورت میں اس کی تخصیص کسی نبی کے ساتھ

کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب کسی محال عادی کے ظہور کے اسباب پیدا ہو جائیں گے وہ ظاہر ہو جائے گا۔

آپ نے جن معجزات کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق زیادہ تر محالات عقلی سے ہے اس لئے وہ قابل قبول نہیں۔ علاوہ اس کے سوبات کی ایک بات یہ ہے کہ خود رسول اللہ نے بھی کبھی معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا۔

کفار کہتے ہیں کہ "ہم آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے چشمے نہ جاری کر دے، یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تو اس میں بہتی ہوئی نہریں نہ دکھائے، یا یہ کہ آسمان کے ٹکڑے نہ کر ڈالے وغیرہ وغیرہ۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیات ۹۲-۹۵) اور رسول اللہ اس کے جواب میں کوئی معجزہ پیش کرتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں :- "ہل کنت الا بشرا رسولا" میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور معجزہ دکھانا میرا کام نہیں۔ "الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین" یعنی ایسی نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں، میں تو صرف تم کو تمہارے برے انجام سے ڈرانے آیا ہوں"۔

آپ نے جن بعض مشہور معجزوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے بڑا معجزہ شق القمر کا ہے کیونکہ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے (وانشقت القمر)، لیکن میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا، کیونکہ اول تو یہ بڑا پامال سا مبحث ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خاصی طویل گفتگو چاہتا ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ معجزۂ شق القمر کی کوئی اصلیت نہیں ہے اور قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ "انشقت القمر" والی آیت کا تعلق اس معجزہ سے بالکل نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں آئندہ کے انقلاب کی خبر دی گئی ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بھی یہی رائے ہے :- "اما شق القمر فعندنا لیس من المعجزات"۔

آپ نے جن دوسرے معجزوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ معجزہ ہے جس کا تعلق جسم نبوی کے سایہ سے ہے مجھے حیرت ہے کہ لوگ رسول اللہ کی حاجت بول و براز کو تو تسلیم کرتے ہیں جو بہت کثیف بات ہے اور سایۂ جسم سے انکار کرتے ہیں جو بدرجہا لطیف چیز ہے۔ لیکن خیر یہ تو ضمنی باتیں تھیں، اب آئیے ان سے گزر کر سنجیدگی کے ساتھ سب سے پہلے اس حقیقت پر غور کریں کہ معجزہ کی ضرورت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر نبی کی عظمت اور اس کے رسول خدا ہونے کا اعتراف کریں اور اس کے کہنے پر چلیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقصد معجزوں سے پورا ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معجزوں سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ کونسا نبی یا رسول ایسا تھا جس کی طرف سے معجزہ دکھانے کا ذکر کتب مقدسہ میں نہ پایا جاتا ہو اور وہ کونسی قوم ایسی تھی جو صرف معجزوں کو دیکھ کر ایمان لے آئی ہو۔ انبیاء برابر معجزے دکھاتے رہے اور لوگ بدستور ان کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن ہم اپنے رسول کے بابت تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے معجزہ دکھانے کا کبھی کوئی دعویٰ کیا ہو، بلکہ انھوں نے تو اس مطالبہ پر صاف صاف کہدیا کہ میں تو صرف تمہارا ہی جیسا ایک انسان ہوں اور معجزہ دکھانے سے انکار کر دیا۔

علاوہ اس کے یوں بھی غور کرنے بات ہے کہ اگر رسول اللہ کا جسم بے سایہ ہوتا تو یہ ایسی بات نہ تھی کہ کفار مکہ اس سے بے خبر رہتے۔ ہر شخص بہ آسانی ہر وقت دیکھ سکتا تھا کہ جب آپ دھوپ میں باہر نکلتے ہیں تو آپ کے جسم کا سایہ نہیں پڑتا اور وہ اس عجیب و غریب بات کو دیکھ کر وہ فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ بہرحال یہ اور اسی قسم کی روایات قطعاً بے بنیاد ہیں اور کسی طرح قابل اعتناء نہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات قابل غور یہ ہے کہ انبیاء و رسل کے بھیجے جانے کا مقصد کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگ اچھے اخلاق اختیار کریں اور نظام تمدن میں عضو مفید بن کر رہیں۔ سو اس مقصد کی تکمیل معجزوں کی نمائش نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے صرف عملی اخلاق کے پیش نظر کرنے کی ضرورت ہے اور اگر کوئی نبی اس تعلیم اخلاق کے سلسلہ میں کوئی ایسی غیر معمولی مثال علوئے نفس و پاکیزگی کردار کی پیش کر سکے جس کی عامۃ الناس سے توقع نہیں کی جا سکتی، تو ہم - - - -

اس کو تم معجزہ کہیں گے اور ہمارے رسول کی ساری زندگی انھیں اخلاقی معجزوں کا مظہر تھی۔

---

(۲)

تیسری عالمی جنگ اور جمہوریت و اشتراکیت کا مستقبل

(علی عباس صاحب ۔ فیروز پور)

میں بہت صاف اور کھلے ہوئے لفظوں میں جاننا چاہتا ہوں کہ دنیا کی تیسری عالمی جنگ کے بارہ میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے ۔ وہ شروع ہوگی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کب تک ۔ نیز یہ کہ اس جنگ میں جمہوریت و اشتراکیت کا موقف کیا ہوگا اور کامیابی کس کو حاصل ہوگی، نیز یہ کہ ان کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے اور یہ کہ بہترین نظام حکومت آپ کے نزدیک کیا ہے ۔

(نگار) غیب کی خبریں بتانے کا زمانہ اگر کبھی آیا تھا تو وہ ختم ہوچکا ۔ اب تو صرف موجودہ حالات و اسباب کو سامنے رکھ کر آیندہ پر کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے لیکن یقین کے ساتھ نہیں، کیونکہ موجودہ حالات نہایت تیزی سے بدلتے جارہے ہیں اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا ۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے اور ہر گھڑی رخ بدلتا جارہا ہے، اس لئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ موجودہ نظام تمدن و حکومت اسی حال پر قایم رہے گا یا وہ کوئی دوسری صورت اختیار کرے گا ۔

پھر ہو سکتا ہے کہ آپ یا کوئی اور اسے زمانۂ امن سے تعبیر کرے ۔ لیکن میری رائے میں دنیا اس وقت حد درجہ خطرناک دور سے گزر رہی ہے، جسے عام طور پر جنگ و نا جنگی کے درمیان کا برزخی عہد سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہوچکی ہے اور اس کا آغاز دوسری جنگ کے بعد ہی ہوگیا تھا ۔

بعض اہل فکر و سیاست اس کو ٹھنڈی لڑائی کہتے ہیں اور آیندہ گرم لڑائی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں ۔ لیکن میری رائے میں موجودہ کشمکش برابر اسی طرح قایم رہے گی اور گرم لڑائی کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس کا فیصلہ ہوجاتا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ تیغ و تفنگ کے استعمال کا زمانہ گزر گیا .... تاہم موجودہ جنگ سرد جنگ نہیں بلکہ سخت گرم جنگ ہے، ذہن و اعصاب کی اور بالکل ویسی ہی ہے جیسے دو پہلوان صرف اپنے اعصاب و عضلات کی قوت یا داؤ پیچ کی مدد سے ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کریں — اور یہ جنگ عرصہ ہوا شروع ہوچکی ہے ۔ اور اب تک جاری ہے کہنے کی ضرورت نہیں، ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ یہ جنگ قوموں، ملکوں اور سلطنتوں کی جنگ نہیں بلکہ تصورات کی جنگ ہے اور انھیں تصورات و عقاید کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کی کوشش میں اشتراکیت و جمہوریت دونوں اپنی اپنی جگہ مصروف و منہمک ہیں ۔ اب رہا یہ امر کہ اس کشاکش کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ صرف اشتراکیت کی جارحانہ ... اور جمہوریت کی مدافعانہ تدابیر ہی کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے، سو آئیے اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں، ممکن ہے کوئی بات سمجھ میں آجائے ۔

میں نے اشتراکیت کو جارحانہ حیثیت دی ہے اور جمہوریت کو مدافعانہ، کیونکہ ان دونوں کا موقف در اصل یہی ہے ۔ دنیائے اسباب و علل میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہمیشہ ٹھوس واقعات یا حقایق ظاہرہ ہی کو سامنے رکھنا پڑتا ہے

روس اسلحہ کی لڑائی کا قایل نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے ذہنی سطح نظر تک نہیں پہونچ سکتا ہے، وہ قایل ہے ڈپلومیسی، سائنس، صحافت، مالیات، اقتصادیات، اور پروپاگنڈا کی جنگ کا، یہاں تک کہ وہ مغرب کی دولت، مغرب کی عسکریت اور مغرب کی استعماریت کو بھی فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق ایک نفسیاتی اُلجھن ثابت کر کے انسانیت کو اس سے متنفر کرنا چاہتا ہے یا اس کو دور کرنے کا درس دیتا ہے۔

روس کے اصول جنگ بالکل مختلف ہیں اور وہ جمہوری تحریکات کو بھی اپنے ڈھب پر لا کر فایدہ اُٹھا لیتا ہے، چنانچہ مجلس اقوام کے وجود سے بھی وہ وہی فایدہ اُٹھا رہا ہے جو اسلحہ جنگ سے اُٹھا سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کی پالیسی بڑی عجیب و غریب ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں جب لینن نے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ کر جرمنی سے علحدہ صلح کر لی تو گویا روس ۳۴ فی صدی آبادی اس نے جرمنی کو حوالہ کر دی۔ لیکن یہ اس کی بڑی دور رس پالیسی تھی جس سے اس نے دوسری جنگ میں فایدہ اُٹھایا اور جو کچھ جرمنی کو دیا تھا اس سے کہیں زیادہ حاصل کر لیا۔ یعنی اسٹالین نے مشرقی و وسطی مغرب کی ان حکومتوں سے جو نازی اثرات میں تھیں علحدہ کوئی صلح نہیں کی، بلکہ اپنے مغربی اقدام میں ڈھیل ڈال کر ان حکومتوں میں خلا پیدا کر دیا اور بعد کو کمیونسٹ حکومت نے اپنے وجود سے اس خلا کو پر کر دیا۔ اس سے زیادہ عجیب و غریب مثال روس کی ہوشیاری کی ملاحظہ ہو:-

جب ۱۹۴۴ء میں روسی فوجیں حدود وارسا تک پہونچ گئیں تو انھوں نے ریڈیو کے ذریعہ سے پولینڈ کی محب وطن فوجوں کو جو چھپی ہوئی تھیں باہر نکل کر نازیوں کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ پولینڈ کی فوجیں یہ سمجھ کر کہ روسی فوجیں بھی ان کی مدد کریں گی نازی فوجوں کے مقابلہ میں آ گئیں، لیکن روسی افواج نے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب پولینڈ کے ۴۰ ہزار سپاہی کام آ گئے تو اس نے بڑھ کر نازیوں کو نکال باہر کیا (کیونکہ ان کی قوت اب بہت گھٹ گئی تھی) اور وارسا میں لوبلن کی کمیونسٹ حکومت قایم کر دی۔ اگر اتحادیین روس کی اس چال سے واقف ہو کر اسے کالعدم کر دیتے جو چنداں دشوار نہ تھا تو آج بقول مکس ایسٹ مین دُنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

پھر اس کے بعد ماسکو، تہران، یالٹا، اور پوٹسڈم کی کانفرنسوں کو دیکھئے کہ اسٹالین نے چرچل، روزولٹ اور ٹرومین کو کتنا بیوقوف بنایا اور وہ مطلق نہ سمجھ سکے کہ اس کی آستین میں کیسا تیز دشنہ چھپا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں روس بڑا شاطر کھلاڑی ہے اور اس کی چالوں کا مشکل ہی سے پتہ چلتا ہے، جب مصر ضغطہ میں مبتلا ہوتا ہے اور فرانس و برطانیہ سے اس کی بگڑی اُلجھتی ہے تو روس پہلے اسے اسلحہ کی پیش کش کرتا ہے اور پھر ایک پوری بٹالین ماہرین فن کی وہاں پہونچا دیتا ہے۔ مغربی اقوام بندوق اپنے کندھے پر رکھ کر چلاتی ہیں اور روس دوسروں کے کندھوں پر اور یہی اسکی بڑی کامیابی ہے۔ مغربی اقوام اپنے اقدام کے لئے وجہ جواز ہی ڈھونڈھا کرتی ہے اور روس کو ناخواندہ مہمان بننے میں بھی کوئی عار نہیں۔

روس نے اس زمانہ میں اپنی فوجی طیاری اور نئے نئے آتشبار اسلحہ کا بڑا پروپاگنڈا کیا ہے جو بڑی حد تک درست بھی ہے، لیکن یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعی جنگ پر آمادہ ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ مغربی ممالک اپنی کافی دولت طیاری جنگ میں بیکار صرف کرتے رہیں، حالانکہ روس جنگ کا موقع کبھی آنے ہی نہ دے گا اور وہ کیوں آنے دے جبکہ اس کا مقصد جنگ کے بغیر ہی پورا ہو رہا ہے اور مغربی ممالک کی استعماریت اور ان کا سیاسی و اقتصادی اقتدار روز بروز ختم ہوتا جا رہا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت اشتراکیت ساری دنیا پر چھا جائے گی اور اگر کسی قوم نے اشتراکی مذہب اختیار نہ کیا تو بھی اشتراکی اثرات بڑی حد تک قبول کرے گی۔ لیکن میرا خیال اس باب میں کچھ ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ

اشتراکی تحریک کا رُخ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت پایا جاتا ہے۔ اس میں رفتہ رفتہ ذہنی و اصولی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی، جن کے اثرات نمایاں ہو چلے ہیں۔ لینن کا روس، اسٹالین کے روس سے مختلف تھا۔ خرشچوف کا روس، اسٹالین کے روس سے مختلف ہے اور ہو سکتا ہے کہ خرشچوف کا روس کسی اور اوقت کے روس سے مختلف ہو۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ جس تیسری عالمی جنگ کا دھڑکا لگا ہوا ہے، وہ عرصہ ہوا شروع ہو چکی ہے، لیکن یہ جنگ آتشیں اسلحہ کی جنگ نہیں ہے بلکہ بلڈ پریشر (فشار الدم) کا سلسلہ ہے جو آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام عالم کس وقت مفلوج ہو جائے۔

اب رہا سوال میری ذاتی رائے کا اشتراکیت و جمہوریت کے متعلق، سو میری رائے میں دونوں اصلاح طلب ہیں اور دنیا کا بہترین نظام حکومت صرف وہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ ممکن ہے یہ سن کر آپ کو تعجب ہو لیکن حقیقت یہی ہے جو میں نے عرض کی۔

افسوس ہے کہ یہ موضوع بڑی تفصیلی گفتگو کا محتاج ہے اور یہ سلسلۂ استفسار اس بحث کو چھیڑنا مناسب بھی نہیں، لیکن امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں ایک مستقل مقالہ اس موضوع پر پیش کر سکوں گا، تاہم مختصراً اس قدر ظاہر کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ میری رائے میں جمہوری نظام، اشتراکی نظام کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب صرف یہ ہے کہ اشتراکی نظام انسان کی انفرادیت کو مٹا دیتا ہے اور جمہوری نظام انفرادی وجود کے احساس کو معدوم نہیں کرتا، حالانکہ جماعتیں افراد ہی سے مبنی ہیں اور بے حوصلہ و بے امید افراد سے جو جماعت طیار ہو گی وہ بھی بے حوصلہ ہی رہے گی، حالانکہ انسانی ترقی کا راز یہی ہے کہ فرداً فرداً کچھ امنگیں ہر دل میں پائی جائیں، اور انھیں کے پورا کرنے کی سعی و کاوش بنیاد ہے انسانی ترقی کی۔

آپ اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو روس کیوں غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس سے قبل بھی دنیا کی بڑی بڑی مستبد حکومتوں نے ترقی کی تھی جبکہ انسان سے کوڑے مار مار کر غلاموں Galley Slaves کی طرح کام لیا جاتا تھا اور اگر آج روس انسان کو ذہنی و طبعی (بلکہ جسمانی حیثیت سے) بھی غلام رکھنے کے بعد ترقی کر رہا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے۔ اکاسرۂ عجم، جبابرۂ اتراک، عمالقۂ مصر یہاں تک کہ خود زار و قیصر کے عہد کو دیکھئے کیا وہ ان کی ترقی کا زمانہ نہ تھا، لیکن جس طرح ان تمام حکومتوں کا طنطنہ رہنے والی چیز نہ تھا، اسی طرح روس کا یہ دبدبہ بھی ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا ہے، اگر اس نے اپنے نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہ کی اور انسان کی انفرادی آزادی کو بحال نہ کیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ روس کی انفرادی جد و جہد اجتماعی سعی و عمل میں تبدیل ہو گئی ہے، اور وہاں اب جبر و غلامی کا کوئی سوال نہیں، لیکن یہ تکذیب ہو گی فطرت انسانی کی، واقعات و حقایق کی اور خود انسانی نفسیات کی! جب تک آہنی پردہ پڑا ہوا ہے، جو چاہے کہہ لیجئے، لیکن جس وقت یہ ہٹا تو پتہ چلے گا کہ

یاراں دیگرے رامی پرستند

جمہوری نظام حکومت اس لحاظ سے یقیناً قابل تعریف ہے کہ اس نے انسان کے انفرادی میلانات چھین کر اس کو بے امید نہیں بنا دیا ہے اور نہ وہ عوامل فطرت کی ملکیت کا مدعی ہے، لیکن "ملکیت" اور تقسیم دولت کا سوال بلند و وسیع سطح پر وہ اب تک حل نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کی کوئی جمہوریت ایسی نہیں جو اندرونی طور پر سرمایہ دار و شرفاء کی محکوم نہ ہو اور عوام کالانعام نہ ہوں۔

امریکہ کتنی عظیم الشان جمہوریت ہے لیکن اس کا سر رشتہ ہاتھ میں ہے یہودی سرمایہ داروں کے، برطانیہ کتنی قدیم جمہوریت ہے لیکن شاہ پرستی و اشراف پرستی کی بنا پر لندن کی مشرقی و مغربی آبادی میں اب تک زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

پھر سوچئے ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ دولت و حکومت کا تصور ہی ان کے یہاں سرے سے غلط ہے "قوم کی حکومت قوم کے لئے" یہ ہے جمہوریت کا دعوائے بلند بانگ اور بظاہر بہت خوب اور بلند و پاکیزہ معلوم ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ بڑا ناقص نظریہ ہے اس نظریہ کے تحت دنیا کبھی امن و سکون کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد ہی قایم ہے تفریق قومی پر، تفریق اغراض پر، تفریق عوامل پر اور جذبۂ مسابقت پر!

اس لئے جمہوریت محدود قومی نظریہ کے لحاظ سے چاہے کچھ ہو، لیکن وسیع انسانی مفاد اور عالمی رشتۂ انسانیت کے پیش نظر وہ کچھ نہیں۔ پھر یہاں میں دوبارہ اس بات کا اعادہ کروں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ بہترین نظام حکومت وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا اور ہم آیندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ ایک عالمی حکومت کا نظام جس کا خواب ہمارے فلاسفہ عرصہ سے دیکھ رہے ہیں، صرف اسلام ہی کی تعلیم پر استوار ہو سکتا ہے جو تمام ملکی قومی، قبایلی، نسلی و ذہنی اختلافات کو مٹا کر جملہ نوع انسانی کو ایک نگاہ سے دیکھتی ہے اور جس نے جملہ اختلافات مٹا دینے کے لئے حکومت کا وہ تصور قایم کیا جس سے زیادہ بلند تصور ممکن ہی نہیں:-

الحکم للہ و الملک للہ!

---

(۳)

پسِ منظر یا پسِ منظر

(جناب جلیل الرحمان - اعظم گڈھ)

آپ کے نزدیک پسِ منظر لکھنا صحیح ہے یا پسِ منظر۔ امید ہے آپ اپنی رائے کے ساتھ اس کے دلایل بھی پیش کریں گے۔

(نگار) پس فارسی کا لفظ ہے جو تعقیب زمانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کا مفہوم اردو میں پھر، اس کے بعد اور پیچھے سے ادا ہو سکتا ہے جیسے "اول من آمدم پس تو آمدی" (پہلے میں آیا پھر اس کے بعد تو آیا)

اسی طرح اظہار نتیجہ کے لئے بھی پس استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ نتیجہ بھی بعد کی چیز ہے۔ یہ لفظ فارسی میں فک اضافت کے ساتھ زیادہ مستعمل ہے، جیسے پس دیوار۔ پس چمن۔ پس ان میں مضاف ہے اور دیوار و چمن مضاف الیہ، لیکن علامت اضافت (زیر) حذف کر دی گئی ہے، مثلاً:-

بخندد غنچۂ در باغ عاشق تا کہ بنشیند
زتنگی یک تبسم دار پس دیوار باغ او

چو دور در نظر آمد در وصال مرا
دواند عشق بہ پس کوچۂ خیال مرا

اسی طرح آیندہ پرسوں کے لئے پس فردا (فک اضافت کے ساتھ) کہیں گے:-

حسن آخر چرا نہ اندیشی امروز
ازاں فردا کہ پس فردا ندارد

جب اس سے اسم فاعل و اسم مفعول ترکیب دیں گے تو بھی پس کا سین ساکن رہے گا جیسے پس افتادہ۔ پس انداز۔ پس اندیش

(گزشتہ بات کو سوچنے والا) پس رو۔ ظرف زمانی کے ساتھ بھی پس بہ سکونِ سین استعمال ہوگا جیسے پس انگاہ (بہ معنی بعد ازاں) کبھی کبھی
لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حرکت اضافت کے ساتھ اس کا استعمال درست نہیں۔ آپ پسِ دیوار کی جگہ پس دیوار بھی کہہ سکتے
ہیں۔ اب رہا لفظ پس منظر سو یقیناً سکونِ سین کے ساتھ استعمال ہوگا اور پسِ منظر کہنا صحیح نہیں، حالانکہ اس وقت بڑے بڑے شعراء و
ادیب بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پس منظر کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ ہے انگریزی لفظ Background کا جو دراصل تصویر کشی و
نقاشی کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہوتی ہے تصویر کا وہ منظر جو دور نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک نقاش شیر کی تصویر بناتا ہے جو ہم سے قریب ہے اور
اصل چیز ہے لیکن اس کے پیچھے دور وہ جنگل یا پہاڑ بھی دکھاتا ہے اور یہی اس تصویر کا Background ہے جس کا ترجمہ
پس منظر کیا جاتا ہے۔

اس لئے اگر آپ نے اس کو پسِ منظر کہہ دیا تو مفہوم بدل جائے گا کیونکہ محض لفظ منظر کے مفہوم میں تو شیر، جنگل اور سارا سین
شامل ہے اور اس کی پشت پر آپ کو صرف سادہ کاغذ نظر آئے گا۔

علاوہ اس کے انگریزی میں Background صرف تصویر ہی کے لئے مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازاً سبب یا بنیاد کے مفہوم
میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے Psychological Bacground, Aesthetical B - Ethical B. Logical B.
وغیرہ وغیرہ کہ ان الفاظ کے ترجمہ میں نقش یا تصویر کا تصور بھی ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور اگر ان کا ترجمہ
نفسیاتی پس منظر۔ منطقی پس منظر۔ اخلاقی پس منظر۔ جمالیاتی پس منظر کیا گیا تو ان میں پس کا سین ہمیشہ ساکن ہی رہے گا اور علامت اضافت
(زیر) ظاہر کرنے کے بعد ترجمہ بالکل غلط ہو جائے گا۔

اسی لئے میں ہمیشہ پس منظر لکھتا ہوں اور اگر کسی ادیب و شاعر کی زبان سے پسِ منظر سنتا ہوں تو ٹوک دیتا ہوں۔

۴

محمود و ایاز کی محبت کا راز

(سید فضل الٰہی صاحب۔ برہانپور)

محمود غزنوی کا عشق اپنے غلام ایاز کے ساتھ بڑی مشہور بات ہے اور اس تعلق محبت کے بارے میں بہت سے واقعات
بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ راز اب تک نہیں کھلا کہ محمود کو ایاز سے کیوں اتنی والہانہ محبت تھی، کیا اس کا تعلق
صرف امرد پرستی سے متعلق تھا یا اس کا سبب کوئی اور بھی تھا۔

(نگار) اب تو خیر زمانہ ہی بدل گیا ہے، لیکن میرے اوائل عمر میں جب لڑکوں کو سب سے پہلے فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی تو وہ
زیادہ تر ادب اور تخئیلی لٹریچر سے تعلق رکھتی تھی اور اس نوع کے لٹریچر میں شعراء فارسی کا کلام بھی سامنے آتا تھا۔
چنانچہ جب میری فارسی تعلیم شروع ہوئی تو مجھے بھی اسی منزل سے گزرنا پڑا اور اسی دوران میں محمود نامہ بھی میری نگاہ سے
گزرا۔ مجھے خیال ہے کہ اس وقت میرے کسی استاد نے غالباً مجھ سے کہا تھا کہ محمود نامہ ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو محمود

نے ایاز کی محبت میں کہی تھیں ۔۔ اس دیوان کا پہلا شعر:

اے داغ بر دل از غمِ خالِ تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

مجھے اب تک یاد ہے اور اسی ذہنی تصور کے ساتھ یاد ہے کہ اس شعر کا مخاطب ایاز ہے۔

ایاز کے وجود سے تو انکار ممکن نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ محمود کو اس سے بڑا لگاؤ تھا، لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس کا تعلق جذبۂ امرد پرستی سے تھا، کیونکہ ہم کو تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ محمود اس ذوق کا انسان تھا اور ایاز سے اس کی محبت اسی نوعیت کی تھی۔

ایاز بڑا مہذب و شایستہ، حد درجہ مطیع و فرمانبردار خادم تھا اور محمود کے دربار میں اس کی عزت کا سبب اس کی یہی خصوصیات تھیں، اس سلسلہ میں متعدد روایات ایاز کی اطاعت و فرمانبرداری کی بیان کی جاتی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی کہ جب محمود کو معلوم ہوا اس کے بعض امراء دربار بھی ایاز سے حسد رکھتے ہیں تو اس نے ایک دن برسرِ دربار جب تمام سردار اور خدام جمع تھے ایک نہایت بیش قیمت موتی ہاتھ میں لے کر حکم دیا کہ اس کو توڑ کر چور چور کر دیا جائے، لیکن نہ کوئی امیر اس کی جرأت کر سکا نہ کوئی خادم، کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ مبادا بعد کو محمود باز پرس کرے کہ کیوں ایسا کیا گیا۔ جب محمود نے سب کو لیس و پیش کرتے ہوئے پایا تو ایاز کو بلا کر یہی حکم دیا اور اس نے اسی وقت موتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ محمود نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ایاز سے اسی لئے محبت کرتا ہوں کہ وہ میرے حکم کا بندہ ہے اور میرے فرمان کی تعمیل میں، خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، پس و پیش نہیں کرتا۔

ہو سکتا ہے یہ روایت درست نہ ہو لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ محمود، ایاز کا کیوں اس قدر گرویدہ تھا، ایک اور مشہور روایت محمود و ایاز کے تعلق کے سلسلہ میں یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک رات محمود نے نشۂ شراب میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، صبح جب ہوش آیا تو اسے بہت افسوس ہوا کیونکہ اس سے ایاز کا حسن کم ہو گیا تھا اور اسی اضمحلال کے عالم میں وہ دربار آیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ اس افسردگی کا کوئی خاص سبب ہے لیکن کس میں ہمت تھی کہ پوچھتا، آخر کار محمود نے عنصری کو بلایا جو اس کا بڑا محبوب شاعر تھا اور اس سے سارا حال بیان کیا۔ عنصری نے اسی وقت یہ رباعی کہہ کر محمود کی افسردگی کو دور کر دیا:۔

کے عیب سرِ زلفِ بت از کاستن ست — چہ جائے بغم نشستن و خاستن ست
بروزِ طرب و نشاط و مے خواستن ست — کاراستن سرو ز پیراستن ست

(یعنی اگر محبوب کی زلف کاٹ دی گئی تو اس میں کیا برائی ہے اور کیوں اس پر افسوس کیا جائے، جبکہ سرو کا درخت کاٹ چھانٹ کے بعد اور زیادہ سجیلا ہو جاتا ہے)

اس روایت سے ضرور یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود کو ایاز کے ساتھ کچھ جذباتی لگاؤ بھی تھا، لیکن کسی جنسی جذبہ سے اسے متعلق کرنا درست نہیں۔ کیونکہ جہاں تک اس خاص جذبہ کا تعلق ہے وہ ایاز سے نہیں بلکہ ایاز کی بہن سے متعلق تھا اور محمود، ایاز سے نہ صرف اس لئے محبت کرتا تھا کہ وہ حد درجہ فرمانبردار خادم تھا بلکہ اس لئے بھی وہ اس کی محبوبہ کا بھائی تھا ۔۔۔ اس واقعہ کو محمد عوفی[1] نے اپنی کتاب جامع الحکایات

---

[1] عبدالرحمان بن عوف کی اولاد میں سے تھا اور اسی لئے اپنے آپ کو عوفی لکھتا تھا۔ اس کا سن ولادت معلوم نہیں، لیکن یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس کی عمر کا ابتدائی حصہ بخارا و خراسان میں گزرا اور مغلوں کے حملہ کے وقت یہ ہندوستان آیا۔ یہاں سب سے پہلے وہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں پہونچا اور اس کے وزیر عین الملک حسین الاشعری کی فرمائش پر "لباب الالباب" کے نام سے فارسی شعراء کا تذکرہ مرتب کیا (جو فارسی کا قدیم ترین تذکرہ ہے)۔ قباچہ کی وفات (۶۲۵ھ) کے بعد سلطان التمش کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور "جامع الحکایات" کو پورا کیا۔ اس کے بعد دہلی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے :- " محمود کو ایاز کی بہن سے جو بڑی حسین جمیل تھی، محبت ہوگئی لیکن اپنے مرتبۂ شاہی کے پیشِ نظر وہ اس کا اظہار نہ کرسکتا تھا کہ مبادا لوگ اس پر طعن کریں۔ اس کا یہ جذبۂ محبت بڑھتا رہا اور ایک دن اس نے مجبور ہو کر اپنے ایک امیر ابو نصر مشکانی سے سارا حال بیان کر دیا جو محمود کا بڑا معزز امیر تھا۔

مشکانی نے عرض کیا کہ اس کو شریکِ زندگی بنانے میں کیا امر مانع ہے؟ محمود نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو دوسرے ملکوں کے سلاطین بدنام کریں گے اور خود میری رعایا پر بھی اس کا اچھا اثر نہ ہوگا، لوگ کہیں گے کہ بادشاہ نے اپنے مرتبہ سے ہٹ کر ایک خادم کی بہن سے شادی کر لی۔

مشکانی نے یہ سُن کر کہا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، اکثر شاہانِ عجم نے کنیزوں سے شادیاں کی ہیں۔ نوشیروانِ عادل ایک معمولی دہقانی لڑکی ہی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور بہرام گور نے بھی ایک ماہی گیر کی لڑکی پر عاشق ہو کر اس سے شادی کر لی تھی۔ محمود نے ان واقعات کی تفصیل دریافت کی تو مشکانی نے ان کو بیان کرنا شروع کیا اور بہرام گور کے واقعۂ شادی کی تفصیل سُن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس کی فکر دور ہوگئی اور اس نے ایاز کی بہن سے شادی کر لی۔

ان حالات کی بنا پر ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ ایاز سے محمود کی محبت کا کیا راز تھا۔

---

(۵)

فردوسی کا ایک شعر

دو مہینے اس طرف کی بات ہے کہ پاکستان کے کسی صاحب نے مجھ سے فردوسی کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا تھا، لیکن وہ خط گم ہوگیا اور یہ بات میرے ذہن سے جاتی رہی۔ اب یاد آنے پر تعمیل ارشاد کرتا ہوں ۔ شعر یہ ہے :-

کفِ شاہِ محمود عالی تبار نُہ اندر نُہ آمد سہ اندر چہار

(نگار) یہ شعر فردوسی کے ان اشعار میں سے ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمود کے ہجو میں اس نے لکھے تھے۔ اس شعر میں اس نے محمود کے بُخل کا ذکر معمہ کی صورت میں کیا ہے۔

" نُہ اندر نُہ " سے مراد ۹ × ۹ ہے جو برابر ہے ۸۱ کے، اسی طرح " سہ اندر چہار " سے مراد ہے ۳ × ۴، جو برابر ہے ۱۲ کے اور ۸۱ × ۱۲ مل کر ۹۳ ہوتے ہیں۔

ایک طریقہ شمار کا عقد انامل بھی ہے یعنی اونگلیوں کے کھولنے بند کرنے سے کسی عدد کو ظاہر کرنا۔ اور اس شعر میں اسی طریقِ شمار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طریقِ شمار کے مطابق ۹۳ کو اس طرح ظاہر کریں گے کہ دونوں ہاتھوں کی اونگلیوں کو ہتیلی کی طرف موڑ کر انگوٹھے کے نیچے لے جائیں اور یہی صورت مٹھی بند کرنے کی ہوتی ہے ـــ اس لئے فردوسی یہ کہنا چاہتا ہے کہ محمود کی مٹھی ہمیشہ بند رہتی ہے اور وہ بڑا بخیل ہے۔

اس نظم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ الحاقی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مزید تصدیق اس شعر سے بھی ہوتی ہے کیونکہ فردوسی کبھی ایسا ہر شعر نہیں کہہ سکتا تھا جو لایعنی معمہ کے سوا کچھ نہیں۔

باب الانتقاد

"مستحصلات الجفر"

ایک سال سے زیادہ زمانہ گزرا جب پاکستان کے ایک بزرگ جناب سید سرفراز علی رضوی نے یہ کتاب مجھے تبصرہ کے لئے روانہ کی تھی۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علم جفر سے متعلق ہے۔ جس وقت یہ تصنیف مجھے ملی تو میں نے اسے علیحدہ رکھ لیا کیونکہ مجھے خود اس قسم کے علوم سے جو مبہمات سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، خصوصیت کے ساتھ علم جفر، جس سے والد مرحوم کو بھی کافی شغف تھا اور ان کے بعض احباب کو بھی۔ میں اپنے بچپن میں ان بزرگوں کے پاس بیٹھ کر ان کے استخراجات احکام کے طریقہ کو دیکھا کرتا تھا گو سمجھ نہ سکتا تھا۔

اب ایک زمانہ کے بعد سید سرفراز علی صاحب رضوی کی جو یہ کتاب سامنے آئی تو تمام غیر شعوری نقوش جو اب سے ۶۰ سال قبل دماغ میں منقوش ہو چکے تھے، پھر ابھر آئے اور میں نے فرصت کے اوقات میں اس پر غور کرنا شروع کیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اس کتاب کے تمام طرق استخراج نتائج کو سمجھ لیا، تو یہ کہنا بالکل غلط ہوگا، لیکن اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس فن پر اردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جس کو غور کرنے کے بعد سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے قواعد پر عمل کر کے ہم استخراج نتائج بھی کر سکتے ہیں اور لوگوں کے سوالات کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔

اس کتاب میں متعدد اصول بتائے گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ آسان طریقہ وہ ہے جسے مستحصلہ کدہ کہتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ دقیق و مشکل نہیں۔ لیکن باوجود بار بار کوشش کے میں اسے پوری طرح نہیں سمجھ سکا، مختلف سوالات قایم کر کے ان کا جواب حاصل کرنا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ مثالاً جو سوالات قایم کر کے انھوں نے جس طرح استخراج جواب کیا تھا وہ بھی میرے لئے اب بھی ناقابل فہم تھا۔

میں نے ان کو ایک سوال بھیجا (جس کے اظہار کی ضرورت نہیں) اور انھوں نے اس کا جواب مع طریق عمل کے مجھے دیا، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا سوال روانہ کیا اور ان کا بھی انھوں نے جواب دیا، لیکن ان میں سے پہلے دو سوال ایسے تھے جن کا تعلق مستقبل سے ہے اس لئے ان کی صحت و عدم صحت کا علم ابھی نہیں ہو سکتا۔ آخری سوال جو میں نے اپنے لڑکے کی کامیابی امتحان کے متعلق بھیجا تھا اس کا جواب البتہ انھوں نے بالکل صحیح دیا۔

اس کے بعد میں نے انھیں لکھا کہ میں پاکستان آ رہا ہوں اور وہیں بالمشافہ ان سے اس فن کے نکات و رموز کو سمجھوں گا چنانچہ سال گزشتہ جب میں کراچی پہونچا تو وہ ازراہ کرم تشریف لائے اور متعدد صحبتوں میں میں نے اس کتاب کو ان سے سمجھا۔ اس زمانہ میں میں نے بعض اور سوالات بھی ان سے کئے جن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "عالمی جنگ ہوگی یا نہیں اور ہوگی تو کب تک" تو اس کا جواب یہ نکلا کہ "عالمی جنگ ہوگی اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین برس میں"۔ ان کا یہ جواب صحیح ہے یا غلط اس کا حال بھی ابھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ اگر اس وقت تک زندہ رہا تو جان لوں گا، لیکن اس سلسلہ میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ یہ صاحب صرف

فر بلکہ رمل و نجوم کے بھی ماہر ہیں اور ان کے اوقات کا اکثر حصہ انھیں علوم کی چھان بین اور لوگوں کے سوالات کا جواب دینے میں
رف ہوتا ہے۔

یہ کتاب موصوف سے تین روپیہ میں مل سکتی ہے ۔ پتہ یہ ہے :-
سید سرفراز علی رضوی ۔ محلہ رسول آباد ۔ مکان نمبر $\frac{D9}{13}$ ۔ خضیر محمد خاں ذرار روڈ ۔ کراچی ۔

یہاں تک تو خیر ذکر تھا صرف اس مخصوص کتاب اور اس کے فاضل مصنف کا لیکن نامناسب نہ ہوگا اگر تاریخی حیثیت سے بھی
س فن پر نگاہ ڈال لی جائے ۔

علم جفر کے متعلق بعض شیعی فرقوں کا خیال ہے کہ وہ ایک الہامی علم ہے جو حضرت علی کو حاصل تھا اور بعد کو ان کے جانشینوں میں منتقل
ہوتا رہا۔ اصل بنیادی عقیدہ اس باب میں یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی کو ایک صحیفہ ایسا مرحمت ہوا تھا جو قرآن پاک کے حقیقی و روحانی
مفہوم کا حامل تھا اور سینہ بسینہ ائمۂ معصومین کو منتقل ہوتا رہا ، یہاں تک کہ جب وہ امام جعفر صادق (چھٹے شیعی امام) تک پہونچا تو
انھوں نے اس کی بنیاد پر ایک کتاب تصنیف کی جو بکری کی کھال پر مرقوم تھی (عربی میں بکری کے بچے کو جفر کہتے ہیں اس لئے اس کا
نام کتاب الجفر ہوگیا) کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی وساطت سے تمام آیندہ و گزشتہ حالات معلوم ہو سکتے تھے ۔

ابن قتیبہ کے حوالہ سے دمیری کی کتاب الحیوان میں بے شک امام جعفر صادق کی اس کتاب کا حوالہ ملتا ہے، لیکن کتاب الحیوان کے
دلین مخطوطہ میں اس کا ذکر موجود نہیں اور ابن ندیم نے بھی اپنی کتاب الفہرست میں کتاب جفر کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس نے امام
محمد جعفر صادق کے حالات لکھنے میں خاص اعتناء سے کام لیا ہے ۔

اس زمانہ میں اس قسم کی پیشگوئیوں کا عام ذوق پیدا ہوگیا تھا جو زیادہ تر جماعت علویین کے ہاتفیات میں رائج تھا اور اس طرح کی
کتب ملاحم (علم الہامی) وجود میں آگئی تھیں (جیسے علی بن یقطین کی کتاب الملاحم) اور انھیں میں سے ایک کتاب الجفر بھی ہے جو امام
جعفر صادق سے منسوب کی جاتی ہے ۔

اہل سنت، خارجی اور معتزلہ ایسی کتابوں یا ایسے علوم ملہمہ کے قایل نہیں، لیکن شیعی حضرات اب تک ان پر یقین رکھتے ہیں اور
علم جفر کو امام جعفر صادق کی یادگار سمجھ کر اس پر بڑا اعتماد رکھتے ہیں ۔ امام جعفر صادق کو زمانۂ آیندہ کا کتنا علم حاصل تھا اس کا اندازہ
ایک شیعی مصنف کی روایت سے ہو سکتا ہے کہ جب مامون نے امام علی بن موسی الرضا کو اپنا جانشین نامزد کیا تو امام نے کہا کہ جفر اور جامعہ
دونوں اس کی مخالفت کرتے ہیں ۔ اور آخر کار یہی ہوا کہ مامون نے (جیسا کہ مشہور ہے) زہر ملا ہوا انگور کھلا کر انھیں ہلاک کر دیا ۔ جامعہ بھی
ایک اسی قسم کی کتاب ہے جس کا ذکر کتاب الجفر کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ایک کتاب مصحف فاطمہ کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے ۔

البیرونی نے بھی امام جعفر صادق کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے لیکن انکی کتاب الجفر کا حوالہ کہیں نہیں دیا ۔ ابن خلدون نے البتہ ملاحم کے سلسلہ
میں امام جعفر صادق کی کتاب الجفر کا ذکر ضرور کیا ہے، کیونکہ وہ خود بھی ائمہ و اولیاء کی کرامت کا قایل تھا اور ایسی کتابوں پر یقین رکھتا تھا ۔ اس نے
یہ بھی لکھا ہے کہ اصل کتاب الجفر، ہارون بن سعید کے پاس موجود تھی جس کے متعلق وہ کہتا تھا کہ مجھے امام جعفر صادق سے پہونچی ہے، اسی کے منتشر اجزاء
بعد کو ملک میں پھیل گئے ۔ اسی نام کی ایک اور کتاب کا ذکر ابن خلدون نے کیا ہے جسے یعقوب بن اسحاق الکندی نے مرتب کیا تھا جس کے
ذریعہ سے وہ مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کے زائچے طیار کرتا تھا ۔ الغرض جفر الہام و نجوم دونوں سے تعلق رکھتا تھا جس میں حروف ابجد کے اعداد
کے الٹ پھیر سے جواب حاصل کیا جاتا تھا، اور یہ علم بعد میں بھی عرصہ تک مقبول رہا، لیکن رفتہ رفتہ اس کے جاننے والے ختم ہوگئے یا اب اگر کہیں ہیں بھی تو لوگ ان سے
واقف نہیں ۔ میں خود کسی پیش گوئی یا اخبار عن الغیب کا قایل نہیں اور نجوم کے زیر ظہور واقعات کو بھی تسلیم نہیں کرتا، لیکن جفر کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ ضرور
پتہ چلتا ہے کہ ان کو اونچی ریاضی یا علم الحساب کی حیثیت ضرور حاصل ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اعداد کے الٹ پھیر سے بعض عجیب و غریب باتیں سامنے
آتی ہیں جن کی علمی توجیہ کی دشواریوں میں پڑنے کے بجائے یہ زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غیبی اشارات سمجھ لیا جائے ۔

فکاہات

(اڈیٹر)

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

یہ مقولہ فارسی کی طرح عربی میں بھی بہت مقبول ہے۔ چنانچہ ایک بار "ہارون الرشید" نے اپنے محبوب شاعر ابو نواس سے پوچھا کہ "گناہ کی معذرت تو اچھی بات ہے، وہ کیونکر گناہ سے بدتر ہو سکتی ہے"۔

ابو نواس نے عرض کیا "حضور، میں اس کا جواب سوچ کر پھر کسی وقت دوں گا"۔ ——— اسی دن شام کو وہ محل خانۂ خلافت کی ڈیوڑھی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور جب دھندلکے میں خلیفہ اندر جانے لگے تو ابو نواس نے آگے بڑھ کر ان کا منھ چوم لیا۔

ہارون الرشید نے سخت غضبناک ہو کر پوچھا "یہ کیا حرکت تھی"۔ اس نے جواب دیا کہ "امیر المومنین، معافی چاہتا ہوں، میں نے غلطی سے آپ کو زبیدہ خاتون سمجھ لیا تھا"۔

جب یہ جواب سن کر ہارون الرشید اور زیادہ برہم ہوا تو ابو نواس بولا "پیر و مرشد عذرِ گناہ بدتر از گناہ" اسی کو کہتے ہیں۔

قیمتی فریب

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں (۱۹۴۲ء) ایک فوجی جنرل برلٹز اسکول کے دفتر میں آیا اور پرنسپل سے کہا کہ "کیا چھ ہفتے میں ... سو سپاہیوں کو ناروے کی زبان سکھا دینے کا انتظام آپ کر سکتے ہیں"۔ اس نے کہا کہ "اگر امریکہ کے تمام اساتذہ جو ناروے زبان کے ماہر ہیں اکٹھا ہو جائیں تو ایسا ہونا ممکن ہے"۔

چنانچہ یہ تمام اساتذہ طلب کئے گئے اور سپاہیوں کو ناروے کی زبان سکھائی جانے لگی، لیکن اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ دوسرے طلباء اس راز سے واقف نہ ہوں۔ چھ ہفتہ کے بعد جب وہ یہ زبان سیکھ گئے تو انھیں انگلستان بھیج دیا گیا اور وہاں انھیں ٹھنڈے ملک کی وردی بھی تقسیم کر دی گئی، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں معلوم ہوا کہ انھیں افریقہ بھیجا جا رہا ہے۔ بعد میں راز کھلا کہ یہ سب کچھ جرمنی کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنی توجہ ناروے کی طرف مبذول رکھے اور افریقہ کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہو۔

آرٹ اور کلچر

ایک فرانسیسی آرٹسٹ کا دیوالہ نکلا تو اس نے اپنے تصویر خانہ کی تمام بیش قیمت تصاویر بیچنا شروع کر دیں، لیکن اپنے آبدار خانہ کو بالکل محفوظ رکھا اور شراب کی ایک بوتل بھی علٰحدہ نہیں کی۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ "تم نے ایسا کیوں کیا۔ تصویریں تو زیادہ قیمتی چیزیں تھیں"۔ ——— اس نے جواب دیا کہ "انسان آرٹ کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے، لیکن کلچر کھو کر جینے کے کوئی معنی نہیں"۔

عجیب اتفاق

ولایت میں کسی وقت جمعہ (Friday) کا دن بہت منحوس دن خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ اس وہم کو دور کرنے کے لئے ایک جہاز کی تعمیر اسی دن شروع کی گئی، اس کا نام بھی یہی رکھا گیا، اسی دن وہ سمندر میں ڈالا گیا اور اسی دن اس نے اپنا سفر اختیار کیا۔ لیکن اس کے بعد اسے لوٹنا نصیب نہ ہوا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان!

Grenda
KNITTING
WOOLS
GOKAL CHAND RATTAN CHAND WOOLEN MILLS PVT. LTD. BOMBAY, DELHI AND AMRITSAR

انتخاب

(امجد نجمی - کٹک

ہے وہی کیفیت بے تابیٔ موجِ نظر حسن کے جلووں کو بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں
اے نظامِ دارد مقتل گوش بر آواز ہو اب زباں پر اپنی حرفِ مدعا لاتا ہوں میں

تم جلوہ دکھاؤ تو ذرا پردۂ در سے ہم تھک گئے نظارۂ خورشید و قمر سے

اس کا ہر ہر گھونٹ تھا زہرِ ہلاہل سے سوا زندگی کو چشمۂ آبِ بقا سمجھا تھا میں

یہاں تو قابلِ افسوس ہیں دشواریاں ان کی تمہاری راہ میں مشکل کو جو مشکل سمجھتے ہیں

کب بھلا چھوٹا ہے ہم سے کارواں والوں کا ساتھ ہم بھٹک کر بھی غبارِ کارواں تک آ گئے

میں سعیٔ مسلسل کر کے بھی منزل سے کوسوں دور رہا منزل نہ ملی تو کیا ہے مگر اپنے کو پاتا جاتا ہوں

ہم فریبِ ہستیٔ موہوم یوں کھاتے رہے جو نہ کرنا تھا وہ کرتے اور پچھتاتے رہے

کچھ اپنے آپ کو ایسا مٹا رہا ہوں میں کہ جس کو پانا تھا اب اس کو پا رہا ہوں میں

مرے مشرب میں سجدہ بُت کا گو جایز نہیں لیکن تراشا ہے تجھے جس نے میں قایل ہوں اس آذر کا

حسنِ دلکش کا بھی کیا انداز ہے ناز گویا ہے ادا خاموش ہے

ان کی مے اور ان کا مینا، میرا کام تھا پیتے رہنا کچھ بھی نہ تھا اندیشۂ فردا، رات گئی وہ بات گئی

تقدیر کے ہم قایل ہی نہ تھے، پر اتنا کہنا پڑتا ہے تدبیر کا دامن ہاتھ میں اپنے آ کر اکثر چھوٹ گیا

جھکتا ہی نہ تھا پر ایسا جھکا نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں معلوم نہیں اس سر نے کیا اُس سنگِ در میں دیکھ لیا

محبت کا دریا، جوانی کی لہریں یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
یہ ان کی جدائی، یہ ساون کی جھڑیاں بس آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

یہ جان تو دینے ہی کی اک چیز ہے لیکن میں ان کا تقاضائے وفا دیکھ رہا ہوں

مرے حُسنِ طلب کو دیکھ نجمی کہ لب پر خامشی ہی خامشی ہے

نجمی یہ خموشی بھی میری کچھ وجہ سکونِ دل نہ ہوئی میں ضبطِ فغاں سے درد کو اپنے اور بڑھاتا جاتا ہوں

پہونچا دیا ہے مجھ کو مرے عشق نے وہاں جس جلوہ گاہِ ناز میں سجدہ روا نہیں

اکرم دھولیوی

گر پڑی ایک برق سی دل پر جب نشیمن قفس میں یاد آیا
پردۂ ناز تو اُٹھا لیکن، دل کی بے تابیوں پہ حرف آیا
ترکِ الفت پہ جب نگاہ گئی عشق مجبور ہی نظر آیا
چھیڑ کر آج درد کی روداد ہم بھی تڑپے انھیں بھی تڑپایا

انتخاب

(درد سعیدی)

اپنی منزل سے مایوس ہم ہو گئے
فاصلے راہ کے یوں بھی کم ہو گئے

ہم اُن سے کہیں ملے ہیں، لیکن
کچھ یاد نہیں کہاں ملے ہیں

محرومیٔ دل کا ہے یہ عالم!
اب سجدۂ شکر بھی گلے ہیں

اتنے بھی قریب سے نہ گزرو!
دل چونک پڑے نظر سے پہلے،

پہچان سکو گے اب مجھے کیا
میں اپنے لئے بھی اجنبی ہوں

سمجھا ہوں قفس کو آشیانہ
زندانیٔ رسمِ زندگی ہوں

موج و طوفاں سے کیا گلہ کرتے
ہم سفینوں میں غرقِ آب ہوئے

رہ گئیں بیشتر جنوں بن کر
کوششیں اُن کو بھول جانے کی

کبھی فریب بھی کھائے ہیں آگہی کے لئے
بھٹک گیا ہوں اندھیروں میں روشنی کیلئے

(جمیلؔ مظہری)

آستیں میری ہے اور دیدۂ تر ہے اے دوست
اب مرے اشک کا قطرہ بھی گُہر ہے اے دوست

یہ نہ دیکھا کہ تبسم کی تہوں میں کیا ہے
کس قدر کور، محبت کی نظر ہے اے دوست

دِل تھا محتاط تو در بھی نظر آیا دیوار،
دِل ہے بیتاب تو دیوار بھی در ہے اے دوست

عقل اور عشق میں مدت سے ہے گھر کشاکش
میرا دل ہے کہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے اے دوست

ہو نہ زحمت تو اُچٹتی سی نظر سوئے جمیلؔ
یہ گدا سایلِ یک زخمِ جگر ہے اے دوست

(ڈاکٹر متین نیازی)

کیف تصور، اللہ اللہ،
جلوے پر ہیں جلوے چھائے

لوگ مجھی کو سمجھاتے ہیں،
کوئی اُن کو بھی سمجھائے

بیٹھے ہوئے ہیں تیرے وحشی،
راہگذر میں آنکھیں بچھائے

بازیٔ الفت ایک معمہ،
جیت یہی ہے ہارا جائے

آپ تھے، میں تھا، کیا عالم تھا،
لوٹ کے وہ لمحات نہ آئے

پھول کھلے بھی مرجھائے بھی
دُنیا بدلی، آپ نہ آئے

اوّل اوّل اپنے بسمل پر تھے ہم قہقہے
آخر آخر اُن کے دل میں بھی ملال آ ہی گیا

پاسِ خودداری سے میں غافل نہ تھا لیکن متینؔ
اضطرارِ شوق میں لب پر سوال آ ہی گیا

کرم جو حد سے سوا ہو تو ہے عذاب اے دوست
بہ قدرِ ضبط ہی منظور ہے عتاب اے دوست

(شفقت کاظمی)

یاد آئے ہیں دوستوں کے میلے جب پھول چمن چمن کھلے ہیں
یہ رنج یہ درد بے کسی کے شاید تیرے پیار کے صلے ہیں
اس طرح چھٹی کہ پھر نہ آئی ہم کو تیری یاد سے گلے ہیں
گزرے ہیں نظر بچا کے شفقت
وہ راہ میں جب کبھی ملے ہیں

بر گلشن تھا جب وجود اپنا ہم سبز شاخسار کیا کرتے
اپنے شکوؤں پہ خود ہوئے نادم ہم انھیں شرمسار کیا کرتے

ہو جائیں جس گھڑی فسانہ ڈھونڈے گا بہت ہمیں زمانہ
ہمراہ ابھی جو چل رہے تھے کیا جانے کدھر ہوئے روانہ
ملتے ہی بچھڑ گئے وہ ہم سے ترتیب نہ پا سکا فسانہ
کیوں تم نے کہی وہ بات شفقت
جس کو نہ سمجھ سکا فسانہ

انڈین نیشنل ببلوگرافی

انڈین نیشنل ببلوگرافی حالیہ ہندوستانی مطبوعات کا مستند ریکارڈ ہے۔
تاریخ میں پہلی بار، انگریزی اور دیگر مندرجہ ذیل زبانوں کی تمام مطبوعات کا صحیح اور مفصل ریکارڈ اب رومن رسم الخط میں دستیاب ہے۔
آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، ملیالم، ہندی، مراہٹی، اڑیہ، پنجابی، سنسکرت، تلگو، اور اردو۔
پنج سالہ پلانوں کے عرصہ میں سرکار نے متعدد اہم کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ کتابیں اقتصادیات، سیاسیات اور عمرانیات کے طلبا کے لئے بنیادی مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام کتابیں بھی اس ببلوگرافی میں شامل ہیں۔

سائز :- ڈی مائی کوارٹو ۸½ × ۱۱½ چھپا ہوا حصہ ۹ × ۶½

اشاعت :- چار سہ ماہی شمارے اور ایک کیلنڈر سال پر مشتمل سالانہ نمبر۔

قیمت :- سالانہ نمبر ۵۰/- روپے فی جلد محصول ڈاک الگ۔ سہ ماہی شمارہ ۱۵ روپے ۵۰ نئے پیسے، محصول ڈاک الگ۔

رعایت :- ایک سہ ماہی شمارے کی کم سے کم چھ جلدیں اور سالانہ نمبر کی تین جلدیں بیک وقت خریدنے پر ۱۵ فی صد رعایت دی جائے گی۔

دستیابی :- پہلا شمارہ اکتوبر-دسمبر ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا۔ پچھلے تمام شمارے چندے کی رقم ادا کر کے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

نمکا پتہ :- گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل ریفرنس لائبریری، معرفت نیشنل لائبریری، بل وے ڈر، کلکتہ نمبر ۲۷

مطبوعات موصولہ

نمونۂ لغاتِ اُردو

ترقی اُردو بورڈ کراچی نے حال ہی میں ایک نمونہ اس لُغت کا شایع کیا ہے جو وہاں زیرِ ترتیب ہے - یہ نمونہ صرف طلبِ رائے کے لئے شایع کیا گیا ہے اور گو اس کی ضخامت صرف ۴۶ صفحات کی ہے، لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس لغت کی ترتیب میں کس قدر غیر معمولی تحقیق و کاوش سے کام لیا جا رہا ہے -

اُردو لُغت میں امیر اللغات کو خاص شہرت حاصل ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مکمل نہ ہو سکی - فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات بھی اچھے فرہنگ ہیں، لیکن اغلاط سے پاک نہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی لُغت اُردو کا ایسا طیار کیا جائے جو ہر لحاظ سے مستند ہو، اور خوشی کی بات ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کراچی اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے -

اس لغت کی سب سے بڑی خوبی جس کا اندازہ "نمونہ" دیکھ کر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ محض لُغت ہی نہیں بلکہ ایک حیثیت سے دائرۃ المعارف کی بھی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اسکی یہی حیثیت قایم رہی تو یقیناً بڑی اہم خدمت ہو گی - تاہم ایک مشورہ ضرور دوں گا وہ یہ کہ الفاظ کی تخلیق و تشکیل و تعیینِ معانی کے سلسلہ میں زیادہ چھان بین کی ضرورت ہے اور قصص طلب یا تلمیحی الفاظ کے سلسلہ میں صحتِ روایات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے - مثلاً :-

۱ - "اب" کے سلسلہ میں اس کا ایک طنزیہ مفہوم ترک ہو گیا - جیسے کوئی شخص صحیح و مناسب وقت گزرنے کے بعد پہونچے تو کہیں گے "تم اب آئے" - !

۲ - "ابھی" کے سلسلہ میں "ابھی ابھی" رہ گیا -

۳ - "اَپَج" کے ذیل میں لفظ "اُپج" ترک کر دیا گیا - حالانکہ "اپجنا" درج ہے - (صفحہ ۸)

۴ - "اصحاب" :- اس لغت کے سلسلہ میں اصحابِ فیل، اصحابِ صفہ، اصحاب الشمال، اصحاب الیمین کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن اصحاب الاخدود، اصحاب الایکہ و اصحاب الثمود وغیرہ کو ترک کر دیا - یہ درست ہے کہ یہ الفاظ اُردو نظم پر مستعمل نہیں ہوتے لیکن اُردو نثر میں تو ہوتے اور ہو سکتے ہیں -

"اصحابِ کہف" کے سلسلہ میں "چند اہلِ ایمان" کا ذکر کیا گیا ہے لیکن وہ کس مذہب و قوم کے تھے اس کی صراحت موجود نہیں اسی طرح یہ لکھنا کہ اصحابِ کہف اب تک سو رہے ہیں، عقلاً و روایتاً درست نہیں -

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنا ہے، وہ یہ کہ جن مصنفوں سے استناد کیا جائے ان کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے - ضرورت ہے کہ مزید تصدیق کے لئے دوسرے اساتذہ کی تحریروں کی بھی جستجو کی جائے اور اگر ان میں باہم اختلاف ہو تو بورڈ کو خود اپنی رائے علحدہ قایم کرنا چاہئے -

مثلاً اصیل کے سلسلہ میں ناصر نذیر فراق دہلوی کا ایک جملہ سند کے طور پر درج کیا گیا ہے :-

"نوکریں، چاکریں، اصیلیں اِدھر اُدھر ہیں" —— اس میں اصیلیں کہنا تو درست ہے، لیکن نوکریں، چاکریں البتہ غور طلب ہے، کیونکہ نوکر اور چاکر دونوں مذکر ہیں، ان کی جمع نوکریں، چاکریں نہیں ہو سکتی اور بصورتِ تانیث نوکر کو نوکرانی کہیں گے -

نوائے پریشاں

جناب جگن ناتھ آزاد کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جسے ادارۂ انیس اُردو الٰہ آباد نے حال ہی میں شایع کیا ہے اس مجموعہ میں نظمیں، رُباعیاں اور غزلیں سبھی کچھ ہے، لیکن ان تمام اصطلاحی اصناف سخن سے ہٹ کر ایک چیز اور بھی ہے جسے Turned Insident " کہتے ہیں اور یہ بات اس وقت مجھے آزاد کے کلام کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔

آزاد بڑا پڑھا لکھا شاعر ہے، لیکن اور بھی بہت سے شاعر پڑھے لکھے موجود ہیں، آزاد بڑا وسیع المطالعہ شاعر ہے مگر ایسے شاعر اور بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، لیکن " دل چیر کر سامنے رکھ دینے والا شاعر" کوئی نہیں۔

آزاد کی شاعری الفاظ کی رسمی شاعری نہیں، قلب و روح کی شاعری ہے اور اتنی مکمل کہ جذبات محسوسات سے نکل کر مرئیات میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد جو کچھ کہہ رہا ہے ہم اسے دیکھ بھی رہے ہیں۔ یوں تو آزاد ایک بت گر شاعر ہے اور اس کا ہر مجموعۂ کلام ایک " بتکدہ" لیکن نوائے پریشاں غالباً اس کا سب سے بڑا بتکدہ ہے۔ اس میں شک نہیں آزاد کا کلام اُردو شاعری کا سنگھار ہے۔ قیمت ہے

شہرِ سخن

مجموعہ ہے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے انتقادی تاثرات کا جسے ملکزادہ پبلیکیشنز اعظم گڈھ نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں نئے پُرانے، چھوٹے بڑے ۲۶ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے خود مصنف کو ملنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس لئے ہم اس کو انتقادی ڈائری بھی کہہ سکتے ہیں اور انتقادی جایزہ بھی۔ لیکن اس کی ایک تیسری خصوصیت اور بھی ہے یعنی یہ کہ وہ بجائے خود انشاء لطیف اور انشائیہ نگاری کا بھی بڑا پاکیزہ نمونہ ہے۔

ملکزادہ ابھی نوجوان ہیں اور اسی کم عمری میں ان کا اکثر شعراء سے مل لینا ظاہر کرتا ہے کہ شاید یہ تمام زحمت " دید و داد دید" انھوں نے صرف اسی لئے اختیار کی تھی کہ وہ جو کچھ لکھیں وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے تنقید کی وہ راہ اختیار کی ہے جو اس سے قبل کسی نے اختیار نہ کی تھی اور اسی لئے ہم کو اس کتاب میں بعض بڑے لطیف و اہم پہلو شخصی مطالعہ کے بھی ملتے ہیں جو کلام اور صاحب کلام دونوں کے سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ملک زادہ نے شعراء کے متعلق جو رائے قایم کی ہے وہ نہ صرف معتدل و متوازن بلکہ صاف و بے لاگ بھی ہے اور اگر اسے پھیلایا جائے تو وہ ایک بن سکتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت جو مجھے بہت پسند آئی، اس کا انداز بیان ہے جس میں واقعیت اور Human دونوں کو ملا کر Essay کا رنگ پیدا کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں ملک زادہ کا یہ ادبی تجربہ بالکل پہلا تجربہ ہے جس میں چسٹرٹن، برنارڈ شا اور آسکر وائلڈ کے طنز اور Paradox کے امتزاج سے ایک نئی لیکن بڑی دلکش مثال انتقاد نگاری کی پیش کی گئی ہے

ضخامت ۲۲۰ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔

شعلۂ آواز

دیوان ہے جناب سراج لکھنوی کا جو ۲۰۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ۴۰ غزلیں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۰ء تک کی ہیں ۷۰ غزلیں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۰ء تک کی اور باقی ۴۴ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک کی۔ یہ تقسیم جناب سراج نے غالباً اس لئے مناسب سمجھی کہ ان کے مختلف زمانوں کی شاعری کا رنگ علٰحدہ علٰحدہ متعین ہوسکے، حالانکہ جب ہم ان تینوں زمانوں کی آخری غزلوں کو سامنے رکھتے ہیں تو ہم کو ان میں کوئی قابل ذکر فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ان تینوں زمانوں کی آخری غزل کا ایک ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

۱۔ قفس کا دور سہی موسم بہار تو ہے، اسیرو آؤ ذرا ذکر آشیاں ہو جائے

۲۔ اسی دن ہر گرہ کھل جائے گی اشکِ مسلسل کی ہنسی بن کر ترے ہونٹوں پہ جسدم میرا نام آیا

۳۔ مٹا سا حرف ہوں بگڑی ہوئی سی بات ہوں میں جبین وقت پہ اک نقش بے ثبات ہوں میں

ٹکنک اور اسلوب بیان ایک ہی ہے، البتہ بہ لحاظ معنی آخری شعر میں تشاؤم کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے جو ممکن ہے نتیجہ ہو تلخ تجربات کا۔

یہ دیوان سید صدیق حسن صاحب (آئی۔سی۔ایس) کے پیش لفظ سے شروع ہوتا ہے جو نہ صرف موصوف کا اعتراف خلوص و محبت ہے بلکہ بعض اشعار پر صحیح نقد و تبصرہ بھی ہے، اس کے بعد خود سراج صاحب نے ایک طویل دیباچہ کی صورت میں اپنی شاعری کے نظریوں پر روشنی ڈالی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں زبان کے زیادہ قایل نہیں ہیں بلکہ تخیل و اسلوب بیان کو اصل چیز قرار دیتے ہیں اور اپنی فکر سخن میں انھوں نے انھیں دونوں کے حسن کا خاص لحاظ رکھا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"میں اپنے کلام میں تخصیص کے ساتھ خصوصیات زبان پر داد طلب نہیں ہوں اور نہ محض زبان اور محاورے کو اپنی شاعری کی سنگ بنیاد سمجھتا ہوں۔ میں ہمیشہ سے فکر و تخیل کا دلدادہ ہوں"

ان کے اس دعوے کو سامنے رکھ کر جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دعویٰ بے بنیاد نظر نہیں آتا۔ یقیناً ان کے یہاں فکر و تخیل بھی ہے اور ندرت اظہار بھی، جسے لکھنوی زبان میں "اپج" کہتے ہیں، لیکن وہ کس درجہ و معیار کی ہے، اس کے جاننے کیلئے خصوصیات زبان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے (گو جناب سراج اسے شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہتے) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس باب میں بھی وہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔

کلاسکل غزل گوئی کے نمایندوں میں اس وقت دو ہی چار حضرات رہ گئے ہیں۔ . . . اور ان پروانوں میں سے ایک سراج صاحب بھی ہیں:- نیمہ داغ ونیمہ خاکستر!

ان کی مشق ۵۰ سال کی ہے اور اس نصف صدی میں معلوم نہیں کتنے ہنگامے شعر و سخن کے ان کی نگاہ سے گزرے ہوں گے اور کتنی محفلوں میں داد سخن حاصل کی ہوگی، اس لئے یقیناً سراج کو حق پہونچتا ہے کہ . . . . ان کا شمار اساتذۂ فن میں کیا جائے۔

سراج کے یہاں ہم کو شورش محبت کم نظر آتی ہے، اور معاملات و معاکات بھی چنداں قابل ذکر نہیں، لیکن دل کی چوٹ ان کے ہر شعر سے ظاہر ہے جو صداقت شعری کی شرط اولین ہے۔

فنی حیثیت سے یقیناً ان کا کلام بے عیب نہیں اور ان کی بعض شاعرانہ تعبیرات بھی محل نظر ہیں، لیکن چونکہ خود سراج صاحب فن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اس لئے اس کا ذکر فضول ہے۔

یہ مجموعہ ہے میں، کترہ ابو تراب خاں لکھنؤ کے پتہ پر مصنف سے مل سکتا ہے۔

جدید شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تازہ تالیف ہے جس میں انھوں نے جدید شاعری کے آغاز و ارتقاء اور موجودہ موقف پر نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ خصوصیت کہ جب وہ کوئی بات کہنے پر آتے ہیں تو اس کا بعید ترین پہلو بھی ان سے نہیں چھوٹتا، اس تصنیف میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

ہر چند شاعری کے سلسلہ میں جدید و قدیم کی بحث بظاہر پرانے اور نئے ٹکنک کی بحث ہے، لیکن اس کا تعلق معنویت و موضوع سے بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

جدید شاعری پر مخالف و موافق تحریریں یوں تو بہ کثرت شایع ہو چکی ہیں لیکن اس موضوع پر کوئی مستقل تالیف اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک بڑی ادبی ضرورت کی طرف توجہ فرمائی اور ایک ایسی بسیط و مفصل کتاب تحریر کی جسے غالباً وہی لکھ سکتے تھے۔

ضخامت ۴۴۴ صفحات، طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت پسندیدہ۔

قیمت پندرہ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: اردو دنیا ـــــ آرام باغ روڈ ـــــ کراچی۔

نوائے گُہر مجموعہ ہے جناب بشیشر پرشاد منوّر لکھنوی کی غزلوں کا جسے آدرش کتاب گھر فیض گنج، دریا گنج دہلی نے شایع کیا ہے۔ منوّر صاحب، دُنیائے شعر و ادب میں کسی نووارد کی سی حیثیت نہیں رکھتے کہ تعارف کی ضرورت ہو۔ اب سے پچاس سال پہلے انھوں نے دیارِ ادب میں قدم رکھا تھا اور اب تک انھوں نے کہیں اقامت اختیار نہیں کی۔

منوّر صاحب، سرزمین لکھنؤ کے فرزند ہیں اور نہ صرف اپنے مزاج و کلچر بلکہ اکتسابات علمی کے لحاظ سے بھی وہ اسوقت کے انسان ہیں جب تک نام تھا صرف شرافتِ نفس اور نفاستِ ذوق کا ۔ اور انھیں فطری خصوصیات کے ساتھ وہ دُنیائے ادب میں آئے اور اب تک انھیں نباہے جا رہے ہیں۔

جناب منوّر کا طبعی رجحان زیادہ تر بیانیہ شاعری کی طرف ہے اور اسی رجحان نے انھیں گیتا، کُمار سمبھو اور کلامِ حافظ کے منظوم ترجموں کی طرف مایل کیا اور "کائناتِ دل" لکھوائی جو ان کی نظموں کا بہت مقبول مجموعہ ہے۔ اس دوران میں انھوں نے غزلیں بھی کہیں لیکن ان کی اشاعت کو ہمیشہ "وقتِ دگر" پر ملتوی رکھا، شاید اس لئے کہ جوانی کی یہ باتیں بڑھاپے ہی میں زیادہ لطف دیتی ہیں۔ جناب منوّر کا یہ دیوان صرف ۷۰ غزلوں پر مشتمل ہے، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس میں حشو و زواید آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔

اُردو شاعری میں غزل سے زیادہ نازک صنفِ سخن کوئی نہیں اور اس کارگہ شیشہ گری کا رکھ رکھاؤ بڑا دشوار ہے غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری نئی نسل نے شاعری کی زیادہ آسان راہیں اختیار کر لیں اور شاعروں کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لیکن قدرِ اوّل کے شعراء اب بھی غزل ہی کی زمین سے اُبھرتے ہیں اور انھیں میں ایک منوّر صاحب بھی ہیں۔

اس مجموعہ کے آغاز میں جناب راج نرائن رازؔ نے منوّر صاحب کی غزل گوئی پر بڑا لطیف و صحیح تبصرہ کیا ہے اور ان کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ "منوّر کی غزل میں آپ کو لفظ و معنی کی ایک نئی دنیا آباد ملے گی"۔

خصوصیاتِ غزل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے محاسن کی تعیین میں بھی بڑی بڑی فنی و وجدانی توجیہات سے کام لیا گیا ہے، لیکن میں نے اس کا ایک سادہ سا معیار یہ قایم کیا ہے کہ ہم اس کو سُن کر لطف اندوز تو ہوں لیکن اس لطف کے اظہار سے قاصر رہیں اور منوّر صاحب کی غزلوں میں ہم کو ایسے اشعار متعدد نظر آتے ہیں۔ مثلاً:-

نہیں محال کہ تجھے زندگی میں پا لینا ... مگر ہے شرط تری جستجو میں کھو جانا

عمرِ رواں کو تھا مری روداد سے گریز ... ظالم سُنا کے اپنی کہانی چلی گئی

کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب ... آنسو بھرے ہیں دیدۂ امیدوار میں

کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑ دو ... کس کی میں بندگی کروں، کون مرا خدا بنے

جانتا ہوں یہ کہ عرضِ شوق ہے توہینِ شوق ... پھر بھی عرضِ شوق پر مجبور ہو جاتا ہوں میں

اب اس کا امتیاز بھی امرِ محال ہے ... آتے ہیں وہ اِدھر کہ اُدھر جا رہا ہوں میں

غزل کے باب میں خود منوّر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :-

شاعری وحی سے الہام سے آگے نہ بڑھی ... اک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکرِ شاعرانہ کا نقطۂ نظر کتنا بلند ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت عہ

اقبالؔ کے آخری دو سال تصنیف ہے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اوڈوائر کے زمانہ سے لیکر مسجد شہید گنج کے قضیہ تک جب نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کس سیاسی بحران سے گزر رہا تھا، اس ہنگامۂ سیاست میں اقبالؔ نے کتنا اور کیسا اہم رول انجام دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف اقبالیات بلکہ پوری سیاست ہند کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور آزادیٔ ہند کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کی ترتیب میں جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان میں سے اکثر عام دسترس سے باہر ہیں، اس لئے اس کی اہمیت تاریخی حیثیت سے بھی مسلم ہے۔ یہ کتاب علاوہ تین ضمیموں کے پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب ایک مستقل موضوع کے لئے مخصوص ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایسے سیاسی مقالات کا مجموعہ ہے جن سے ہم علیحدہ علیحدہ بھی فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت نو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈمی۔ کراچی

اسرار و رموز پر ایک نظر

تصنیف ہے جناب پروفیسر محمد عثمان کی۔ جس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی تصانیف میں "اسرار و رموز" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے جو درس مسلم قوم کو دیا گیا ہے، وہ نیا نہ ہو لیکن بھلایا ہوا یقیناً ہے اور اس لئے ضروری تھا کہ اسے موثر طریقہ سے پھر پیش کیا جاتا۔ ڈاکٹر اقبال نے اسی فرض کو "اسرار و رموز" سے ادا کیا ہے اور اتنے گہرے تاثر کے ساتھ کہ ممکن نہیں اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اپنے اندر ایک خاص کیفیت یقین کی محسوس نہ کریں جو تعلیمات اقبال کی بنیاد اولیں ہے۔

فاضل مصنف نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا انفرادی نظریات کا، دوسرا ملی و اجتماعی نقطۂ نظر کا، اور انھیں دو تقسیموں کے تحت "اسرار و رموز" کی شرح و تفسیر کی گئی ہے۔

ہر چند جس حد تک زبان و بیان کا تعلق ہے اس کاوش کی ضرورت نہ تھی لیکن اس کی معنویت و افادیت کے پیش نظر یقیناً اسے بار بار سمجھانے اور دہرانے کی ضرورت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ فاضل مصنف نے جس دلکش اسلوب اور پرخلوص مفکرانہ انداز سے یہ فرض ادا کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے اور ہمیں امید ہے کہ "اقبالیات" کے طلبہ اس سے بہت مستفید ہوں گے۔

کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع ہوئی ہے۔ ضخامت ۱۹۰ صفحات۔ قیمت للعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈمی۔ کراچی۔

اقبال اور حیدر آباد

جناب نظر حیدر آبادی کی تالیف ہے جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حیدر آباد نے اقبال کو کیا سمجھا اور کتنی عزت و توقیر سے ان کی پزیرائی کی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اقبال، حیدر آباد کب گئے، کیونکر گئے اور اہل حیدر آباد نے جس میں وہاں کے خواص و عوام، شعراء و ادیب سب شامل تھے ان کا کتنا پرخلوص خیر مقدم کیا۔ اس داستان لطیف کے سلسلہ میں اقبال کے سیاسی نظریات پر بھی جا بجا واضح گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب بھی اقبال اکاڈمی کراچی نے بڑے اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کی ہے۔

قیمت:۔ پانچ روپیہ۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔

Introduction to the thought of Iqbal.

ترجمہ ہے "مس لیوس کلاڈ میری" کی فرانسیسی تصنیف کا جسے ملا عبدالمجید ڈار بیرسٹر نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔

یہ کتاب مختصر سا سوانحی خاکہ ہے ڈاکٹر اقبال کا اور چند نظموں کا ترجمہ مع تشریحات کے ـــــ اس کتاب میں تصانیف اقبال پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے جو افادہ سے خالی نہیں۔

ضرورت تھی کہ نظموں کے ترجمہ کے ساتھ اصل نظمیں بھی درج کر دی جاتیں۔

یہ کتاب بھی اقبال اکاڈمی کراچی سے مل سکتی ہے۔

آپ کے خط کا پورا پتہ ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور جب آپ اپنی تحریر کے اس حصے میں اختصار سے کام لیتے ہیں تو ہمیں سخت چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ پتہ نامکمل ہو تو خط پہونچانے کے لیے بڑی تلاش سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں خط پہونچانے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجیے

محکمۂ ڈاک و تار۔

نقاب اٹھ جانے کے بعد

قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مجموعہ استفسارات

غالب کی فلکی شاعری اور اس کی خصوصیات

سالانہ چندہ
دس روپے

قیمت فی کاپی

(جون کا نگار، جولائی کی اشاعت میں شامل ہوگا)

نگار

دائرے میں سرخ صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

انتالیسواں سال	فہرست مضامین مئی سنہ ۶۲ء	شمارہ ۵

ملاحظات

اسلام اور احترام مذاہب

تعلیمات اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں اور جن کی بنا پر اسلام کو عام طور پر ایک جنگ جو مذہب سمجھ لیا گیا ہے - اس کی ذمہ داریاں گو بڑی حد تک مسیحی مشنریوں کے غلط پروپاگنڈا پر عاید ہوتی ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو ایک حد تک ہمارے مذہبی علماء و رہنما بھی اس کے ذمہ دار ہیں، کیونکہ انھوں نے کبھی کھل کر کوئی بات ایسی نہیں بتائی جس سے مذہبی آزادی کے سلسلہ میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر سامنے آجاتا - اس وقت سورۂ الحج کی ایک آیت میرے سامنے ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

"اذن للذین یقتلون بانہم ظلموا وان اللہ علی نصرہم لقدیر - اللذین اخرجوا من دیارہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا"

(یعنی جنگ کی اجازت انھیں کو حاصل ہے جن پر ظلم کیا جائے اور وہ اپنے دفاع پر مجبور ہوں - اللہ ایسے مظلوموں کی مدد کرتا ہے جو صرف اس لئے بے گھر کئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتے ہیں اور اگر اللہ ان کی مدد نہ کرتا تو تمام مذہبی ادارے (گرجا، خانقاہیں اور مسجدیں) جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے تباہ ہوجاتے)

آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں صرف مسجدوں ہی کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ غیر مسلم مذہبی عبادتگاہوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے باب میں اسلام کا نقطۂ نظر کتنا روادارانہ ہے اور وہ دوسرے مذاہب کا احترام کرنے میں وہ کس درجہ کشادہ دل واقع ہوا ہے - پھر اسی کے ساتھ آپ لا اکراہ فی الدین

کو بھی سامنے رکھئے تو اس امر کی تصدیق مزید ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام مذہب کے باب میں کسی جبر و اکراہ کا قایل نہیں۔

اسلام کا نظریۂ جنگ ۔ آپ رسول اللہ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کوئی جنگ جارحانہ نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنے دفاع پر مجبور ہو کر تلوار اٹھائی سب سے پہلی جنگ بدر اسوقت عمل میں آئی جب کفار قریش نے مدینہ میں بھی آپ کو اور مہاجرین و انصار کو رہنا دشوار کر دیا تھا۔ اس کے بعد جنگ احد میں بھی یہی ہوا کہ کفار قریش نے مدینہ پر یلغار کر دی اور مسلمانوں کو محض اپنے تحفظ کے لئے صف آرا ہونا پڑا۔ پھر جنگ احزاب میں بھی یہی ہوا کہ تمام بدوی قبایل اور یہود نے مل کر مدینہ پر چڑھائی کر دی اور رسول اللہ کو مجبور ہو کر اپنا دفاع کرنا پڑا۔ مکہ کی فتح بھی کسی جارحانہ جنگ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد محض کفار قریش کی بد عہدی کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح حنین و تبوک کی لڑائیوں کا مقصود بھی صرف اپنا دفاع و تحفظ تھا۔ الغرض رسول اللہ نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی جنگ اس غرض سے نہیں کی کہ وہ اسلام لانے پر کسی کو مجبور کریں یا کسی حصۂ زمین پر قابض ہو جائیں ۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین کا بھی مسلک یہی رہا۔ رسول اللہ کے بعد جب جذبات بغاوت عام طور پر رونما ہونے لگے اور دشمنوں نے مختلف مقامات میں مسلمانوں کا خون بیدردی سے بہانا شروع کیا تو حضرت ابوبکر نے مجبوراً باغی جماعتوں کے خلاف قدم اٹھایا۔ بحرین، عمان، یمن اور حضرموت سب جگہ یہی ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں اور ان کو دبانے کے لئے خلیفۂ اول نے فوجکشی کی۔ چونکہ ان بغاوتوں میں روم و ایران کی بھی ہمدردی و اعانت شامل تھی اس لئے ان سے بھی آویزش شروع ہو گئی .... اور اس کا سلسلہ عرصہ تک بعد کو بھی چلتا رہا ۔ بعد کو حضرت عمر کے زمانہ میں جب عراق عجم پر فوجکشی کی نوبت آئی تو وہ بھی محض مجبوری تھی، چنانچہ آپ نے فتح عراق کو جس نظر سے دیکھا اس کا اندازہ آپ کو خود ان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے کہ "کاش ہمارے اور عراق کے درمیان آگ کا ایک پہاڑ حایل ہوتا"۔ میور نے لکھا ہے کہ جب زیاد نے فتح عراق کے بعد ایرانی افواج کے تعاقب میں خراسان کی طرف بڑھنے کی اجازت حضرت عمر سے طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ عراق و ماوراء عراق میں پہاڑ حایل ہو جائیں کہ نہ اہل ایران ہم تک پہونچ سکیں نہ ہم ان تک ۔ عراق ہماری ضرورتوں کے لئے کافی ہے ۔ میں فتوحات و مال غنیمت کے مقابلہ میں اپنے لوگوں کی سلامتی زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ حضرت عمر نے سنہ ۱۶ھ میں فرمائے تھے جب شام و عراق دونوں فتح ہو چکے تھے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود ان کامیابیوں کے بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا جذبہ ان میں پیدا نہ ہوا تھا اور حضرت ابوبکر کے زمانہ سے لے کر خلافت حضرت عمر کے تیسرے سال تک جو لڑائیاں مسلمانوں نے لڑیں ان کا تعلق مذہب یا اشاعت مذہب سے نہیں بلکہ صرف زمین عرب کے تحفظ سے تھا۔ چنانچہ جسوقت آپ کو ایرانی افواج کے خلاف مسلمانوں کی فتح کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک بڑا موثر خطبہ دیا جس کے یہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں کہ "اب سرزمین اسلام ایرانیوں سے محفوظ ہو گئی"۔ اگر مسلمانوں کا مقصود صرف ملک گیری ہوتا تو اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔ ایرانی شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو چکے تھے اور ان کا تعاقب کر کے تمام ایران کو اسی وقت بہ آسانی فتح کیا جا سکتا تھا، لیکن حضرت عمر نے اسے پسند نہیں کیا اور اس کے بعد جب ایران فتح ہوا تو اس کا سبب بھی خود انھیں کا جذبۂ غیظ و انتقام تھا جس نے بار بار انھیں اسلام کے خلاف ابھارا اور مسلمانوں کو مجبوراً ان سے جنگ کرنا پڑی ۔ سنہ ۱۴ھ میں جب جنگ قادسیہ کے موقع پر مشہور ایرانی سپہ سالار رستم میدان جنگ میں آیا تو اس کے الفاظ یہ تھے کہ "آج میں سارے عربستان کو غارت و پامال کر کے رکھ دوں گا"۔ حالانکہ ایرانی افواج اس سے قبل بار بار شکست پر شکست کھا چکی تھیں۔ برخلاف اس کے جب مسلم افواج کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھیں تو حضرت عمر نے انھیں مزید اقدام سے صرف اس لئے روک دیا تھا کہ مسلمانوں کا مقصود ایران کو غارت و پامال کرنا نہ تھا بلکہ صرف عربستان کو ان کے خطرہ سے محفوظ رکھنا پیش نظر تھا۔

اسلام، جزیہ یا تلوار ۔ کہا جاتا ہے کہ جب مسلم نمایندے شرایط صلح طے کرنے روانہ کئے جاتے تھے تو وہ فریق ثانی کے سامنے صرف تین باتیں پیش کرتے تھے، اسلام، جزیہ یا تلوار ۔ اور اس سے عموماً یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا، حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے ۔ مسلمان جب کسی جنگ میں کامیاب ہوتے تھے تو وہ فریق مغلوب کے سامنے صرف یہ شرط پیش کرتے تھے کہ وہ حکومت کے وفادار رہیں اور جنگ میں دوش بدوش مسلمانوں کے شریک رہیں لیکن اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر جزیہ ادا کریں (جسکی مقدار ڈیڑھ دو روپیہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی) اور اس طرح ان کے جان و مال کی حفاظت حکومت پر فرض ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں نے مفتوح اقوام کو کبھی اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ لوگ مسلمانوں کے اخلاق اور اسلام کی سادگی کو دیکھ کر خود ہی اصول اسلام قبول کر لیتے تھے ۔ یہ خیال کہ مسلمان فاتح سب سے پہلے شرط قبول اسلام کی پیش کرتے تھے اس لئے بھی ناقابل قبول ہے کہ مسلم افواج میں نصاریٰ کے خلاف خود نصاریٰ بھی شامل ہوتے تھے اور وہ کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ اپنے ہم مذہب افراد کا صرف مذہب بدلنے کے لئے مسلمانوں کا ساتھ دیں۔

پلان سے کیا ہوگا

روزگار کے زیادہ مواقع

تیسرے پنج سالہ پلان سے

- بھرپور کھیتی اور زمین کو ترقی دینے کی بدولت ۳۵ لاکھ افراد کو زراعتی حلقے میں روزگار ملے گا اور
- ۱.۵ لاکھ افراد کو صنعت، ٹرانسپورٹ، تجارت، سرکاری اور سماجی خدمات سے متعلق شعبوں میں روزگار حاصل ہوگا

اس کے معنی یہ ہوئے کہ
آپ کو روزگار کے نئے اور بہتر مواقع
حاصل ہوں گے

پلان کو کامیاب بنایئے۔ اس کا نتیجہ ہوگا

ہر شخص کے لئے اچھی زندگی

تیسرا پنج سالہ پلان

رسمِ غلامی اور اسلام

(لونڈیوں کا مسئلہ)

(نیاز)

غلامی بڑی قدیم رسم ہے اور اس کا آغاز اسی وقت سے ہوگیا تھا جب کوئی قوی قبیلہ کسی ضعیف قبیلہ پر غلبہ پاکر اس کے افراد کا بھی مالک ہو جاتا تھا اور ان سے جو کام چاہے لے سکتا تھا، یہاں تک کہ بازار میں دوسری اجناس کی طرح ان کی خرید و فروخت بھی ہوسکتی تھی۔ اس کو تاوانِ جنگ کہئے، حقِ استبداد .Share Moment کہئے، یا کچھ اور، یہ رسم صرف عربوں ہی میں نہیں، زمانۂ قدیم سے مصر، بابل، اشور، روم و ایران میں بھی رائج تھی۔ خصوصیت کے ساتھ روما میں تو اس کا رواج اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہاں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو غلاموں یا لونڈیوں سے خالی ہو، ان میں زیادہ تعداد جنگ سے حاصل کئے ہوئے قیدیوں یا ان کے اولاد کی ہوتی تھی یا خریدے ہوئے غلاموں کی۔ لونڈیوں میں جو زیادہ حسین ہوتی تھیں، ان سے جنسی اغراض بھی پوری کی جاتی تھیں اور مرد غلاموں میں جو اپنی ذہنیت کے لحاظ سے پست درجہ کے ہوتے تھے، ان سے صرف گھر کی خدمت کی جاتی تھی یا کھیتی کے کاموں میں لگا دیا جاتا، لیکن جن غلاموں میں مختلف پیشوں کے سیکھنے کی صلاحیت ہوتی تھی، ان کو ویسی ہی تعلیم دی جاتی تھی اور پھر انھیں فروخت کردیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں وہاں غلاموں کے متعدد بازار قایم ہوگئے تھے، جہاں دوسری جناس کی طرح لونڈیوں اور غلاموں کا سودا ہوتا تھا، یہاں تک کہ بعض تعلیم یافتہ اور ہنرمند غلام چار چار ہزار میں فروخت ہوتے تھے۔

یہی سلوک فارس میں ترک قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور چونکہ ترک غلام زیادہ حسین ہوتے تھے اس لئے ان کو ہدیہ و تحفہ کے طور پر بھی امراء اور معاصر فرمانرواؤں کے پاس بھیجا جاتا تھا۔

چنانچہ ایک بار پرویز شاہ فارس نے ماریطیس فرمانروائے روما کے پاس ایک ہزار ترکی غلام بھیجے جن میں سے ہر ایک کے کان میں سونے کی بالی پڑی ہوئی تھی اور ہر بالی میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں روما کی طرف سے بیس نہایت حسین لونڈیاں پیش کی گئیں جن میں سے ہر ایک کے سر پر جڑاؤ تاج تھا۔

بالکل یہی رواج عرب میں بھی پایا جاتا تھا اور یہاں بھی غلاموں اور لونڈیوں کی کمی نہ تھی، ان میں اکثر تو وہ تھے جو جنگ کے بعد ہاتھ آئے تھے اور کچھ وہ جنھیں حبش اور دوسرے پڑوسی ملکوں سے خریدا جاتا تھا۔

عرب میں بھی غلاموں کے خرید و فروخت کا بڑا کاروبار تھا، اور قریش کی تجارت بھی بڑی حد تک بردہ فروشی پر منحصر تھی۔ جب کوئی شخص بازار میں کسی غلام کو خرید لیتا تھا تو جانوروں کی طرح اس کی گردن میں رسّی ڈال کر گھر لے جاتا تھا۔

جو غلام جنگ میں ہاتھ آتے تھے، انھیں اپنی آزادی کے لئے فدیہ کی رقم کما کر دینا پڑتی تھی اور جن غلاموں سے کاشت کا کام لیا جاتا تھا تو زمین کے ساتھ ان کا بھی سودا ہو جاتا تھا۔ اس رواج کی کثرت و عمومیت کا یہ حال تھا کہ ذوالکلاع فرمانروائے حمیر نے جب حضرت ابوبکر کے پاس اپنا وفد بھیجا تو ایک ہزار غلام بھی ساتھ تھے۔ اس وقت عرب کا کوئی خوشحال گھرانا ایسا نہ تھا جو غلاموں سے

خالی ہو اور ان کی محنت سے فایدہ نہ اُٹھاتا ہو، یہاں تک کہ لونڈیوں سے بھی پیشہ کرا کے روپیہ حاصل کیا جاتا تھا۔
غلاموں کی ایک اور قسم بھی تھی جسے موالی کہتے تھے۔ یعنی وہ غلام جسے آزاد کر دیا گیا ہو یا جنے اپنی آزادی فدیہ دے کر حاصل کرلی ہو۔ آزاد شدہ غلاموں کی یہ قسم روم میں بھی پائی جاتی تھی جنھیں Libertine کہتے تھے۔
یہ رنگ تھا ادارۂ غلامی کا، جب رسول اللہ پیدا ہوئے اور انھیں روایات کے ماحول میں آپ کا نشوونما ہوا۔ لیکن خود آپ نے بعثت سے قبل بھی کبھی رسم غلامی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور جب منصب نبوت آپ کو عطا ہوا تو زندگی کے معاشرتی مسایل کی اصلاح کے سلسلہ میں آپ نے اس طرف بھی توجہ فرمائی۔
غلامی کی رسم کا سب سے زیادہ مکروہ پہلو یہ تھا کہ اس میں ایک انسان کو انسان نہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ غلاموں کی نگہداشت گھوڑوں اور اونٹوں سے بھی کم ہوتی تھی اور سوسائٹی میں ان کا کوئی مقام نہ تھا، مرد غلام تو خیر محنت مزدوری کر کے، آقا سے کچھ نہ کچھ بہ سد رمق حاصل کر لیتا تھا، لیکن لونڈیاں چونکہ جسمانی محنت بھی نہ کر سکتی تھیں، اس لئے وہ زیادہ تر جنسی جذبات کی شکار رہتی تھیں خود اپنے آقا کی بھی اور دوسرے مردوں کی بھی جن سے اپنی عفت کی قیمت وصول کر کے مالک کے حوالہ کر دیتی تھیں۔
یہ ادارۂ فحاشی وہاں عام تھا اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن باوجودیکہ رسول اللہؐ کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی آپ نے ہمیشہ ان حالات پر اپنا دل دکھایا اور آخر کار آپ نے غلاموں کی سطح بلند کر کے "بندہ و آزاد" کی تفریق کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔
ظاہر ہے کہ کسی ملک و قوم کے دیرینہ رسم و رواج کو مٹانا آسان نہیں ہے، اس کو رفتہ رفتہ دور کیا جا سکتا ہے، اس لئے بعثت کے بعد آپ نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں اس مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور غلاموں کو آزاد کرنے، ان کو اپنے ساتھ کھلانے، اپنا سا کپڑا پہنانے اور اپنے عزیزوں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی (جس کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں متعدد جگہ پایا جاتا ہے) اور خود بھی اس پر عمل کیا۔
لونڈیوں کا مسئلہ چونکہ شہوت رانی سے تعلق رکھتا تھا اس لئے وہ زیادہ غور طلب تھا اور اتنا ہی دشوار بھی۔ اس لئے اس کو حل کرنے کے لئے زیادہ وقت اور زیادہ اثر کی ضرورت تھی، جب تک آپ مکہ میں رہے، ایک لمحہ آپ کی زندگی کا چین سے نہیں گزرا، اور اس مسئلہ پر غور کرنے کا موقع نہ ملا، لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور فی الجملہ سکون نصیب ہوا تو آپ نے اولین فرصت میں اس پر توجہ فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی:-

"وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم .... ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا لتبتغوا عرض الحیوۃ الدنیا" (سورۂ نور - ۳۲ - ۳۳)

(یعنی وہ لوگ جو غیر شادی شدہ ہیں اور وہ غلام (مرد و عورت دونوں) جو شادی کے قابل ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ نکاح کرلیں ..... اور لونڈیوں کو دنیاوی فایدہ کی غرض سے فحاشی پر مجبور نہ کیا جائے)
کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن ابی یہودی کے پاس (جو منافقانہ اسلام لے آیا تھا) متعدد لونڈیاں تھیں جن سے وہ بہ جبر کسب کرانا چاہتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضرت ابوبکر نے ان میں سے بعض لونڈیوں کو خرید کر آزاد کر دیا۔
قرآن پاک کے خصوصی احکام بھی عمومی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے اس آیت کی شان نزول چاہے کچھ ہو، یہ حکم اس وقت کے تمام مسلمانوں کے لئے تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ غیر شادی شدہ مرد و عورت خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، کنوارے نہ رہیں، ان کی شادی کر دی جائے۔

اس سے مقصود یہ تھا کہ لونڈیوں کے ساتھ بھی بغیر شادی کے جنسی تعلق نہ رکھنا چاہئے اور چونکہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع تھا اس لئے اب ان چار میں لونڈیاں بھی شامل ہوگئیں اور یہ الزام دور ہوگیا کہ اسلام نے تمام لونڈیوں سے بغیر نکاح کے جنسی تعلق جایز قرار دیدیا تھا۔

اسی کے ساتھ سورۂ نساء کی بھی ایک آیت ملاحظہ ہو:۔

"ومن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنٰت المومنات فمن ماملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنات"

(یعنی اگر تم (آزاد) مومن عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے تو اپنی مومن لونڈیوں سے نکاح کرلو)

اس آیت میں صاف صاف لونڈیوں سے شادی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بغیر نکاح کے جنسی تعلق رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بلکہ اسی کے ساتھ ضمناً یہ بھی ظاہر کردیا گیا کہ حُر (آزاد) عورت اور لونڈی میں کوئی فرق نہیں اگر وہ مومن ہیں۔

سورۂ احزاب اور سورۂ نساء کی ایک آیت ایسی ضرور ہے جس سے بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ لونڈیوں سے بغیر نکاح کے بھی قربت کی جاسکتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

"والذین ہم لفروجہم حافظون الاعلی ازواجہم اوماملکت ایمانہم من فتیاتکم المومنات"

(یعنی صالحین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے اعضاء شرم کی حفاظت کرتے ہیں سوا اپنی بیٹیوں اور (جنگی قیدی) لونڈیوں کے جو اسلام لاچکی ہیں)

اس میں شک نہیں کہ اس آیت میں بیویوں کے علاوہ (لڑائی میں حاصل کی ہوئی) لونڈیوں سے بھی جنسی تعلق کی اجازت دی گئی، لیکن یہ تعلق غیر ازدواجی ہوگا اس کا ذکر کہیں نہیں ہے — ایک آیت سورۂ احزاب کی اور ہے جس میں خود رسول سے خطاب کیا گیا ہے اور ان کی ازدواجی زندگی کے متعلق ہدایات درج ہیں:۔

یا ایہا النبی انا احللنا لک ازواجک اللتی آتیت اجورہن وماملکت یمینک مما افاء اللہ علیک ...

ان اراد النبی ان یستنکحہا وامراۃ مومنۃ ان وہبت نفسہا للنبی خالصۃ لک من دون المومنین"۔

(یعنی آپ کے لئے حلال ہیں آپ کی وہ بیویاں جن کا مہر آپ ادا کرچکے ہیں اور مال غنیمت کی لونڈیاں اور بغیر مہر ادا کئے ہوئے وہ مومن عورت بھی جو بلا طلب مہر آپ سے نکاح کرنا چاہے، اور یہ صرف آپ کے لئے ہے مخصوص ہے، عام مومنین کے لئے نہیں)

اس آیت سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ مال غنیمت کی لونڈیاں بغیر نکاح کے آپ پر حلال تھیں، لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ آیت متذکرۂ بالا میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ لونڈیاں بغیر نکاح کے آپ پر حلال تھیں بلکہ ازواج کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ ان سے بھی نکاح کیا جائے، چنانچہ بربنائے ملکیت کبھی رسول اللہؐ نے کسی لونڈی سے جنسی تعلق روا نہیں رکھا۔ مال غنیمت کی لونڈیوں میں صرف دو سے آپ نے یہ تعلق پسند کیا لیکن وہ بھی نکاح کے بعد۔ ایک صفیہ (جو خیبر کے یہودی سردار کی بیٹی تھیں) اور دوسری جویریہ (بنی مصطلق قبیلہ کی)۔ بلا ادائے مہر کے جس نکاح کا ذکر ہے اس واقعہ سے متعلق ہے، جب ایک خاتون "ام شریک روسیہ" نے اپنے آپ کو بغیر طلب مہر رسول اللہ کے نکاح میں آنا چاہا تھا۔ اس آیت میں "خالصۃ لک من دون المومنین" کا فقرہ البتہ غور طلب ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک خصوصیت بلا مہر کے نکاح سے متعلق ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ازواج نبی مخصوص ہیں صرف آپ ہی کی ذات کے لئے اور ان سے کوئی اور نکاح نہیں کرسکتا کیونکہ خود رسول بھی پابند کردئے گئے تھے کہ وہ اپنے ازواج میں سے کسی کو طلاق نہ دے سکتے۔ اسلام نے ادارۂ غلامی کے محو کرنے میں جس کوشش و تدبیر سے کام لیا اس کا اندازہ رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے اقوال و کردار سے بہ آسانی ہوسکتا ہے، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام میں بغیر نکاح کے لونڈیوں سے قربت کی اجازت دی جاتی جو ادارۂ غلامی کا مذموم ترین پہلو تھا۔

قدیم اُردو ڈرامہ کے ایک اہم فنکار

(سید محمد عبداللہ فتحپوری)

(فرمان فتحپوری)

اُردو ڈرامہ نے رہس، سوانگ، نقل، نوٹنکی اور قدیم ناٹک وغیرہ کی مختلف منزلیں طے کرکے موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ پھر بھی اس کی تاریخ بہت پُرانی نہیں ہے۔ ہرچند کہ برصغیر کی بعض قدیم زبانوں میں خصوصاً سنسکرت میں ڈرامہ ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ اور اس کے مزاج و ساخت سے اہلِ ہند کم و بیش واقف تھے۔ پھر بھی اُردو پر اُس کا اثر اُنیسویں صدی کے اواخر سے پہلے نظر نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ فارسی و عربی جنھوں نے اُردو ادب کو بلحاظ ہیئت و موضوع سب سے زیادہ متاثر کیا تھا ان میں ادبی ڈرامے کی کوئی ایسی صورت موجود نہ تھی جس کی تقلید ضروری خیال کی جاتی، یہی وجہ ہے کہ سرسید اور آزاد و حالی کے زمانہ میں جبکہ اُردو ادب کے دوسرے اصناف ترقی کے مختلف منزلیں طے کرکے ایک خاص نقطۂ عروج پر پہونچ گئے تھے۔ اُردو ڈرامہ ابتدائی منزلوں سے آگے نہ بڑھا تھا۔

اُردو ڈرامہ کا ابتدائی نقش واجد علی شاہ کی مثنوی افسانۂ عشق میں ملتا ہے جسے ۱۸۵۰ء میں رہس کی صورت میں تمثیل کیا گیا اور جس میں واجد علی شاہ نے ایک کردار کی حیثیت سے کام کیا، بعدازاں ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں اندرسبھا وجود میں آئی اور اس کی مقبولیت نے اودھ سے الگ دور دراز علاقوں کو بھی متاثر کیا، ادھر مغربی تمدن و ادب کے زیرِ اثر بنگال اور بمبئی میں پارسیوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں تھیٹر کی مختلف کمپنیاں قایم ہوئیں اور ۱۸۵۳ء و ۱۸۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں اُردو ڈرامے نے خاص شہرت حاصل کی لیکن باستثنائے چند ان ڈراموں میں بجز اس کے کہ وہ تمثیل کئے جاسکتے تھے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کی بناپر انھیں ادبی ڈرامہ کا نام دیا جاسکے پھر بھی ڈرامہ کو آگے بڑھانے اور فنی صورت دینے میں ان سے بڑی مدد ملی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ۱۸۷۹ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان جو منظوم ڈرامے لکھے گئے اور اسٹیج کئے گئے وہ پہلے کے مقابلہ میں بہت ترقی یافتہ تھے اور انھیں اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی "آغا حشر اور ان کے معاصرین" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> "آغا حشر اُردو ڈرامہ نگاری کے دورِ سوم کے ڈرامہ نویس تھے، اُن سے قبل افسوں مراد آبادی جوہر بنارسی، حباب رام پوری، سخا دہلوی، طالب بنارسی، ظریف اکبرآبادی، حافظ محمد عبداللہ فتح پوری، کریم بریلوی، حکیم نظامی اور نظیر بیگ وغیرہ اُردو ڈرامے کو پروان چڑھا کر اور ایک مستقل فن بناکر اُردو ادب کے دامن کو اپنے جواہر پاروں سے مالامال کرچکے تھے، ان ڈرامہ نویسوں میں جوہر، حباب، کریم، نظامی، عربی، فارسی اور اُردو کی استعداد میں آغا حشر سے بہت آگے تھے۔ رونق بنارسی، ظریف، طالب، محمد عبداللہ فتحپوری اور نظیر ڈرامائی صلاحیتوں میں حشر سے بہت اونچے تھے لیکن چونکہ انھوں نے انیسویں صدی کا زمانہ پایا جبکہ اُردو ڈرامہ نویسی کی کوئی وقعت

نہ تھی اس لئے خود کو ایک ڈرامہ نویس کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے شرماتے تھے۔"[1]

پروفیسر وقار عظیم، آغا حشر کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ :-

"زمانے کے ایک مشہور لکھنے والے حافظ عبد اللہ ہیں انھوں نے انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد رکھی یہ چتورا ضلع فتح پور ہسوہ کے رئیس تھے۔ اس کمپنی کے لئے بے شمار ڈرامے لکھے۔ جن ڈراموں کے اشتہار عموماً اُن کے ڈراموں کے ساتھ دئے جاتے تھے اُن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ حافظ عبد اللہ کے ڈراموں کی دو خصوصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ اُن میں سے اکثر پر پامال طبع درجے ہیں دوسرے حافظ عبد اللہ نے ہر ڈرامہ کے شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے۔۔۔۔ ان ڈراموں میں سے اکثر پر اندر سبھا کا گہرا اثر ہے، بعض کے مکالمے شروع سے آخر تک منظوم ہیں۔ بعض میں اکّا دکّا لفظ نثر کے آتے ہیں۔"[2]

مندرجۂ بالا سطور سے ان قدیم ڈرامہ نگاروں کی اہمیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے لیکن چند ایک کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کا مفصّل حال ہمیں نہیں معلوم خاص طور پر حافظ محمد عبد اللہ فتحپوری اور ان کے شاگرد خاص محمد عبد الوحید قیس فتحپوری کے متعلق اُردو ڈرامہ کی تاریخوں میں چند سطروں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

محمد عمر نور الٰہی نے اپنی کتاب میں امپیریل تھیٹر کمپنی اور لائٹ آف انڈیا کمپنی کے سلسلہ میں حافظ محمد عبد اللہ کے بارے میں اس قدر لکھا ہے کہ :-

"یہ دو کمپنیاں صرف اس لئے مشہور ہیں کہ ان کمپنیوں کے دو اکٹروں حافظ محمد عبد اللہ رئیس چتورہ اور ان کے شاگرد نظیر اکبر آبادی نے چند طبع زاد ڈرامے لکھے اور بہت سے پُرانے ڈھانچے بدل کر اپنے نام سے منسوب کر دئے۔"[3]

بادشاہ حسین نے رونق بنارسی، ظریف، حافظ محمد عبد اللہ، نظیر بیگ، عبد الوحید قیس، طالب بنارسی، احسن اور بیتاب کو اپنی کتاب میں طرز قدیم کے علمبرداروں میں شمار کیا ہے، لیکن وہ بھی محمد عبد اللہ اور عبد الوحید قیس کے متعلق بالترتیب صرف اتنا لکھتے ہیں کہ :-

"حافظ محمد عبد اللہ زمیندار لمبور دلائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی کے مشہور اداکار تھے۔ دار کاری کے علاوہ ڈرامہ نگاری کی خدمت بھی انھیں کے ذمہ تھی۔ حسب ذیل ڈرامے ان کے نام سے مشہور ہیں۔"[4]

"محمد عبد الوحید قیس متوطن چتورہ ضلع فتحپور ہسوہ کے نام سے حسب ذیل ڈرامے مشہور ہیں۔"[5]

عشرت رحمانی کا بیان البتہ اس سلسلہ میں پہلے دو مصنفین کے مقابلہ میں قدرے مفصل اور افادی ہے لیکن انھوں نے بھی محمد عبد اللہ پر صرف ایک صفحہ اور عبد الوحید قیس پر نصف صفحہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے، اس میں بھی بعض بیانات غلطی سے خالی نہیں ہیں اور صاف پتہ دیتے ہیں کہ انھیں بھی پہلے دو مصنفین کی طرح محمد عبد اللہ اور عبد الوحید قیس سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ ورنہ کم از کم وہ یہ بات نہ لکھتے کہ :-

"عبد الوحید، حافظ محمد عبد اللہ کے ہمعصر اور کسی حد تک ہموطن و ہم مشرب تھے۔"[6]

اس لئے کہ عبد الوحید قیس کسی حد تک ہم عصر و ہم وطن اور ہم مشرب نہیں بلکہ حافظ محمد عبد اللہ کے شاگرد خاص ہونے کے ساتھ انکے حقیقی بھتیجے اور داماد بھی تھے غرض اُردو ڈرامہ پر اب تک جو کتابیں آئی ہیں اُن میں اگرچہ حافظ محمد عبد اللہ اور انکے شاگرد عبد الوحید قیس

---

[1] نوائے ادب جولائی ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۵ - [2] آغا حشر اور اُن کے ڈرامے - [3] ناٹک ساگر صفحہ ۳۷ - [4] اُردو میں ڈرامہ نگاری صفحہ ۱۱۷ ، [5] اُردو میں ڈرامہ نگاری صفحہ ۱۱۹ - [6] اُردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید صفحہ ۲۲۳ و ۲۲۲ -

کو قدیم اُردو ڈرامہ کے علمبرداروں میں شمار کیا گیا ہے ۔ لیکن ان کے حالات و کمالات فن پر کسی نے مفصل قلم نہیں اُٹھایا اس لئے ان کے متعلق جو کچھ میرے علم میں ہے مضمون کی شکل میں لا رہا ہوں شاید اس سے ڈرامہ سے دلچسپی رکھنے والے اور اس پر کام کرنے والوں کو کوئی مدد ملے ۔

حافظ محمد عبداللہ دراصل موضع چتورہ ضلع فتحپور ہسوہ کے ایک مقتدر و متمول سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کے موث اعلےٰ محمد مسلم نامی ایک بزرگ تھے جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے ہمراہ برصغیر میں داخل ہوئے اس وقت ان کی عمر کوئی چالیس سال کی تھی محمد مسلم کی زوجہ بی بی زہرہ کا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق سے ملتا تھا ۔ انھیں کے بطن سے حضرت شاہ پیدا ہوئے، جن کی شادی اسی زمانے کے ایک بزرگ محمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی، محمد شاہ بھی خواجہ معین الدین اجمیری کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئے تھے ۔ اوران کا سلسلۂ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر سے ملتا تھا ۔ انھیں حضرت شاہ کی اولاد میں سید محمد عبداللہ بن الٰہی بخش تھے ۔

محمد عبداللہ کے والد منشی الٰہی بخش اپنے زمانے کے علوم مروجہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے ۔ اور اپنے علاقے کے بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں منصفی کے عہدے پر فایز تھے ۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت وہ مین پوری میں تھے انھوں نے جنگ آزادی میں حکومت کے خلاف اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا ۔

چنانچہ بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور انھیں ان کے آبائی وطن چتورہ سے گرفتار کرکے شہر فتح پور لایا گیا اور ۱۳ رجمادی الاول سنہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۳۱ ردسمبر سنہ ۱۸۵۷ء کو بروز پنجشنبہ بوقت عصر پھانسی دیدی گئی ۔ چتورہ میں اب تک منشی الٰہی بخش کی بنوائی ہوئی خوبصورت مسجد موجود ہے ۔ جو سنہ ۱۲۶۳ھ میں تعمیر ہوئی تھی اور عبدالوحید قیس کا لکھا ہوا یہ فارسی قطع تاریخ اس پر کندہ ہے :-

شیخ الٰہی بخش منصف نیک رائے	در چتورا ساخت نو خانہ خدائے
ہاتف از تاریخ سالش مژدہ داد	شد چوں بیت اللہ مسجد دلکشائے

منشی الٰہی بخش کے ایک لڑکی اور پانچ لڑکے تھے لڑکی کا نام ظہور النساء اور لڑکوں کے نام محمد عبدالشکور، محمد عبدالغفور، محمد عبداللہ، سید محمد نظیر اور سید محمد عبدالرحمٰن تھے ان میں سید محمد عبداللہ اور ان کے بھتیجے سید محمد عبدالوحید قیس بن عبدالغفور نے آگے چل کر ڈرامہ نویس اور اداکار کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی ۔

سید محمد عبداللہ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ عربی و فارسی کے عالم تھے اور شعر و سخن سے بھی خاص لگاؤ تھا ۔ شاعری میں وہ حافظ تخلص کرتے تھے ۔ اور منظوم ڈراموں کے سوا مثنویاں اور غزلیں بھی کہتے تھے ۔ لیکن ان کا نام شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈرامہ نویسی اور اداکاری کی صلاحیتوں کی وجہ سے زندہ ہے ۔ حافظ محمد عبداللہ پہلے لائٹ آف انڈیا تھیٹر کمپنی سے منسلک تھے، اور اس میں ڈرامہ نویسی کے ساتھ اداکاری کا کام بھی کرتے تھے ۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے دی امپیریل تھیٹر کمپنی آف انڈیا کے نام سے ایک کمپنی قایم کی جس کے وہ مینیجنگ ڈائرکٹر اور مالک بھی تھے ، اس کمپنی نے برصغیر میں خاص شہرت حاصل کر رکھی تھی اور اس کا شمار اس دور کی نہایت اہم کمپنیوں میں کیا جاتا تھا ۔ حافظ محمد عبداللہ اور عبدالوحید قیس کے مطبوعہ ڈراموں کے بعض دیباچوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کمپنی کا مرکزی دفتر خاص فتحپور ہسوہ تھا اور کمپنی تماشا دکھانے کے لئے دور دراز کے اضلاع مثلاً فرخ آباد، کانپور، الٰہ آباد، آگرہ، میرٹھ، فیض آباد، دلّی، لکھنؤ وغیرہ تک جاتی تھی ۔

اس کمپنی کے ڈرامہ نویسوں اور اداکاروں نے کن مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا اور ان کے تماشا دکھانے کی کیا شرایط تھیں؟ اتفاق سے وہ بھی بعض مطبوعہ ڈراموں کے آخر میں بطور اشتہار دی ہوئی ہیں ۔ ان کے دیکھنے سے اس کمپنی کی شہرت، وقعت اور معیار کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ایک اشتہار کا اقتباس دیکھئے :-

" اس کمپنی کے تقرر کا یہ منشا ہے کہ اہل ہند کو افعال قبیحہ کے بدنتائج اور اعمال حسنہ کے نیک و بد ثمر سے بذریعہ

فن نامک نصیحتاً دکھلایا جائے اور جملہ امور جو بغرض حصول منشا مذکور اس سے متعلق عمل میں آئیں۔ اس کمپنی نے اکثر ایسے ہی تماشے جو عمدہ نتیجے بخشتے ہیں کتب و تاریخ و قصص معتبرہ سے لئے ہیں، ان کے مضامین عربی - ہندی اور انگریزی عروض کی مختلف بحروں میں بزبان اُردو نظم کئے ہیں...... یہ کمپنی عموماً ٹکٹ پر تماشہ دکھلاتی ہے مگر طلب فرمانے پر روسائے نامدار کے در دولت پر بھی جاتی ہے۔ انگریزی علمداری و ریلوے سفر میں باستثنائے میلوں کے اخراجات طلبی کمپنی بابت طیاری اسٹیج پانسو روپیہ اور بابت کرایہ باربرداری فی میل پانچ روپیہ اور تاریخ روانگی سے یوم واپسی تک جن راتوں میں تماشہ نہ ہو سکے، فی شب پچاس روپیہ مقرر ہے اور معمولی اُجرت چار تماشوں کے لئے ایک ہزار روپیہ ہے۔ انعام و اکرام رئیس کی ہمت و قدر دانی پر منحصر ہے۔ اطلاع طلبی کم از کم ایک ماہ پیشتر ضروری ہے اور پانچ سو روپیہ پیشگی کا دستور ہے مگر جہاں میلوں اور ہندوستانی علمداریوں میں یا جہاں ریلوے ابھی نہیں ہے، کل اخراجات و اُجرت و محصول مندرجہ اشتہار بذا البشرح دوچند ہوگی...... جو صاحب اس کمپنی سے خط و کتابت کیا چاہیں وہ اپنا مکاتبہ بمقام شہر فتحپور ہسوہ محلہ قضیانہ پاس جناب حافظ عبدالغفور صاحب رئیس و زمیندار چتورہ و مالک مطبع لامع النور کے روانہ فرمائیں۔[1]

اس تفصیل سے کمپنی کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ محمد عبداللہ کو اُردو ڈرامہ سے فطری شغف تھا اور انھوں نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر رکھی تھی، ان کے والد الٰہی بخش جو زمینداری اور جائداد یا نقدی اثاثہ چھوڑا تھا حافظ محمد عبداللہ نے سب کا سب ڈرامے کے فروغ میں صرف کر دیا۔ انھوں نے ڈرامہ نویسی اور اداکاری دونوں میں کمال بہم پہونچایا۔

ڈاکٹر نامی نے آغا حشر اور ان کے معاصرین کے ذکر میں لکھا ہے کہ حافظ محمد عبداللہ میں آغا حشر اور معاصرین کے مقابلہ میں ڈرامہ کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ حافظ عبداللہ کے سارے ڈرامے جیساکہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں، ان میں سے بعض اکثر اپنے زمانے کے دوسرے مروجہ ڈراموں سے ماخوذ ہیں اور کچھ مروجہ قصے کہانیوں سے مرتب کئے گئے ہیں لیکن اس میں حافظ عبداللہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کے سارے ڈرامہ نویس بالعموم یہی کرتے تھے جس طرح اُردو نثر و نظم میں عشقیہ افسانے مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، ہیر رانجھا، گل بکاولی، شہزادہ بے نظیر بدر منیر کے افسانے مختلف شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر لکھے ہیں۔ بالکل اسی طرح اس قدیم ڈرامہ نگاروں نے بھی مشہور و مقبول افسانوں اور تاریخی قصوں کو ڈراموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مصنفوں کے یہاں ایک ہی عنوان کے ڈرامے ملتے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ اس زمانہ کے ڈرامہ نویس صرف ایک دوسرے کے ڈراموں کا چربہ اُتارتے تھے درست نہیں ہے ہوتا یہ تھا کہ ہر کمپنی اور ہر ڈرامہ نگار اپنے معاصر ڈرامہ نگاری اور کمپنی کے کارناموں پر نظر رکھتی تھی اور ان سے سبقت لیجانے کی غرض سے ان قصوں اور ڈراموں کو دوبارہ طیار کراتی تھی جو عام طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ محمد عبداللہ نے بھی اکثر انھیں ڈراموں کو از سرِ نو لکھا ہے جو قبول عام حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے دیباچوں میں اس بات کی صراحت کر دی ہے۔ کہ ان کے ڈراموں کا موضوع یا موضوع کا کوئی فرد کس قصہ یا ڈرامہ سے ماخوذ ہے۔

حافظ محمد عبداللہ کے مطبوعہ ڈراموں میں ان کی تصنیف یا تالیف کی جو فہرستیں بطور اشتہار ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً

---

[1] دلپسند عالم المعروف بہ فتنۂ عالم مولفہ محمد عبداللہ مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع جولا پرکاش میرٹھ، مطبع دوم ورحم داد معروف بہ جفائے ستمگر۔

[2] مولفہ عبدالوحید قیس مطبع لامع النور ۱۸۹۲ء مملوکہ راقم الحروف۔

پاس منظوم ڈرامے انھوں نے لکھے تھے[۱] لیکن شاید سب کے سب محفوظ نہیں رہے ۔ بادشاہ حسین اور عشرت رحمانی نے اپنی کتابوں میں بلا کسی تفصیل و تبصرہ کے محمد عبداللہ کے سولہ مطبوعہ ڈراموں کے نام دئے ہیں ۔ لیکن یہ تعداد بہت کم ہیں ۔ میرے پاس سید محمد عبداللہ کے ۲۴ مطبوعہ ڈرامے موجود ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے :-

۱ - تحفۂ سیزدہم صدی معروف بہ فتنۂ ونتیجہ بدی مرقومہ ستمبر ۱۸۸۱ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء مطبع لامع النور فتح پور، طبع سوم۔
۲ - تماشائے دلپسند یر معروف بے نظیر و بدر منیر مرقومہ دسمبر ۱۸۸۱ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء مطبع الٰہی آگرہ طبع سوم۔
۳ - فسانۂ غمگیں معروف بہ عشق فرہاد وشیریں مرقومہ دسمبر ۱۸۸۱ء مطبوعہ ۱۸۹۶ء مطبع الٰہی آگرہ ۔
۴ - وقائع دلگیر معروف بہ عشق رانجھا وہیر مرقومہ دسمبر ۱۸۸۱ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء مطبع الٰہی آگرہ طبع سوم ۔
۵ - ستم ہامان وفریب شیطان مرقومہ جنوری ۱۸۸۲ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء مطبع الٰہی آگرہ طبع چہارم ۔
۶ - سخاوت حاتم طائی یا عشق شیر شاہ - مرقومہ مارچ ۱۸۸۲ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء ۔ مطبع الٰہی طبع سوم۔
۷ - ہوائی مجلس و ہفت نیرنگ معروف بہ عجائبات پرستان قسم قسم مرقومہ مارچ ۱۸۸۳ء مطبوعہ ۱۸۹۵ء ۔ مطبع الٰہی طبع سوم۔
۸ - بزم منیر و سلطان معروف بہ جشن پرستان مرقومہ اپریل ۱۸۸۳ء مطبوعہ ۱۸۹۳ء مطبع لامع النور فتح پور طبع اول ۔
۹ - سوانح قیس مفتوں معروف بہ عشق لیلیٰ مجنوں مرقومہ اپریل ۱۸۸۵ء مطبوعہ ۱۸۹۱ء مطبع الٰہی طبع چہارم ۔
۱۰ - ظلم عمران مردود یعنی عدل سلطان محمود مرقومہ اپریل ۱۸۸۵ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع الٰہی طبع دوم
۱۱ - مرقع مہر انگیز و قباد معروف بہ نقش سلیمانی و بہشت شداد مرقومہ نومبر ۱۸۸۵ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع لامع النور طبع دوم۔
۱۲ - شکنتلا اردو مرقومہ نومبر ۱۸۸۵ء مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع الٰہی اکیسویں بار ۔
۱۳ - انجام ستم عرف ظلم اظلم ۔ مرقومہ جنوری ۱۸۸۶ء مطبوعہ مطبع الٰہی آگرہ ۱۹۱۲ء طبع چہارم ۔
۱۴ - ضیائے عالم و نور جہاں مرقومہ اپریل ۱۸۸۶ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع لامع النور فتح پور طبع اول ۔
۱۵ - پسندیدہ آفاق معروف بہ علی بابا و چہل قزاق مرقومہ اپریل ۱۸۸۶ء مطبوعہ ۱۸۸۹ء طبع الٰہی آگرہ طبع چہارم ۔
۱۶ - دل پسند عالم معروف بہ فتنۂ و غانم مرقومہ مئی ۱۸۸۶ء مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع جوالا پرکاش میرٹھ طبع دوم ۔
۱۷ - ذخیرۂ عشرت معروف بہ اندرسبھا مرقومہ جون ۱۸۸۶ء مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع الٰہی آگرہ طبع پنجم ۔
۱۸ - گنجینۂ محبت بہ طلسم الفت دوم مرقومہ جون ۱۸۸۸ء مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع الٰہی طبع دوم
۱۹ - گنجینۂ محبت معروف بہ طلسم الفت دوم مرقومہ جون ۱۸۸۵ء مطبوعہ ۱۸۹۶ء مطبع الٰہی طبع دوم ۔
۲۰ - خون عاشق خاں باز معروف بہ جفائے مست ناز مرقومہ نومبر ۱۸۸۶ء مطبوعہ ۱۸۹۸ء مطبع الٰہی آگرہ طبع دوم ۔
۲۱ - پولیس ڈراما، مرقومہ جولائی ۱۸۸۹ء مطبوعہ ۱۸۹۱ء مطبع لامع النور فتح پور طبع اول
۲۲ - ثمرہ نیک و بد معروف بہ عشق بکاولی و تاج الملوک مرقومہ اپریل ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۳ء مطبع لامع النور طبع اول ۔
۲۳ - عطائے سلطنت فی سبیل اللہ معروف بہ خدادوست بادشاہ مرقومہ اپریل ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۱ء مطبع لامع النور طبع اول
۲۴ - مآل غرور عرف چندا حور خورشید نور مرقومہ و مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع الٰہی طبع اول ۔

ان میں سے پولیس ڈراما کے متعلق ایک نہایت دلچسپ واقعہ مشہور ہے، الہ آباد کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس حافظ عبداللہ

---

[۱] ملاحظہ ہو تماشائے دلپسند یر معروف بہ بے نظیر و بدر منیر مرقومہ ۱۸۸۱ء و مطبوعہ ۱۸۹۹ء طبع سوم مطبع الٰہی آگرہ مملوکہ راقم الحروف۔

کے ڈراموں اور ان کی کمپنی کے کارناموں سے بہت متاثر تھا اس نے سید عبداللہ سے خواہش ظاہر کی کہ کمپنی کے ایک ڈائرکٹر اور حصہ دار کی حیثیت سے اس کی بیگم کا نام بھی شامل کرلیا جائے لیکن حافظ عبداللہ چونکہ ایک خاص قسم کا زمیندارانہ مزاج رکھتے تھے اور اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے آگے کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا، انگریز ایس۔ پی ایک محکوم ڈرامہ نگار کے اس انکار و جسارت سے سخت برہم ہوا اور حافظ عبداللہ اور ان کی کمپنی کو نقصان پہونچانے کے لئے مواقع تلاش کرنے لگا۔ حافظ عبداللہ کی کمپنی کسی طرح کسی قانونی گرفت میں نہ آسکی لیکن جب یہ پولیس ڈرامہ الہ آباد میں دکھا رہا تھا تو اس انگریز ایس۔ پی کے اشارے سے اسٹیج کو آگ لگوادی گئی۔ سارا اسٹیج جل گیا۔ ہزاروں روپیہ کا ساز و سامان، فرنیچر، شامیانہ۔ زیورات۔ ملبوسات و آلات موسیقی وغیرہ جل کر خاک ہوگئے۔ انگریز ایس۔ پی نے گویا حافظ عبداللہ کی کمر ہمیشہ کے لئے توڑدی۔ اس لئے کہ ازسرِنو کمپنی کو ساز و سامان سے لیس کرنا آسان کام نہ تھا، لیکن حافظ عبداللہ نے شکست نہیں کھائی انھوں نے زمینداری گرو رکھ کر اور کچھ روپیہ قرض لے کر اسی روز نیا ساز و سامان خریدا اور اگلی شب کو اسی جگہ پر اسی آن بان کے ساتھ پھر تماشا دکھایا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ کو ڈرامہ سے خاص شغف تھا۔ وہ دُنیا کی ساری چیزیں چھوڑ سکتے تھے لیکن ڈرامہ نگاری اور اداکاری سے ہاتھ نہ اُٹھا سکتے تھے جب تک حیات رہے اس مشغلہ کو اپنائے رہے، اور اپنے بعد اپنے شاگردوں کا ایسا گروہ چھوڑ گئے جو ڈرامہ کے فن کو آگے بڑھاتا رہا۔ سید عبداللہ کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا ہے۔

حافظ عبداللہ کے شاگردوں میں دو ڈرامہ نگار اور اداکار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک نظیر بیگ اکبرآبادی، دوسرے محمد عبدالوحید قیس فتح پوری، نظیر بیگ اور عبدالوحید قیس فتح پوری دونوں نے اس فن میں استاد کی طرح شہرت حاصل کی اور تاریخ ادب میں اپنے نام یادگار چھوڑ گئے۔ نظیر بیگ نے اپنا پہلا افسانہ سید محمد عبداللہ ہی کے مشورہ سے لکھا تھا اور اوّلاً وہ انھیں کی کمپنی میں بہ حیثیت ایکٹر ملازم تھے ــــ نظیر بیگ کا پہلا ڈرامہ فسانۂ عجائب معروف بہ جانِ عالم و انجمن آرا ہے۔

نظیر نے اپنا ڈرامہ ۱۸۸۸ء بمقام شہر فرخ آباد جبکہ وہ دی پارسی حویلی تھیٹر کمپنی آف بمبئی کے ڈائرکٹر تھے لکھا تھا۔ اس کے دیباچے میں وہ اپنی ڈرامہ نگاری کے شوق و آغاز کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"انڈین امپیریل تھیٹر کمپنی شہر آگرہ میں اول مرتبہ ماہ دسمبر ۱۸۸۲ء آئی تو اس نے شائقین معنی آگاہ و ناظرین مہر نگار سے اپنی ہنرمندی کی داد پائی۔ مجھ کو تماشہ دیکھنے کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ ۵ دسمبر ۱۸۸۲ء میں بزمرہ ملازمان کمپنی مذکور داخل ہوگیا۔ جب سے برابر ایکٹر ہوں اور بالفعل اس کمپنی کے سب مڈل ایکٹروں میں اول نمبر ہوں چونکہ میرے آقائے نامدار جناب حافظ محمد عبداللہ صاحب زمیندار متخلص بہ حافظ رئیس چبوترہ و پروپرائٹر کمپنی ہذا کو شعر و سخن سے کمال ذوق ہے۔ اور تصنیف و تالیف ناٹک کا نہایت شوق ہے۔ لہٰذا میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں بھی کوئی ناٹک بطرز جدید ترتیب دوں اور اس کو دنیا کے یادوں میں اپنا یادگار چھوڑ دوں۔ میں نے یہ ناٹک جون ۱۸۸۸ء میں بمقام فرخ آباد باعانت آقائے ممدوح واسطے استعمال خاص انڈین امپیریل تھیٹر کمپنی ترتیب دے کر اسکو فسانۂ عجائب ناٹک معروف بہ جانِ عالم و انجمن آرا موسوم کیا اور معہ جملہ حقوق کمپنی مذکور کے نذر کردیا۔"[1]

عبدالوحید قیس فتح پوری، حافظ عبداللہ کے حقیقی بھتیجے اور داماد تھے ان کے والد حافظ عبدالغفور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے اور عاشق تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان نغمۂ درد کے نام سے شایع ہوا تھا لیکن اب نایاب ہے۔ نومبر ۱۸۸۶ء میں فتح پور خاص

---

[1] فسانۂ عجائب ناٹک معروف بہ جانِ عالم و انجمن آرا مرقومہ ۱۸۸۸ء مطبوعہ ۱۹۱۲ء مطبع الٰہی طبع ششم مملوکہ راقم الحروف۔

سحر بابل کے نام سے جو رسالہ جاری ہوا تھا اس کے چند رسایل میری نظر سے گزرے ہیں ان میں حافظ عبدالغفور عاشق کی غزلیں برابر شایع ہوئی تھیں۔

حافظ عبدالغفور زمیندار اور رئیس ہونے کے علاوہ مطبع لامع النور فتح پور کے مالک اور منیجر بھی تھے، رسالہ سحر بابل انھیں کے مطبع سے نکلتا تھا۔ سید محمد عبداللہ اور عبدالوحید کے اکثر ڈرامے بھی اسی مطبع سے شایع ہوئے ہیں۔ حافظ عبدالغفور عاشق کا انتقال ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو صبح ۹ بجے ہوا۔ ان کے بیٹے عبدالوحید قیس ۳ مارچ ۱۸۷۶ء مطابق ۶ صفر ۱۲۹۳ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے تاریخی نام محمد غلام حیدر رکھا گیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں بمقام موضع چتورا ضلع فتحپور حافظ عبداللہ کی بیٹی مسماۃ شاہجہاں سے ان کی پہلی شادی ہوئی۔

۱۹۰۲ء میں عدالت دیوانی ٹونک میں اہلمد مقرر ہوئے اور کچھ دنوں بعد سرشتہ دار عدالت ہو گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے، اپنی زندگی اور خاندان کے یہ مختصر حالات محمد عبدالوحید قیس خود اپنے ہاتھوں سے ایک بیاض میں محفوظ کر گئے ہیں۔ یہ بیاض نہایت اچھی حالت میں اب تک ان کے چچازاد بھائی کے لڑکے ڈاکٹر عبدالسعید شرق کے پاس موجود ہے اس ڈائری میں مختلف شعراء کے انتخاب کلام کے ساتھ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کا بھی ایک طویل انتخاب دیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈرامہ نگار کے ساتھ ساتھ طرز قدیم کے ایک اچھے غزل گو تھے۔ اس جگہ دو تین شعر بطور نمونہ دیئے جاتے ہیں:-

کف افسوس ملا کرتی ہے حسرت میری	روئے دیتی ہے مجھے دیکھ کے قسمت میری
شاعری کی نہیں گو قیس لیاقت لیکن	یہ غزل لکھنے کا باعث ہوئی وحشت میری
سن کے حال خفگی میرا وہ فرماتے ہیں	قیس بر دیکھتے ہیں تو رہنے دو منانا کیسا
وصل کی شب کٹ گئی ظاہر ہوئی تنویر صبح	آنسوؤں سے دھل گئی جھکی نہیں تقدیر صبح

لیکن قیس کا نام بھی ان کے استاد اور چچا سید محمد عبداللہ کی طرح شاعری کی بدولت نہیں بلکہ ڈرامہ نگاری کے سبب زندہ ہے۔ انھوں نے متعدد ڈرامے تصنیف و تالیف کئے ہیں۔ بادشاہ حسین اور عشرت رحمانی نے اپنی تحریروں میں ان کے ڈراموں کی جو تفصیل دی ہے اس میں صرف چار ڈرامے شامل ہیں۔ میرے پاس قیس کے چھ مطبوعہ ڈرامے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:-

۱- پورن بھگت، مرقومہ مارچ ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع لامع النور طبع اول۔
۲- رحم داور معروف بہ جفائے ستمگر، مرقومہ مارچ ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء طبع اول مطبع لامع النور
۳- انجام نیک و بد انسان معروف بہ سیف السلیمان مرقومہ ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء، مطبع لامع النور طبع اول۔
۴- جلسۂ پرستاں معروف بہ بزم سلیماں مرقومہ اپریل ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۲ء مطبع لامع النور
۵- نیرنگ الفت معروف بہ خواب محبت مرقومہ ۱۸۹۰ء مطبوعہ ۱۸۹۹ء مطبع لامع النور طبع اول۔
۶- پسندیدہ جہاں معروف بہ عشق ہرمز و مہر تاباں مرقومہ ۱۸۹۲ء مطبع لامع النور طبع اول۔

عبدالوحید قیس نے اپنے استاد اور چچا حافظ محمد عبداللہ کے انتقال سے پورے ۲۲ سال بعد اور اپنے والد کی وفات سے صرف ایک سال بعد پہلی اکتوبر ۱۹۴۳ء بوقت ۵ بجے شام بمقام چتورا وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

حبیب احمد صدیقی

(اپنے کلام کے آئینے میں)

(مسعود اختر جمال)

مصنف نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۴۸ء میں کانپور سے شایع کیا اور اُن کی غزلوں کا انتخاب انجمن ترقی اُردو (ہند) کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں طبع ہوا۔ "جلوۂ صد رنگ" پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں مجنوں گورکھپوری کا پیش لفظ ہے اُنھوں نے حبیب احمد صدیقی کی شخصیت پر اپنا ذاتی تاثر لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے اور محاسنِ کلام پر لطیف ترانداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس مضمون کے اقتباسات اگر پیش کئے جائیں تو آپ بہت جلد شاعر سے متعارف ہو جائیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ مجنوں گورکھپوری کے فیصلہ یا میرے نظریے سے متاثر ہو کر مصنف کے متعلق کوئی رائے قایم کریں۔ علمی اور ادبی تحقیق کا ایک [illegible] بھی [illegible] چاہئے کہ زیرِ بحث شاعر کے اشعار اس طرح ترتیب دئے جائیں جس سے سخن فہم حضرات خود کوئی فیصلہ [illegible] سکیں۔ میں [illegible] کا جو عنوان قایم کیا ہے اُس کا مقصد صرف یہی ہے۔ اپنے تعارف کے لئے حبیب احمد صدیقی نے خود کیا لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گائے ہوئے نغموں سے بھرا ساز نہیں میں — کہسار کی گونجی ہوئی آواز نہیں [illegible]

منصور نے آدابِ محبت کو نہ جانا — اسرار سے آگاہ ہوں غماز نہیں [illegible]

گاتا ہوں محبت کے دل آویز ترانے — اک نوحہ گرِ عشق کی آواز نہیں [illegible]

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۹ء تک مصنف نے تیس سال کی مدت میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا ماحصل یہی ہے۔ [illegible] کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے ایک شعر میں اپنی تمام زندگی کا افسانہ مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے:-

چند دلکش تجربے ہیں۔ دل شکن کچھ واقعات — داستانِ دل کچھ ایسی داستاں بھی تو نہیں

انھیں دلکش تجربوں اور دلشکن واقعات سے حبیب احمد صدیقی کی داستانِ دل مرتب ہوتی ہے۔ جس کے آغاز [illegible] کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن شاعر نے اپنی تمام عمر کی داستان صرف ایک شعر میں سمو دی ہے:-

لئے بیٹھا ہوں اس اُمید پر سازِ شکستہ کو
کبھی تو زخمہ زن پھر وہ نگاہِ اولیں ہو گی،

پہلا مصرع محبت کے انجام کا آئینہ دار ہے اور دوسرا مصرع آغازِ عشق کے حسین لمحوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ محبوب کی نگاہ اولیں سے، حبیب احمد صدیقی کی وابستگی ذوقِ پرستش کی حد تک پہونچ چکی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ اُن کی دُنیا اسی ایک نگاہ کے محور پر گھومتی ہے۔ یہی اُن کے لطیف احساسات کا مرکز ہے۔ یہیں سے اُن کے سفر کی ابتدا ہوئی تھی اور آج تک منزل بہ منزل یہی نگاہ اُن کی رفیق [illegible] جسے انھوں نے سیکڑوں انداز سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

اے نگاہِ محوِ نظارہ نہ جاگ اٹھیں کہیں　　وہ قیامت خیز فتنے جو کہ محوِ خواب ہیں
کاش وہ پلکیں تو یہ آشتی ہلے کر اٹھیں　　جو ربابِ زندگی کے واسطے مضراب ہیں

اب کلفتِ حیات بھی راحت سی ہو گئی　　شاید مجھے کسی سے محبت سی ہو گئی
بے کیف تھیں بساطِ جہاں کی نمائشیں　　تم کیا ملے کہ دہر سے الفت سی ہو گئی
معصومیت سے آپ کبھی مسکرا دئے　　دنیائے آرزو مری جنت سی ہو گئی
اب رنگِ التفات جھلکتا ہے آنکھ میں　　اب اپنی زندگی [illegible]

عجب معصوم تھیں پہلے ہیں کی بھی ملاقاتیں　　نظر ملتے ہی آپ کا [illegible] مسکرا دینا
بتا اے چشمِ خنداں کیا یہی اعجاز ہے تیرا　　فروزاں کر کے شمعِ آرزو [illegible] ہی بجھا دینا

تمام حرف و حکایت مٹا گئی دل سے　　نگاہِ ناز نے کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں

حجاباتِ نظر جلووں کی بیباکی سے کیا اٹھیں　　محبت کی نظر کو دیدۂ حیراں بھی کہتے ہیں
کسی کے واسطے سرمایۂ دنیا و دیں ٹھہریں　　وہی نظریں جنھیں غارت گرِ ایماں بھی کہتے ہیں

مرے رنگیں تصور سے زیادہ جو حسیں ہو گی　　وہ اقرارِ محبت کی نگاہِ شرمگیں ہو گی
غلط انداز سی اک بے تعلق سی نظر تیری　　کسے معلوم تھا دردِ محبت کی امیں ہو گی

دامانِ دل کو چھوتی ہوئی جب نظر گئی　　بس دل ہی جانتا ہے جو دل پر گزر گئی
شکوہ ہے اس نظر کا جسے دل سے ہے گریز　　اس کا گلہ نہیں ہے جو دل میں اتر گئی
کتنا نظر فریب تھا آغازِ آرزو　　اک جنتِ نظر تھی جہاں تک نظر گئی
اس کامیابِ عشق کی بربادیاں نہ پوچھ　　جس پر نگاہِ لطف پڑی اور ٹھہر گئی

زندگی کو بے نیازِ غم بنا دیتا ہے کون　　شرمگیں نظریں اٹھا کر مسکرا دیتا ہے کون
اک دلِ ناچیز کو آزاد مشرب دیکھ کر　　دولتِ صد عشوۂ رنگیں لٹا دیتا ہے کون
جان کر اس کو بھی اک طرزِ جنونِ عاشقی　　میری بیگانہ وشی پر مسکرا دیتا ہے کون
آرزوؤں پر مچلنا یہ خطا دل کی سہی　　دل میں قصرِ آرزو لیکن بنا دیتا ہے کون

جبینِ شوق کو تسکیں کسی طرح نہ ہوئی　　قدم قدم پہ بنائی گئی صنم خانے
ہمیں بہت ہے کسی کی نگاہِ پراسرار　　رموزِ حکمتِ دنیا و دیں خدا جانے

مجھ کو احساسِ زیاں بھی تو نہیں　　چشمِ معصوم پشیماں کیوں ہے

شوقِ نظارہ میں ہر شے سے نظر پھیر کے ہم　　چشمِ مشتاق کو مغرور بنا لیتے ہیں
حیف صد حیف یہ [illegible] اربابِ وفا　　عشق کو جذبۂ مجبور بنا لیتے ہیں
ہائے وہ کیفیتِ خاص کہ جب میرے لئے　　چشمِ معصوم کو مخمور بنا لیتے ہیں

شوق کی نظروں سے اس کو دیکھتے ڈرتا ہے دل　　وہ نگاہِ آشنا ۔ ناآشنا ہو جائے گی
کس کو یہ معلوم تھا تیری نگاہِ التفات　　اس طرح پابندِ آدابِ حیا ہو جائے گی
ہم نے چاہا تھا شکایت جورِ پیہم کی کریں　　کیا خبر تھی لب پہ آ کر التجا ہو جائے گی
اس ستم کیشی پہ تو جانِ طرب ہے وہ نظر　　کیا قیامت ہو گی جب جانِ وفا ہو جائے گی

اور جب یہی نظرِ جانِ وفا ہو کر قیامت بن جاتی ہے تو محبت کا یہ دلکش تجربہ دلشکن واقعات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

مشقِ بیداد بہ عنوانِ دگر اور سہی ۔۔۔ سہمی سہمی سی پشیماں سی نظر اور سہی
اشک آتے ہیں امیدوں کا سہارا لے کر ۔۔۔ تیرے قدموں پہ یہ تابندہ گہر اور سہی
ہو اگر دل کی تباہی میں ابھی کوئی کمی ۔۔۔ غمگسارانہ محبت کی نظر اور سہی
اک محبت کی نظر کے آگے ۔۔۔ ساری بالغ نظری بھول گئے
لب پر حدیثِ شوق کا آنا ستم ہوا ۔۔۔ اب انتظارِ جنبشِ مژگاں ہے اور ہم
کیسا گلہ - کہاں کی شکایت عجب ہے رنگ ۔۔۔ دلداریٔ نگاہِ پشیماں ہے اور ہم
کچھ ایسی التفات نما تھی نگاہِ دوست ۔۔۔ ہوتے رہے تباہ شکایت نہ کر سکے
زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ یہ ہے کہ دل ۔۔۔ اک نگاہِ غلط انداز کے قابل نہ ہوا
اس نظر پر کیسے رکھیں تہمت غارتگری ۔۔۔ جو نگاہِ شوق سے ملتے ہی شرما جائے ہے
اللہ، اللہ اک نگاہِ بے تعلق کی کشش ۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ دل سینے سے نکلا جائے ہے

سونا جب تک تپایا نہیں جاتا کندن نہیں ہوتا - غمِ حبیب میں سوزِ فراق کی تب و تاب شامل ہوتی ہے تو محبت شباب پر آتی ہے - حبیب احمد صدیقی اس آزمائش سے بھی مردانہ وار گزرے ہیں -

وائے ارماں کی مدعا طلبی ۔۔۔ لب پہ فریاد آئی جاتی ہے
حالِ دل یوں بیاں کیا جیسے ۔۔۔ اک کہانی سنائی جاتی ہے
مجھ کو داغِ شیون و آہ و فغاں نہیں ۔۔۔ اک آتشِ خموش ہوں جس میں دھواں نہیں
ہجر میں وحشتِ دل کی کوئی تدبیر تو ہو ۔۔۔ کچھ اثر ہو کہ نہ ہو نالۂ شب گیر تو ہو
خواب ہی خواب ہے افسانۂ الفت اپنا ۔۔۔ خواب دلکش سہی اس خواب کی تعبیر تو ہو
دعوتِ شوق بعنوانِ ستم بھی ہے قبول ۔۔۔ نالۂ دل کبھی شرمندۂ تاثیر تو ہو
کیوں نہ فردوسِ تصور کو حقیقت جانیں ۔۔۔ قصرِ امید کسی طور سے تعمیر تو ہو
چشمِ خنداں تو دیئے جاتی ہے درسِ بیہم ۔۔۔ عفو تقصیر ہے آساں کوئی تقصیر تو ہو
تم کو نفرت سہی الفت سے مگر کیا کیجے ۔۔۔ تم بھی افسانۂ الفت ہی کی تفسیر تو ہو
ایک فردوسِ تمنا ہے تصور تیرا ۔۔۔ میرے بازو پہ تری زلفِ پریشاں نہ سہی
دنیا کو روشناسِ حقیقت نہ کر سکے ۔۔۔ ہم جتنا چاہتے تھے محبت نہ کر سکے
یہ کیوں ہے سعیِ تغافل - ستم وہ کیا کم ہیں ۔۔۔ جو کر چکے ہو بعنوانِ دوستی اب تک
جس کے واسطے برسوں سعیِ رائگاں کی ہے ۔۔۔ اب اسے بھلانے کی سعیِ رائگاں کر لیں
ہائے بیدادِ محبت کہ بایں بربادی ۔۔۔ ہم کو احساسِ زیاں بھی تو نہیں ہوتا ہے
عشوۂ و ناز و ادا کا بھی فسوں ہے تو حسیں ۔۔۔ خود فریبی کا فسوں سب سے حسیں ہوتا ہے
بے منتِ زباں تو ہوئی گفتگو مگر ۔۔۔ نامعتبر سا وعدۂ فردا بھی چاہئے
جو انتظار میں حالت ہے کیسے بتلائیں ۔۔۔ نگاہِ شوق کی بیتا بیاں زباں میں نہیں
پامالِ تمنا سہی - برباد نہیں ہے ۔۔۔ یہ قلب باندازۂ بیداد حسیں ہے

لطیف دورِ زندگی گنوا دیا ہزار حیف　　　کچھ اپنی احتیاط نے ۔ کچھ اُن کے احتراز نے

اے دل یہ سعئ ضبط کہیں رائگاں نہ ہو　　　ڈرتا ہوں پھر وہ دشمنِ جاں مہرباں نہ ہو

اللہ رے خود فریبیٔ اُلفت کہ مدتوں　　　احساسِ تشنہ کامیٔ ارماں نہ ہو سکا

بوئے گل جب آئے ہے دل پر ستم ڈھا جائے ہے　　　یہ تو ہم ترسے ہوؤں کو اور ترسا جائے ہے

اس کے باوجود محبت پر شاعر کا ایمان مستحکم ہے ۔ حبیب احمد صدیقی کا مزاج قنوطیت پسند نہیں ہے ۔

جب کسی کی یاد ہوتی ہے ۔ انیسِ شامِ ہجر　　　ماہ و انجم میں ضیا کچھ اور ہی آ جائے ہے

اگرچہ اہلِ محبت کشاں کشاں گزرے　　　زمیں کو خلد بناتے گئے جہاں گزرے

ہر تارِ نظر کو نگہِ ناز ہی سمجھے　　　ہر نغمے کو ہم آپ کی آواز ہی سمجھے

خودداریٔ الفت نے اُٹھائے نہ حجابات　　　پایانِ محبت کو بھی آغاز ہی سمجھے

کوئی شیخ و برہمن کو بتائے یہ حقیقت بھی　　　عبادت گاہِ الفت ماورائے کفر و دیں ہوگی

کریں کیا سعیٔ آزادی محبت جزوِ فطرت ہے　　　محبت سے بغاوت بھی محبت آفریں ہوگی

اُردو شاعری میں محبت کے رموز و نکات کی ترجمانی جس بانکپن سے کی گئی ہے شاید اور کسی صنفِ سخن میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی ۔ یہ داستان لاتعداد شاعروں نے موضوع کی یکسانیت کے باوجود سیکڑوں رنگ اور ہزاروں اندازت بیان کی ہے لیکن ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است ۔ ایک شاعر اگر داستان کہتے سو جاتا ہے تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے وہی ساز وہی جھنکار ۔ وہی شمع وہی پروانہ ۔ وہی برق وہی آشیاں ۔ وہی جلوہ وہی طور ۔ حبیب احمد صدیقی کی شاعری میں بھی ان کا ذکر ہے لیکن بہ عنوانِ دگر ۔

دل کو معمورۂ پر نور بنا لیتے ہیں　　　منتشر جلووں سے ہم طور بنا لیتے ہیں

برقِ تپاں کا ہوگا اُنھیں ڈر　　　جن کے نشیمن ہیں شاخِ گل پر

شاید صفاتِ حسن میں مضمر تھیں رنجشیں　　　آغوشِ التفات میں پروانہ جل گیا

یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ جو شاعر غمِ عشق کے گداز سے بہرہ مند ہو چکا ہو اُسے غمِ دوراں اپنی طرف متوجہ کر سکا حبیب احمد صدیقی کے ابتدائی دور کی غزل میں یہ دو اشعار موجود ہیں :

اے عندلیب سعیٔ رہائی پھر ایک بار　　　اُڑتے ہوئے سے رنگ گل و گلستاں کے ہیں

صیاد یوں نہ بات بنائے بنے گی بات　　　تنکے جو اُڑ رہے ہیں کسی آشیاں کے ہیں

اِن اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کو جنگِ آزادی کی تحریک سے دلچسپی تھی ۔ یہ ۱۹۲۹ء کا زمانہ تھا ـــــــ شاعر کی طالب علمی کا آخری سال ـــــــ دم توڑتی ہوئی خلافت تحریک نے پورے ہندوستان میں جنگِ آزادی کی روح پھونک دی تھی ۔ اور اس تحریک کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں آ چکی تھی ۔ ممکن تھا کہ اِس موضوع پر شاعر کے جذبات رفتہ رفتہ کھل کر سامنے آ جاتے ، لیکن ۱۹۳۱ء میں حبیب احمد صدیقی نے ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ۔ ملازمت کی مجبوریوں نے جذبات کا گلا گھونٹ دیا اور اُنھوں نے غمِ دل اور غمِ حبیب کو اپنے کلام کا خاص موضوع بنا لیا اب اُن کی زندگی خود اُنھیں کے ایک شعر کا مصداق ہو کر رہ گئی ۔

میں پابندِ قفس ہو کر رہا برسوں گلستاں میں　　　اُنھیں آنکھوں کے آگے بجلیاں کوندیں نشیمن پر

۱۹۳۲ء میں مزید دو اشعار اسی موضوع پر لکھے ہیں ۔ پہلا شعر اُن کی مجبور زندگی کا آئینہ دار ہے ۔

اسیرانِ قفس کی بےبسی حیف　　چمن میں لُٹ رہا ہے آشیانہ

دوسرا شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ غمِ دل سے مفاہمت کر چکے ہیں۔

اُس کی نگاہِ لطف نے ایک جہاں بدل دیا　　تابعِ چشمِ ناز ہے گردشِ روزگار بھی

ایک فرض شناس اور دیانتدار افسر کی حیثیت سے حبیب احمد صدیقی کی شہرت اس قدر عام ہے کہ اُن کی ایمانداری اور انصاف پروری کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اپنے شاعرانہ کردار کے بارے میں وہ بہت جلد اس فیصلہ پر پہونچ گئے کہ باتو بات کھُل کر کہی جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ یہ اُن کی دیانتِ کردار کا ایک خاص وصف ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے اُنھیں نزدیک سے دیکھا ہے۔ حبیب احمد صدیقی غمِ دوراں پر ایک ہزار اشعار بھی لکھ کر ملک و قوم کی وہ خدمت نہ کر سکتے تھے جو اُنھوں نے ملازمت کے دوران اپنی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے کی۔ جس محکمہ میں گئے، رشوت خوری کا خاتمہ کر دیا۔ مظلوم کے ساتھ انصاف کرنا اُن کا شیوہ رہا۔ اُن کے عزیز سے عزیز دوست کو بھی کسی معاملہ میں اُن سے سفارش کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ایسے افسر نایاب تھے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۲ء تک وہ صرف محبت کے دل آویز نغمے سناتے رہے۔ اس مدت میں غمِ دوراں پر اُنھوں نے ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ رفتہ رفتہ اُن کے جذبات میں شگفتگی، لب و لہجہ میں ندرت، اندازِ بیان میں پختگی اور اسلوبِ فکر میں جدت پیدا ہوتی گئی۔ یک بیک وہی غمِ زمانہ جسے وہ بھلا چکے تھے، ایک نئی صورت سے اُن کے شعر میں ڈھل گیا۔

شورشِ کائنات میں عشق کے گیت گائے جا
پھونک دے روحِ سرمدی گردشِ روزگار میں

اور ۱۹۴۳ء میں اُن کے مزاج میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔

سب اُٹھ گئے خوش رنگ حجابات نظر سے　　دنیا مری نظروں میں طلسمات نہیں اب
دل مرا نذرِ گردشِ دوراں نہ [illegible]　　اک خلش اب کوئی باقی ہے ارماں نہیں

۱۹۴۴ء میں یہی خلش ایک کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

پڑے رہنے کبھی دے پردے کس لیے ناقل　　یہ دنیا تو الگ عقبیٰ سے دل بیزار ہو جائے
دھوکا سا ہوا منزلِ مقصود کا اکثر　　ہیں دیر و حرم کتنے تری راہگذر تک
کم ور پے جاتے ہیں [illegible]　　کیا ہو اگر ان کا بھی کہیں اور خدا ہو

۱۹۴۵ء میں صبر و ضبط کا دامن [illegible] یہ جوئے کم آب ایک بحرِ بیکراں بن گئی۔ دبے ہوئے احساسات ایک شدید [illegible] کی صورت میں آ [illegible]

فیاضیوں کے [illegible] میں [illegible]　　خنجر بدست - غیرتِ سائل نہ ہو کہیں
[illegible] راحت [illegible]　　[illegible]ت کو ہم شریکِ محبت نہ کر سکے
ناکامیاں تو [illegible] پناہ لیں　　ہم ہیں کہ اعترافِ ہزیمت نہ کر سکے
افلاک پر تو [illegible] بنائیں ہزارہا　　تعمیر کوئی دہر میں جنت نہ کر سکے
ہمسائگیِ زاہد [illegible] خوف سے　　پروردگار تیری عبادت نہ کر سکے
کیا نظامِ دہر ہے یاں پر شکست　　اک نئی تعمیر کا آغاز ہے
نظامِ دہر کی نیرنگیاں معاذ اللہ　　مدام گردشِ مینا ہے پر شراب نہیں

کہیں وفورِ بیدلی ۔ کہیں نشاطِ کار کیوں یہ نالۂ ہزار کیا ۔ یہ خندۂ بہار کیوں
ہیں دشت و بحر مضطرب ۔ ہیں مہر و ماہ مضطرب زمیں سے لیکے تا فلک ہے ایک انتشار کیوں
وسعتیں تکمیلِ الفت کے لئے معدوم ہیں یہ نظامِ زندگی اچھا ہوا محکم نہیں
بیدلی نے توڑ ڈالے رنگ و بو کے سب طلسم کیا کرے کوئی بہارِ صد گلستاں دیکھ کر
قفس پہ تیری نگاہِ عتاب ہے اے برق وہ کیا کریں گے جنھیں چین آشیاں میں نہیں
دُنیا کے مصائب سے چھٹے بھی تو چھٹے کیا درپیش ابھی مرحلۂ فتنۂ دیں ہے

۱۹۴۶ء میں غمِ دل اور غمِ دوراں کی یہ کشمکش شاعر کو زندگی کے ایک نئے موڑ پر لاتی ہے۔

جو بھول جائے کوئی شغل جام و مینا ہیں غمِ حبیب ۔ غمِ روزگار بھی تو نہیں
اسی کا نام کرم ہے ۔ یہی ہے شانِ سخا کہ تشنہ لب ہے زمانہ ۔ بھرے ہیں میخانے

۱۹۴۷ء میں خیالات پر مزید صیقل ہوتی ہے ۔ غمِ دل پر غمِ دوراں کا جذبہ غالب آتا ہے ۔ فریبِ تمنا میں دلکشی کم ہوجاتی ہے۔

دلِ فسردہ کو غم ہے اگر تو یہ غم ہے کہ اب فریبِ تمنا میں دلکشی کم ہے
ہر چند زندگی ہے کسی اور شے کا نام جینے کے واسطے غمِ دنیا بھی چاہئے
زندگی کو کس لئے کہتے ہیں اک خوابِ گراں اس میں کیف و راحتِ خوابِ گراں بھی تو نہیں
حیات لائی ہے جس خاکداں میں ہم کو اُسے بہشت زار بنانا ہے زندگی کے لئے
وہ کچھ گماں کہ حقیقت سمجھ لیا ہے جنھیں ہیں سنگِ راہ حقیقت میں آگہی کے لئے
کہاں کا عرش ابھی ہے زمیں پراگندہ ابھی تو کتنے مراحل ہیں زندگی کے لئے
کسی کو شکوۂ دوراں ۔ کسی کو شکوۂ بخت بہانے کتنے تراشے ہیں نارسی کے لئے
وہ بتِ زہد شکن کیا جانے بت گری فطرتِ انساں کیوں ہے
بہ شکلِ قصۂ دار و رسن نہ ہو مشہور وہ اک فسانۂ غم ۔ تم نے جو سُنا بھی نہیں
بادۂ و مطرب و ساقی کا نہ لو نام ابھی گرد آلود ہے آئینۂ ایام ابھی
یہ چشمِ لطف مبارک مگر دلِ ناداں پیامِ عشوۂ رنگیں ، صلائے دار نہ ہو
ہزاروں بتکدے بھی ہیں ۔ حرم بھی ہے مگر پیکیا جبینِ شوق کو ہے جستجوئے آستاں اب تک
ایک عالم ہے سحر سے تا سحر مٹ گئی تفریقِ صبح و شام کیا
دل ہلاکِ جلوۂ صد رنگ ہے اک فریبِ عشوۂ اصنام کیا
وہ دردِ عشق جس کو حاصلِ ایماں بھی کہتے ہیں سیہ بختوں میں اُس کو گردشِ دوراں بھی کہتے ہیں
یہ لالہ و گل ۔ برق و شرر ۔ شمس و قمر کیا رہ جائے انھیں میں جو اُلجھ کر وہ نظر کیا
کیا کریں گر نہ جئیں کوثر و طوبیٰ کے لئے جن غریبوں کے لئے راحتِ دنیا ہی نہیں

۱۹۴۷ء کے بعد قید و بندِ غلامی کی گرانبار زنجیریں ٹوٹ گئیں ۔ زباں بندی کا دور ختم ہوا ۔ آزادیٔ تحریر و تقریر کا زمانہ آیا ۔ امید تھی کہ حبیب احمد صدیقی کشمکش حیات کا تجزیہ واضح طور پر کر سکیں گے لیکن فرقہ پرستی کے مہیب و ہولناک طوفان سے ہندوستان کی فضا لرزہ براندام ہوگئی ۔ ۱۹۴۸ء میں حبیب احمد صدیقی نے گاندھی جی کی وفات پر جو نظم لکھی ہے

اُس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

تہذیب سرنگوں ہے کہ اب منہ دکھائے کیا انسانیت ہے دہر میں بے یار و بے اماں

یہ نظم لکھنے کے بعد وہ دو سال تک خاموش رہے - مذہبی تنگ نظری - مفاد پرستی - فرقہ پروری - انسانیت کشی - لسانی تعصب اور صوبائی عصبیت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آنچ سے تہذیب و تمدن کا لہلہاتا ہوا باغ اُجڑ گیا - اہلِ ہوش دم بخود ہوکر رہ گئے - اِس قیامت خیز دور میں اربابِ فکر و نظر کے لئے تعمیر و ترقی کی راہیں مسدود ہوکر رہ گئیں - حبیب احمد صدیقی اس بزم کے خاموش تماشائی رہے - ۱۹۵۱ء میں صرف ایک شعر میں اس طرف مبہم سا اشارہ کیا۔

کتنے صنم خود ہم نے تراشے ذوقِ پرستش اللہ اکبر

۱۹۵۳ء میں بھی ایک ہی شعر لکھ کر خاموشی اختیار کرلی

ترے علم و فضل میں شک نہیں - مگر اے امینِ رموزِ دیں کھلے اُس پہ رازِ حیات کیا - جسے اس جہاں سے غرض نہیں

۱۹۵۵ء میں دو اشعار لکھے :-

گردشِ روزگار باقی ہے کوئی تو غمگسار باقی ہے
اپنے دامن میں ایک تار نہیں اور ساری بہار باقی ہے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے - کھُل کر نہیں کہہ سکتا - سماج کے مجرموں کی طرف کوئی واضح اشارہ کرنا آسان بات نہ تھی - مندرجۂ بالا اشعار حبیب احمد صدیقی کے دلی کرب کا اظہار کرتے ہیں - اُن کے دل میں ایک طوفان پرورش پا رہا تھا - لیکن طوفان کے آنے سے پہلے جس طرح فضا ساکن اور صامت ہو جاتی ہے اسی طرح حبیب احمد صدیقی خاموش اور پرسکون تھے - زبان اظہارِ بیان سے قاصر تھی - دل و دماغ پر حیرت چھائی ہوئی تھی - ۱۹۵۶ء میں یہ طوفان پوری شدت کے ساتھ آیا اور شاعر کی زندگی پر چھا گیا - غمِ دل اور غمِ دوراں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا - حقیقت بھی یہی ہے کہ غمِ حبیب اور غمِ روزگار میں کوئی حدِ فاصل قایم کرنا غیر ممکن ہے، لیکن اُردو شاعری میں اس روایتی مفروضے کو حقیقت کی شکل دے دی گئی ہے اور اب معنوی حیثیت سے ان کی حیثیت جداگانہ ہے - انصاف کی بات یہ ہے کہ غمِ روزگار نہ ہو تو دنیائے تمدن کے ارتقا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو - نہ کائناتِ دل میں تمناؤں کی گرم بازاری ہو نہ عالمِ تخیل میں ارمانوں کی انجمن آرائی - انسان غمِ روزگار سے مجبور ہوکر جد و جہد کرتا ہے اور اسی غمِ روزگار کی ایک شکل غمِ حبیب بھی ہے - یہ عجیب بات ہے کہ اہلِ دل محبت کے ابتدائی دور میں غمِ روزگار کو بڑھ کر اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں - جب تک غمِ عشق کی یہ منزل نہیں آتی - نہ انسان کو انسانیت کا شعور حاصل ہوتا ہے اور نہ فن کار فن کی عظمتوں کو چھو سکتا ہے - ۱۹۵۶ء میں پہلی بار حبیب احمد صدیقی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے :-

مانا کہ عشق کو غمِ دوراں سے بیر ہے تکمیلِ عشق کو غمِ دوراں بھی چاہئے

کہاں حسن و عشق کی دُنیا کے لطیف احساسات اور کہاں کشمکشِ حیات اور گردشِ روزگار کی بے کیف و بے رنگ جد و جہد - حبیب احمد صدیقی نے یہ محسوس کر لیا کہ تکمیلِ عشق کے لئے غمِ دوراں بھی ضروری ہے اور انھوں نے اس حقیقت کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف بھی کر لیا، لیکن اپنی زندگی کی حسین ساعتوں کو وہ کیونکر بھول سکتے تھے -

تخیل کی قیاس آرائیاں بھی حیف کھو بیٹھے بہت پچھتائے ہم تو محرمِ رازِ جہاں ہوکر

محرمِ رازِ جہاں ہوکر یہ بات ممکن نہ تھی کہ وہ اشارے اور کنائے میں اپنے جذبات کا اظہار کریں یا زاہد اور واعظ کو حرف بنا کر اپنا مطمحِ نظر پیش کریں - اب اُن کے تخیلات شمشیرِ برہنہ ہوکر سامنے آئے زمانے کی سیاست پر انھوں نے بے لاگ تبصرہ شروع کر دیا۔

ایک کعبے کے صنم توڑے تو کیا — نسل و ملّت کے صنم خانے بہت
کیا کہیں ہم خوبیٔ تقدیر کو — دور میں تھے یوں تو پیمانے بہت

یہ مہر و ماہ و کواکب کی بزمِ لامحدود — صلائے دعوتِ پرواز ہے بشر کے لئے
نظامِ دہر بہت سخت گیر ہے ہمدم — اماں جہاں میں نہیں ہے شکستہ پر کے لئے

جبیں تسکیں نہیں پاتی ہے وقفِ آستاں ہوکر — نہ آیا ہم کو جینا بندۂ وہم و گماں ہوکر

ہر قدم پر ہے احتسابِ عمل — اک قیامت پہ انحصار نہیں

اک تماشائے ارم اور سہی — آرزوؤں پہ ستم اور سہی

ایک شک وہ ہے کہ ہے مانعِ اقرار و یقیں — ایک شک اور ہے جو حسنِ یقیں ہوتا ہے

چھوڑو ایسے بدلتی ہیں کہیں تقدیریں — تم جو کہتے ہو تو لو سجدۂ در اور سہی
خال و خط اور اُبھر آئے سیہ بختی کے — دلِ فگاروں پہ یہ احسانِ سحر اور سہی

موت کے بعد بھی مرنے پہ نہ راضی ہونا — یہ وہ جذبہ ہے جو سرمایۂ دیں ہوتا ہے

رفتہ رفتہ ذوقِ خود بینی بڑھا اتنا کہ ہم — خود تراشیدہ بتوں کے مدح خواں بنتے گئے

نہ کفر و دیں کی نہ ایماں کی آزمایش ہے — رہِ وفا میں دل و جاں کی آزمایش ہے
یہ نسل و مذہب و ملّت کے اختلاف ہیں کیا — فراخ چشمیٔ انساں کی آزمایش ہے
پناہ گوشۂ عزلت میں ڈھونڈنے والو — جہاں میں ہمّتِ مرداں کی آزمایش ہے

۱۹۵۵ء کی ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں :-

بت گری فطرتِ محبّت ہے — دل سلامت - ہزار بتخانے
عشرتِ یک نفس بھی کیا کم ہے — کیا ہوا جل بجھے جو پروانے
ہم سے حسنِ عمل کی بات کرو — حکمتِ کفر و دیں خدا جانے

۱۹۵۸ء میں اپنے جذبۂ سرفروشی کا اظہار انھوں نے بالکل نئے انداز سے کیا ہے :-

نہیں ہوں موت سے خائف کہ ناگزیر ہے موت — خیالِ زندگیٔ جاوداں سے ڈرتا ہوں،

حبیب احمد صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ ابتدائی دور میں انھوں نے چند رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں جن پر رنگِ تغزل چھایا ہوا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک شعر پیش کرتا ہوں ۔ یہ شعر اُن کی نظم سے لیا گیا ہے :-

کبھی دستِ حنائی کی طلب میں جاں پر بنتی — کبھی دستِ حنائی باعثِ تسکینِ جاں ہوتا

یہ شعر نظم کا سہی لیکن غزل کے اشعار سے مماثلت رکھتا ہے ۔ اسی لئے بہت جلد حبیب احمد صدیقی نے نظم سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور غزل کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ۔ مشرقی ادب میں غزل ایک نازک صنفِ سخن ہے ۔ جس پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں ۔ کیونکہ مغربی اصنافِ سخن میں غزل کا فن ناپید ہے ۔ منفرد خیالات کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ حسین وسیلہ ممکن نہیں ہے ۔ یہ صنفِ سخن قابلِ رشک ہے اور ہم فخر کے ساتھ اسے دُنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں، وہ لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہیں جو مغربی ادب سے متاثر ہوکر غزل کو مٹا دینا چاہتے ہیں ۔ حبیب احمد صدیقی نے غزل کو اپنا موضوعِ سخن بناکر وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے ۔ اُن کے لطیف و نازک احساسات کی ترجمانی غزل کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن میں غیر ممکن تھی ۔ دلیل کے لئے

آن کی زندگی کے مختلف دور کے منتخب اشعار پیش کرکے میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشعار حبیب احمد صدیقی کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں اور ادب میں اُن کی زندگیِ جاوداں کی ضمانت ہیں :-

اُنھیں کو مایلِ غارت گری پایا زمانے میں — جنھیں آسان تھا اس دہر کو جنت بنا دینا

یوں دلیرانہ سُبو و جام لئے پھرتے ہیں — جیسے دنیا میں کوئی صاحبِ ایماں ہی نہیں

وہ سادہ دل ہوں کہ تکمیل زندگی کے لئے — سمجھ رہا ہوں محبت کو لازمی اب تک

معصوم نگاہی کی ادا ہو کہ حیا ہو — ہر بات کو ہم شوخیٔ انداز ہی سمجھے

ہمت پہ ہے موقوف بلندی ہے نہ پستی — ہم عرش کو جو لانگہِ پرواز ہی سمجھے

اس قدر خوگرِ بیداد کیا دُنیا نے — اب مجھے شکوۂ بے مہریٔ دنیا ہی نہیں

اُس کو بھولے ہوئے اک عمر ہوئی — خونِ دِل اب سرِ مژگاں کیوں ہے

شیخ و زاہد کو بھی کافی نہ ہوئی — اتنی کم دولتِ ایماں کیوں ہے

اک فصلِ گل کو لیکے تہی دست کیا کریں — آئی ہے فصلِ گل تو گریباں بھی چاہیے

ہندوستان میں ایک نئے کلچر کی تخلیق

عہدِ اکبر کی ایک شادی

(جہانگیر اور جودھا بائی)

(نیاز)

جہانگیر کی عمر ۱۵ یا ۱۶ سال کی تھی جب اس کی سب سے پہلی شادی جے پور کی راجکماری سے ہوئی (۱۵۸۵ء) جس کا نام جودھا بائی تھا۔ یہ راجہ مان سنگھ کی بہن تھی، اسی لئے بعض مورخوں نے اس کا نام مان بائی بھی لکھا ہے۔ یہ راجہ بھگونت داس یا بھگوان داس کچھواہہ والی جے پور کی بیٹی تھی۔ یہ شادی جس تزک و احتشام کے ساتھ ہوئی اس کی نظیر عہدِ مغلیہ کی تاریخ میں بھی کوئی دوسری نظر نہیں آتی۔ جہانگیر شہنشاہ اکبر کا وہ محبوب بیٹا تھا جو خدا جانے کتنی منتوں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا اور جودھا بائی بھی والی جے پور ایسے معزز راجہ کی انتہائی چہیتی بیٹی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی شادی میں جو اہتمام بھی کیا جاتا کم تھا۔ چنانچہ اس عہد کے مورخین نے اس شادی کے جو حالات قلمبند کئے ہیں وہ بڑے دلچسپ ہیں۔ مآثر الامراء کا بیان ملاحظہ ہو:-

"شاہزادہ سلیم تمام درباری امراء کے ساتھ پورے خدم و حشم سے ساتھ راجہ کے گھر گیا جہاں رسم نکاح ادا ہونا تھی۔ ایک طرف امراء اسلام، علماء کرام، قاضی و مفتی کی صف تھی، دوسری طرف ہندو عمائد، پنڈتوں اور برہمنوں کی۔ پہلے فلسفۂ اسلام پر رسم نکاح ادا کی گئی اور دو کرور تنکے کا مہر باندھا گیا، پھر ہندوؤں کی تمام رسمیں ادا کی گئیں پھیرے پڑے، ہون ہوا اور شہنشاہ اکبر خود دولہن کی پالکی پر اشرفیاں نچھاور کرتا ہوا اس طرح گھر لایا کہ ایک طرف وہ خود کندھا دئے تھا اور دوسری طرف شاہزادہ سلیم۔ راستہ پر زرکار ریشمی [illegible] کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر سے پالکی گزر رہی تھی۔ راجہ نے جہیز بھی دل کھول کر دیا، اصطبل کے اصطبل خالی کر دئے جن میں عربی، عراقی، ترکی سبھی نسل کے گھوڑے تھے، سَو ہاتھی ساتھ جہیز میں دئے اور سیکڑوں [illegible] غلام بھی۔ چاندی کے ظروف اور جڑاؤ زیوروں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ امراء دربار کو بھی حسب حیثیت [illegible] اور گھوڑے مع جڑاؤ ساز و سامان کے عطا کئے۔"

مولانا شبلی نے اپنی نظم "ہمارا طرزِ حکومت" میں اس واقعہ کا ذکر [illegible] الفاظ [illegible] ہے:-

اُدھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی	اِدھر شہزادہ پر [illegible] [illegible] سایہ گستر تھا
دُلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے	کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مزر تھا
دُلہن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جو لائے تھے	وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

نواب نصیر حسین خاں خیالؔ نے "مغل اور اُردو" میں اس تقریب کا ذکر اپنی انشاء میں اس طرح کیا ہے :-

" طلایانِ عہد نے لاکھ گھوڑا اور زنار لگائیں مگر جو ہونے والا تھا وہ ہو کر رہا - ہندو مسلمانوں کا عقد اتحاد بندھا اور خوب بندھا ، رشتہ مضبوط ہوگیا - شاہزادہ سلیم دولھا بنا ، بادشاہ خود بیاہنے گیا ، راجپوتوں کی عزت بڑھائی ، برات جمی ، منڈھا چھوایا اور خوشی کا یہ گیت گایا :-

پربت بانس کٹا مورے بابُل نئے کا منڈو چھوائے رے
منڈھوے اوپر کلس براجے دیکھیں راجہ رائے رے

ان بولوں کے ختم ہونے پر دُلھن کا چنڈول آیا ، بادشاہ آگے بڑھا ، دولھا (سلیم) کو بلوایا ، اس سے پالکی اُٹھوائی ، پھر خود کندھا لگایا ، سب کا دل بھر آیا ، راجہ راؤ سامنے آئے ہاتھ باندھ کر بھرے دل سے عرض کرنے لگے :-

مہاری بیٹی تہارے محلوں کی چیری - ہم باندی غلام رے

بادشاہ اس کا جواب دیتا ہے - نہیں نہیں -

تہاری رے بیٹی مہارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رے

جب اس شادی کا پہلا ثمر سامنے آیا اور جودھا بائی کے بطن سے شاہزادہ خرم پیدا ہوا ، تو اس وقت بھی بڑا جشن منایا گیا جس کی تصویر نصیر حسین خاں خیالؔ نے اس طرح پیش کی ہے :-

" خرم کی پیدایش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں ہندوانہ تھیں - ساری رجپوتی رسمیں برتی گئیں ، زچہ خانہ تک گایا ، اور ہندی سُروں سے جی بہلایا گیا - دائی جی شہزادہ کو گود میں لئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں ، موتیوں کی تھالی سامنے ہے گمران کے بھا دیں نہیں لگتی ، بڑے ناز سے گنگنا کر کہتی ہیں :-

لاگے ہے جودھا جی کا راج للہ جی کا نال نہ چھوائے
تھال جو موتی جودھا رانی لائیں وہ بھی نہ لیوے یہ دائے

یعنی میں جب تک رانی جی کا آدھا راج پاٹ نہ لکھا لوں گی ، نال کاٹنے والی نہیں ، میرے آگے یہ موتیوں بھرا تھال کوئی مال نہیں ، اسے رکھ رکھو۔

یہ تھا وہ نیا کلچر ہندو مسلم اتحاد کا جس نے عہدِ اکبری میں جنم لیا اور جس کے تصور سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ، لیکن اب وہ صرف خواب و خیال ہے -

---

نیاز فتحپوری کی تین تازہ مطبوعات

ابوالہذیل معتزلی امام کی مناظرانہ فراست

(نیاز)

فن مناظرہ دراصل ایک ذہنی جنگ ہے جو کبھی کبھی بے اعتدالی سے مجادلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس فن کے آداب کے خلاف ہے۔ چنانچہ مذہبی مناظروں کے سلسلہ میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جب نوبت کشت و خون کی آگئی میں سمجھتا ہوں کہ اختلاف عقاید کی بنا پر خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، مناظرہ کا سلسلہ ہمیشہ دنیا میں جاری رہے گا اور یہ تو تو میں میں کبھی ختم نہ ہوگی۔ لیکن اس کا ایک پہلو جو خالص علم و فراست، اور منطقی سوجھ بوجھ سے تعلق رکھتا ہے، یقیناً ایک ایسا ریکارڈ ہے جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

اس وقت ایک معتزلی امام ابوالہذیل کی قوت مناظرہ کی بعض دلچسپ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ابوالہذیل دوسری صدی ہجری کے اخیر میں پایا جاتا تھا اور اپنے وقت کا بے نظیر علم کلام تھا۔ یہ مامون الرشید کا استاد تھا اور مامون کا رجحان اعتزال اسی کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

یہ بڑی غیر معمولی سوجھ بوجھ کا انسان تھا اور مناظروں میں ہمیشہ اپنے فریق کو ساکت کر دیا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف بڑا عالم و متکلم تھا بلکہ غیر معمولی خوش بیان اور فصیح و بلیغ ادیب و مصور بھی تھا۔

اس کے زمانہ میں کئی مذہبی فرقے اسلام کے مقابلہ میں آئے جن میں مانویہ، ثنویہ و مجوسی بھی تھے اور اس نے ان سب سے مناظرہ کر کے انھیں ساکت کر دیا۔

ایک بار کسی مجوسی عالم سے اسی کے معتقدات کے پیش نظر دریافت کیا کہ:۔ "تمہارے نزدیک آگ کی حقیقت کیا ہے"؟

مجوسی :۔ "آگ خدا کی بیٹی ہے"

ابوالہذیل :۔ "اور گائے کیا ہے"

مجوسی :۔ "گائیں خدا کے فرشتے ہیں، جن کے بازو کٹ گئے ہیں اور کاشت کے لئے زمین پر بھیج دئے گئے ہیں"

ابوالہذیل :۔ "پانی کیا ہے"

مجوسی :۔ "خدا کا نور ہے"

ابوالہذیل :۔ "بھوک پیاس کیا ہے"

مجوسی :۔ "شیطان کا فقر و فاقہ"

ابوالہذیل :۔ "زمین کو کون اٹھائے ہوئے ہے"

مجوسی :۔ "بہمن فرشتہ"

ابوالہذیل :- " تو دُنیا میں مجوسی وہ قوم ہے جس نے خدا کے فرشتوں کو ذبح کیا، خدا کے نور سے دھویا، اور خدا کی بیٹی پر رکھ کر اسے بھونا، پھر شیطان کے فقر و فاقہ کے حوالہ کر دیا، اور آخر میں اسے بہمن فرشتہ کے سر سے اُٹھایا اور اس کی کھال کھینچ لی۔"

ایک بار بصرہ کا ایک شخص قرآن کی بعض آیتوں کے متعلق چند شبہات لے کر آیا کہ ان میں زبان کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ابوالہذیل نے کہا "آپ ہر آیت کے متعلق الگ الگ جواب چاہتے ہیں یا تمام آیات کے متعلق اپنے تمام شکوک کا جواب ایک ساتھ"۔ اس نے کہا کہ "زیادہ مناسب یہی ہے کہ سب کا جواب ایک ساتھ مل جائے"۔

ابوالہذیل :- "آپ جانتے ہیں کہ محمد عرب کے اس معزز و شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن زبان و زباندانی مسلم تھی"۔

" یہ بالکل صحیح ہے"۔

ابوالہذیل :- "آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ عرب رسول اللہ کے بڑے دشمن تھے اور کوئی موقع نکتہ چینی کا ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے"

" یہ بھی بالکل صحیح و درست ہے"۔

ابوالہذیل :- " آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کی زبان یا رسول کی زباندانی پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا"۔

" یہ بھی درست ہے"۔

ابوالہذیل :- " تو پھر تمام شرفاء عرب کے خلاف کسی عامی یا غیر عرب کا قول کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتا ہے"۔

وہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا اور اسلام لے آیا۔

ابوالہذیل کی غیر معمولی ذہانت کے دو دلچسپ واقعے عجیب و غریب ہیں۔ ایک بار اس نے کسی فلسفی سے پوچھا کہ خدا نے زنا کی حد یہ مقرر کی ہے کہ زانی اور زانیہ کو سو سو کوڑے مارے جائیں (**فاجلدو کل واحد منہما مئۃ جلدہ**) دوسری طرف حد قذف (تہمت) میں ۸۰ - ۸۰ کوڑے لگانے کا حکم ہے۔ آپ کے نزدیک کونسی حد زیادہ ہے۔

فلسفی = " زانی کی حد زیادہ ہے"۔

ابوالہذیل = " کتنی زیادہ ہے"

فلسفی = " بقدر بیس کے زیادہ ہے"

ابوالہذیل = " کیا لفظ جلدہ سے جلاد کا ہاتھ مراد ہے"

فلسفی = " نہیں"

ابوالہذیل = " تو کیا اس ملزم کی پشت مراد ہے"

فلسفی = " یہ بھی نہیں"

ابوالہذیل = " تو کیا اس سے فاصلہ مراد ہے جو کوڑے اور مجرم کی پشت کے درمیان پایا جاتا ہے"

فلسفی = " نہیں"

ابوالہذیل = " تو کیا ایک لاشئے دوسری لاشئے سے بقدر بیس کے زیادہ ہو سکتی ہے ؟"

ایک بار امیر حسن بن سہل کے دربار میں کوئی نجومی، امیر کی مسند کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ابوالہذیل نے پوچھا یہ کون جوان ہے

جس نے امیر کو اتنی عزت بخشی ہے۔

امیر = "یہ نجومی ہے اور احکام نجوم صادر کرتا ہے"

ابوالہذیل = "[illegible] [illegible] کیا میں اس سے کوئی سوال کرسکتا ہوں"؟

امیر = "ضرور [illegible]"

ابوالہذیل [illegible] ہاتھ میں اٹھالیا اور نجومی سے پوچھا کہ میں اس سیب کو کھاؤں گا یا نہیں۔

نجومی [illegible] آپ اس سیب کو ضرور کھائیں گے"

ابوالہذیل [illegible] دیا اور کہا کہ "میں ہرگز نہیں کھاؤں گا"۔

نجومی = "آپ سیب دوبارہ ہاتھ میں اٹھائیں میں پھر غور کرتا ہوں، ممکن ہے مجھ سے حساب میں غلطی ہوگئی ہو"۔

ابوالہذیل نے اب دوسرا سیب اٹھالیا، امیر نے کہا آپ نے دوسرا سیب کیوں اٹھایا۔

ابوالہذیل = "اس لئے کہ اگر اب اس نجومی نے کہا کہ تم اس سیب کو نہیں کھاؤ گے تو میں کھا جاؤں گا۔ اگر میں پہلا سیب اٹھاتا اور کھا جاتا تو اس کو کہنے کا موقع ملتا کہ میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا کہ آپ کھا جائیں گے"۔

مختصرات

جب میں بچہ تھا تو میں وہی کرتا تھا جو میرا باپ چاہتا تھا۔ اب بڑا ہوا تو میں وہ کرتا ہوں جو میرے بچے چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ وقت کب آئے گا جب میں خود اپنا چاہا کرسکوں۔

ایک بچے نے حیرت کے ساتھ اپنے باپ سے سوال کیا کہ "ابا، ایسا کیوں ہے کہ ایک اخبار کے پُر کرنے کے لئے روز طرح طرح کی نئی باتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اسپا کے قدرتی چشمے پر کھڑے ہوکر ایک نوجوان لڑکی نے کہا کہ اگر مجھے یقین ہو کہ میری عمر گھٹ کر ۱۸ سال کی ہو جائے گی تو میں ایک گیلن پانی اس کا پی لوں۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اس وقت تمہاری عمر کیا ہے۔ جواب دیا کہ ۲۰ سال — اس نے پھر کہا کہ ۲۰ اور ۱۸ میں کیا ایسا فرق ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ایک شوہر اور دو بچوں کا فرق ہے۔

شادی کے لئے صحیح مرد نہ تلاش کرو بلکہ صحیح رفیق کی جستجو کرو۔

موجودہ نقاشی کی مثال ایک عورت کی سی ہے کہ اگر تم اسے سمجھ لو تو کوئی لطف باقی نہ رہے۔

لندن کی ایک عورت پارک میں آئی اور اپنی موٹر دوسری سیکڑوں موٹروں کی قطار میں ملا کر کھڑی کردی۔ پولیس کے آدمی نے اسے کہا کہ آپ کا پلیٹ نمبر الٹا لگا ہوا ہے اسے سیدھا کردیجئے۔ وہ بولی کہ میں نے تو قصداً ایسا کیا ہے تاکہ اپنی موٹر کو فوراً پہچان لوں۔

باب الاستفسار

(۱)
مومن کا ایک شعر

(محمد عبدالحلیم - ناگپور)

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

تقسیم ہند سے پہلے مولانا ناطق گلاؤ ٹھوی نے پروفیسر صاحبان کی قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ حضرات مومن خاں کے مندرجہ بالا شعر کا ایسا مطلب بتاتے ہیں جس [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ غمزۂ غماز معشوق کا نام ہے۔
مولانا ناطق کا یہ خط ۱۹۵۸ء میں کتابی شکل میں "مکاتیب [illegible]" سے چھپ چکا ہے جس میں مندرجۂ بالا عبارت پڑھ کر مجھے پروفیسر ضیاء احمد بدایونی صاحب کی [illegible] دیوان مومن دیکھنے کا خیال ہوا۔ دیکھا تو اس شعر کا یہ مطلب نظر آیا:-

"اگر تم چاہتے ہو کہ رازِ محبت غیروں پر نہ کھلے تو میری طرف بھی دیکھو ورنہ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" پھر ارشاد ہوتا ہے۔ غماز = سخن چیں، اشارہ کرنے والا۔

اس سے تو صاف یہی معلوم ہوا کہ غماز کہکر معشوق کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی کمال کیا گیا ہے کہ لفظ غمزہ کا واسطہ مطلب سے باقی نہیں رکھا۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر صاحب نے یوں شرح کرکے لفظ غمزہ کو زائد قرار دیدیا جو مومن خاں پر ایک الزام ہوگیا۔ اس کے علاوہ معشوق کے لئے بت، کافر، ظالم، جابر، بے رحم، قاتل وغیرہ الفاظ اردو شاعری میں ہمیشہ سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ جو پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے مومن خاں پر معشوق کو غماز کہنے کا الزام لگادیا = کیسی بات ہوئی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک انوکھی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ معشوق اگر عاشق کی طرف دیکھے گا ہی نہیں تو کیسے یہ خیال پیدا ہوجائے گا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ نہ دیکھنے میں تو اجنبیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس معشوق کا عاشق کو بار بار دیکھنا ہی شک کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے قابل لحاظ ہے۔

مہربانی فرماکر آپ اس پر روشنی ڈالئے، میں شرح مومن لے کر شعر کا مطلب دریافت کرنے کے لئے مولانا ناطق کے پاس گیا تھا تو انھوں نے فرمادیا کہ بھائی میں ابھی نہیں بتاتا۔ یہ تو تمھارا سوال ایسا ہے کہ میرے سلام کے ساتھ حضرت نیاز فتحپوری صاحب کو بھیجدو [illegible] وہ اس شرح پر کافی روشنی ڈال دیں گے اور جو اس شعر کا اصل مطلب ہے وہ بھی بتادیں گے۔

(نگار) شعر کا مفہوم [illegible] جو پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے لکھا ہے، لیکن ایک شخص کے دل میں وہ الجھن ضرور پیدا ہوسکتی ہے

جس کا اظہار آپ نے کیا، حالانکہ اس اُلجھن کا کوئی موقع نہیں ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ مومن نے معشوق کو غمّاز کہکر خطاب کیا ہے اور لفظ غمزہ زاید ہے، درست نہیں۔ اس مصرعہ کا حرف ندا ظاہر کرنے کے بعد نثری عبارت یوں ہوگی ۔ " اے غمزۂ غمّاز میری طرف بھی دیکھنا " یعنی خطاب " غمزۂ غمّاز " سے ہے جو اشارہ بالکنایہ ہے معشوق کی طرف۔

آپ نے " غمزۂ غمّاز " کو ترکیب اضافی سمجھ کر معشوق کو غمّاز قرار دیدیا۔ حالانکہ غمّاز صفت مبالغہ ہے غمزہ کی اور خطاب بظاہر " غمزۂ غمّاز " یعنی کنایتاً معشوق سے ہے۔

عربی میں غمزہ متعدد معانی میں مستعمل ہے، ان میں ایک مفہوم اشارۂ چشم و ابرو کا بھی ہے اور اس شعر میں مومن معشوق سے خطاب کرکے یہی کہنا چاہتا ہے کہ کبھی میری طرف بھی دیکھ لیا کرو تاکہ لوگوں پر میری تمھاری محبت کا راز نہ کھل جائے، لیکن یہ خطاب بواسطۂ غمزۂ غمّاز کیا گیا ہے۔

رہا آپ کا یہ خیال کہ نہ دیکھنے میں اجنبیت کی تکمیل ہوتی ہے، سو یہ اسی وقت درست ہوسکتا تھا جب مومن و معشوق کی محبت کا علم کسی کو نہ ہوتا، لیکن اس علم کے بعد اس راز کے چھپنے کی صورت وہی ہوسکتی ہے جو مومن نے بتائی ہے۔ ورنہ لوگ عدم التفات کی صورت میں تاڑ جائیں گے کہ یہ تغافل قصداً اختیار کیا گیا ہے۔

---

(۲)

لفظ بائی کی تحقیق

(محمد عزیز - ناسک)

ہم اردو میں بی بی، بائی اور بی عام طور پر مستعمل ہیں، خاصکر لفظ بائی جو زیادہ تر ہندو خواتین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ سنسکرت کا تو ہے نہیں، پھر کہاں سے آیا۔ اس کی تحقیق مطلوب ہے۔

(نگار) فارسی میں گھر کی مالکہ اور ہر معزز خاتون کو بی بی کہتے ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے اور پیار میں لڑکیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی کا مخفف بی ہے ــــــــــ لیکن بائی البتہ تشریح طلب ہے۔

مسلم تاریخ ہند کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی ہندو راجاؤں کی لڑکیوں اور معزز ہندو خواتین کو بائی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ جیسے جودھا بائی (جے پور کی راجکماری) یا عالمگیر کی بیوی نواب بائی والی کشمیر کی بیٹی)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لفظ کہاں سے لیا گیا۔

سنسکرت میں تو یہ لفظ پایا نہیں جاتا اور نہ کوئی دوسرا ایسا لفظ جس سے بائی کا اشتقاق ہوسکے، اس لئے یہ لفظ یقیناً دخیل ہے، جو کسی دوسری زبان سے آیا ہوگا۔ ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ یہ لفظ ایران سے آیا اور شاہان مغلیہ کے عہد میں جو شعراء ایران سے آتے وہ اپنے ساتھ اس لفظ کو لائے، لیکن انھیں ان کے کلام میں لفظ بائی کہیں نظر نہیں آتا۔ بی بی کا لفظ تو بے شک انھوں نے صالح عورت کے لئے استعمال کیا ہے لیکن بائی نہیں۔

ہاتفی کا شعر ہے :-

یا زنش گفت خواجہ کاے بی بی — دل بریں نہ کہ زو وطن گیبی

جدید فارسی میں لفظ بائے (بائی نہیں) تونگر و مالدار کے مفہوم میں البتہ بعض علاقوں میں بولا جاتا ہے لیکن عہد مغلیہ کے ایران میں اس کا استعمال کہیں نظر سے نہیں گزرا اور اس کا تلفظ بھی بائی نہیں ہے۔

جس وقت ہم غور کرتے ہیں کہ اس لفظ کا استعمال ہندوستان کے کس حصہ میں زیادہ رائج ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند اور مرہٹہ واری علاقہ میں اس لفظ کا استعمال بہت عام ہے اور وہاں تمام معزز خواتین کے نام کے ساتھ بائی کا الحاق ضروری ہے یہاں تک کہ معزز گانے والیاں بھی بائی کہلاتی ہیں، جیسے ہیرا بائی، کیسر بائی وغیرہ اور اسی کی تقلید میں شمالی ہند کی مسلمان گانے والیاں بھی بائی کہلانے لگیں، جیسے جدن بائی، زہرہ بائی، رسولن بائی وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ مغلوں کی آمد سے پہلے مرہٹواری میں یہ لفظ رائج تھا اور وہیں سے مغلوں تک پہونچا۔ چونکہ مرہٹی میں فارسی عربی کے ہمیشہ سے الفاظ مخلوط ہو گئے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس میں یہ لفظ فارسی سے آیا ہو یا عربی سے۔ فارسی سے آنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس میں یہ لفظ مستعمل ہی نہیں، رہی عربی سو آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ لفظ ہمیں تاریخ مصر کے اس عہد میں بھی ملتا ہے جب الملک الظاہر یہاں کا فرمانروا تھا اور صلیبیوں کو شکست دے کر مصر و شام پر قابض ہو گیا تھا۔ یہ بڑا دیندار شخص تھا اور ایسی ہی اس کی بیٹی بھی بڑی زاہد و مرتاض تھی۔

اس کا نام تذکار بائی تھا جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد ایک خانقاہ صرف عورتوں کے لئے قائم کی تھی، اس نام کے دو ٹکڑے ہیں ایک تذکار اور دوسرا بائی۔ تذکار اور ذکر ایک ہی چیز ہیں جس کا ایک مفہوم خدا کی حمد و ثنا کرنا بھی ہے اور غالباً اسی مفہوم کے پیش نظر اس خاتون کا نام تذکار بائی مشہور ہو گیا ہوگا، کیونکہ وہ بڑی ذکر و شغل والی خاتون تھی۔

اب رہ گیا لفظ بائی، سو یہ بھی عربی الاصل ہے جس کا مادہ "باؤ" ہے اور اس کے متعدد مفہوم ہیں ایک مفہوم رجوع کرنے والے کا بھی ہے، چنانچہ کلام مجید کی ایک آیت ہے "باؤا بغضب من اللہ" (اللہ کے غصہ کی طرف انھوں نے رجوع کیا یعنی غضب خدا کے طالب ہوئے) اس لئے بائی کے معنی رجوع کرنے والے کے ہوئے اور چونکہ یہ خاتون ہر وقت ذکر خداوندی کی طرف راجع رہتی تھی اس لئے اس کا نام "تذکار بائی" یعنی ذکر و شغل کرنے والی پڑ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ جب بہ سلسلۂ تجارت مسلمان اول اول جنوبی ہند میں آئے ہوں تو یہ لفظ بھی اپنے ساتھ لائے ہوں اور اس لفظ کا استعمال معزز خواتین کے نام کے ساتھ یہاں بھی ہونے لگا ہو، کیونکہ اس کا ایک مفہوم عربی میں فخر و غرور کا بھی ہے۔ اردو میں بائی ایک بیماری بھی ہے جس کا تعلق باؤ (ہوا) سے ہے جیسے "باؤ گولا" اور یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کا تعلق زیر بحث بائی سے نہیں۔

---

(۳)

ذنب و استغفار

(سید ذکی الدین - کلکتہ)

قرآن پاک میں کئی جگہ رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ "استغفر لذنبک" اور ذنب کے معنی گناہ کے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کے معنی گناہ لکھے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مجازاً گناہ کہا گیا ہے

اور یہ نہیں بتایا کہ اگر ذنب بمعنی گناہ مجازی معنی میں مستعمل ہوا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

(نگار) لفظ ذنب اور اس کی جمع ذنوب قرآن مجید میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا ترجمہ گناہ ہی لیا جاتا ہے، عربی میں ذنب کے علاوہ اور بھی چند الفاظ ہیں جو قریب قریب اسی کے ہم معنی ہیں، جیسے جُرم، اثم، معصیت۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان سب کے معنی میں فرق ہے جو محل استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں صرف لفظ ذنب ہی نہیں بلکہ لفظ استغفار بھی قابل غور ہے کیونکہ استغفار کے معنی بھی عام طور پر توبہ سمجھے جاتے ہیں اور اس طرح استغفر لذنبک کے معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ "اپنے گناہ سے توبہ کرو" اور اس سے یقیناً یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ "رسول اللہؐ سے گناہ بھی سرزد ہوسکتا ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس حد تک رسول اللہؐ کا تعلق ہے استغفار اور ذنب دونوں کا مفہوم وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہؐ کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ذنب یا گناہ کے مرتکب ہوسکتے تھے، کس حد تک درست ہوسکتا ہے۔ جس وقت ہم قرآن پاک کی ان آیات پر غور کرتے ہیں جن سے رسول اللہؐ کے کردار و اخلاق پر روشنی پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے کسی گناہ کا سرزد ہونا بہت مستبعد تھا، جس ذات کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ: "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" اور "ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ"۔ وہ کیونکر کسی گناہ کا مرتکب ہوسکتا تھا۔

اب آیئے ان آیات پر غور کریں جن میں ذنب اور استغفار ذنب کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ مومن میں ارشاد ہوتا ہے:-

"فاصبر ان وعد اللہ حق واستغفر لذنبک وسبح بحمد ربک بالعشی والابکار"۔

سورۂ محمد میں ارشاد ہوتا ہے:-

"فاعلم انہ لا الہ الا اللہ واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنات"۔

سورۂ فتح میں ارشاد ہوتا ہے:-

"انا فتحنا لک فتحاً مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہ الیک"۔

اسی طرح سورۂ نصر میں ارشاد ہوتا ہے:-

"اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا"۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ تمام آیات وہ ہیں جن میں غلبۂ اسلام و فتح اسلام کی بشارت دی گئی ہے اور اس کا کوئی موقع ہی نہیں کہ اس سلسلہ میں استغفار اور ذنب کے وہ معنی لئے جائیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں۔

استغفار کا مادہ غفر ہے جس کے معنی ڈھانپنے یا کسی چیز کو کسی جگہ محفوظ کردینے کے ہیں۔ اس کا مفہوم توبہ قرار دینا درست نہیں۔

اب لفظ ذنب کو لیجئے۔ عربی میں ذنب (بفتح نون) کے معنے پیچھے چلنے اور اتباع کرنے کے ہیں اور یہ مفہوم کسی نہ کسی طرح اس کے تمام مشتقات میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ذنب کے معنی بھی نتیجۂ فعل یا فروگذاشت کے ہوں گے جو جُرم، گناہ یا معصیت کے مفہوم سے بالکل علحدہ ہے۔

جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جہاں جہاں استغفار اور ذنب کا ذکر ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ غلبۂ اسلام و فتوحات اسلام کے سلسلہ میں اس کے نتائج کی بہتری اور انسانی کمزوریوں کی وجہ سے جو فروگذاشت ہوجائے اس کی تلافی کی دعا کریں۔

بانکے

(اقتباس)

اُردو میں بانک، بانکے اور بانکی متعدد معنی میں مستعمل ہے اور ہر معنی میں ترچھے پن کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن اسوقت ہمارا مقصود بانکے سے وہ مخصوص افراد ہیں جو اپنی شجاعت و دلیری کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔

اس موضوع پر مولانا شرر کا ایک نہایت دلچسپ مضمون دلگداز میں شایع ہوا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

انگریزی حکومت سے پہلے جب دہلی کا دربار مغلیہ برقرار تھا، پھر اس کے بعد لکھنؤ میں جب اودھ کی چند روزہ سلطنت قایم تھی ہمیں بانکوں کا ایک عجیب و غریب گروہ نظر آتا ہے جس کا انجام یہ ہے کہ اُن کا کہیں پتہ نہیں اور آغاز یہ تھا کہ تاریخ سے کہیں سراغ نہیں لگتا کہ یہ گروہ کب پیدا ہوا اور اس کی بنیاد کیونکر ہوئی۔

ہمارے یہ قومی سپاہی جو "بانکے" کہلاتے تھے اپنی زندگی سپہ گری کے نذر کر دیتے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر وقت پورے اسلحہ جنگ سے آراستہ اور اوپچی بنے رہتے۔ کرنگی دیک وضعی کو اپنا شعار جانتے اور اس بات کی دھن تھی کہ ہماری ہی بات سب پر بالا رہے، باوجودیکہ وہی مروج و متداول اسلحہ سب کے پاس ہوتے مگر ساتھ ہی ہر ایک اپنی کوئی خاص دھج اور اپنا کوئی مخصوص بانا رکھتا۔ جس کو مرتے دم تک۔ چھوڑتا اور اس کی تاب نہ لاسکتا کہ اس دھج یا شعار کو کوئی اور بھی اختیار کرے۔

پہلے پہل ان بانکوں کا نام محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں سنا جاتا ہے، پُرانے راوی اور یادگار زمانہ بڈھے بیان کرتے ہیں کہ محمد شاہ کے پاس ایک لشکر بانکوں کا تھا اور ایک زنانوں کا۔ اور نادر شاہ کے مقابلہ میں اگر کچھ لڑے تو یہی لوگ لڑے۔ بانکے جانیں دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اور زنانے عورتوں کی طرح "اوہی" کہہ کے تلوار مارتے تھے۔ اُس زمانہ کے بعد جب دہلی اپنے باکمالوں اور ہر فن کے استادوں کی قدر کرنے کے قابل نہ رہی تو اُن کا رُخ اودھ کی طرف پھر گیا اور قدر دانی کی امید میں ہر دتی و اعلیٰ دہلی چھوڑ کے یہاں آنے لگا۔ اب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ کی سڑکوں پر ٹہلتے نظر آتے تھے۔ مگر یہاں زنانے سپہ گروں کا تو پتہ نہ تھا۔ ہاں بانکے تھے جن کی روز بروز کثرت ہوتی جاتی تھی۔

بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ تمام بانکوں کی ایک سی وضع ہوگی۔ مگر ایسا نہ تھا۔ ان میں سے ہر فرد اپنے بانکپن کو ایک نئے عنوان سے اور نئی شان سے ظاہر کرتا۔ پہلے عام وضع یہ تھی کہ سر کو چندیا سے گدّی تک منڈاتے اور دونوں طرف پٹّوں میں سے ایک تو کانوں تک رہتا اور دوسرا شانوں تک لٹکتا۔ بلکہ کبھی اُس کی چوٹی گوندھ کے ایک طرف سینے پر ڈال لی جاتی۔ اس کے بعد جدّتیں ہونا شروع ہوئیں اور ہر بانکے نے اپنے لئے کوئی نئی دھج ایجاد کی۔ کسی صاحب نے ایک طرف کی مونچھ اس قدر بڑھائی کہ وہ بڑھتے بڑھتے چوٹی سے بوس و کنار کرنے لگی۔ کسی صاحب نے پگڑی کا شملہ بجائے پیٹھ کے ایک طرف شانے پر ڈال لیا۔ کسی صاحب نے پائجامہ کا ایک پائنچا اس قدر بڑا کر لیا کہ زمین بوس ہو رہا ہے اور دوسرا پائنچا اس قدر ٹھنگا رکھا کہ آدھی پنڈلی کھلی ہوئی ہے۔ کسی صاحب نے لوہے [illegible] ڈال کے اُس کی زنجیر کمر میں اٹکائی اور اُسے کھڑکاتے ہوئے پھرنے لگے، کسی صاحب نے [illegible] کو بہت [illegible] میں دو [illegible] کنڈے لگاکے اور اُنھیں باہم جوڑ کے ایک نئی قطع کی نقرئی زنجیر بنائی پھر اُس کے دونوں سروں پر چاندی کے دو حلقے لگائے۔ ایک [illegible] ایک طرف کے پاؤں میں ڈال لیا اور دوسرے کو اُسی طرف کے بازو میں پہن کے شانے [illegible] اٹکا لیا۔ اور نہایت غرور و تمکنت کے ساتھ

زنجیر بجاتے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ غرض جتنے بانکے تھے اُتنی ہی دھجیں تھیں۔ اسی قسم کی جدت طرازیاں اسلحہ کے متعلق تھیں، کوئی صاحب دو دھارا تیغہ ہاتھ میں رکھتے جو ہر وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا۔ کوئی صاحب رستم و نریمان کے زمانے کا وزنی سلاخ لئے پھرتے۔ کوئی صاحب تیر کمان ہی پر رکھے نظر آتے اور ساری دنیا کو اپنی نظر میں ہیچ خیال کرتے۔

ان لوگوں کے گھر سے نکلنے کی یہ شان تھی کہ تبختر و نخوت کے ٹھاٹھ سے اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے چلتے۔ ہر ایک پر کڑے تیور ڈالتے اور اگر کسی کو دیکھ لیتے کہ انھیں کا بانا اور شعار اُس نے بھی اختیار کر لیا ہے تو بلا تامل ٹوک بیٹھتے، اور کہتے "آئیے ہم سے آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ یہ بانا یا تو ہمارا ہی ہوگا یا آپ ہی کا ہوگا۔"

اس سے زیادہ قیامت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تبختر، ان کا فخر و ناز، ان کی چال ڈھال، ان کی وضع قطع اور ان کے مخصوص شعار سب چیزوں کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آجائے۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اُن کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے۔ انھوں نے کسی کو جھوٹوں بھی مسکراتے دیکھا اور قرابینچے پر ہاتھ جا پڑا۔ پھر اُس وقت اگر کوئی ایسے ہی بُرد بار بانکے ہوئے تو اُسے خوشامد در آمد کر کے عفو و تقصیر کا موقع بھی ملا ورنہ بلا تامل قرابینچ جھونک دیا اور اپنی راہ لی۔

یہ مجال نہ تھی کہ کوئی بانکے صاحب کسی صحبت میں ہوں اور کوئی ان کی بات دُلکے یا اُن پر اعتراض کرے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے۔ لاف زنی کرتے۔ زٹلیں اُڑاتے اور جھوٹ کے پُل باندھتے مگر کسی کو جراٗت نہ ہو سکتی کہ چوں کرے یا مسکرائے۔ مشہور ہے کہ ایک بانکے صاحب چند مہذب لوگوں کی محفل میں کہنے لگے "اجی فلاں راجہ کی گڑھی پر جب ہم نے سَو آدمیوں سے دھاوا کیا ہے تو ہر سپاہی کے گلے میں پانچ پانچ ڈھولیں تھیں اور ہمارے سَو آدمی پانسو ڈھولیں بجاتے ہوئے جا پہنچے"۔ اور تو کس کی مجال تھی کہ ایک بانکے کی زبان پکڑے؟ سب خاموش بیٹھے رہے مگر ایک نوجوان کے منہ سے نکل گیا "خیر پانچ ڈھولیں تو گلے میں ڈال کے شاید رادن کے سر کی طرح چاروں طرف پھیلالی ہوں۔ مگر ہر آدمی پانچ پانچ ڈھولیں کن ہاتھوں سے بجاتا ہوگا؟" یہ سنتے ہی بانکے حضرت آگ بگولا ہو گئے، تلوار سیدھی کی اور ڈانٹ کے کہا "ایں! یہ ہم پر اعتراض! تو ہم جھوٹے ہوئے؟" سب نے کہا "آپ کو جو جھوٹا سمجھے وہ خود جھوٹا۔ یہ لڑکا بزرگوں کی کیا قدر جانے؟ آپ اپنی طرف دیکھیں"۔

دُھن کے اس قدر پکے تھے کہ کسی کا دباؤ ہی نہ مانتے، یہاں تک کہ بعض بعض بہت اعلیٰ درجہ کے بانکے بادشاہوں اور حکام وقت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں دہلی کے آئے ہوئے مشہور بانکوں میں ایک میرزا جہانگیر بیگ تھے۔ اُن کا نوعمری کا زمانہ تھا، باپ نواب صاحب کے درباریوں میں تھے۔ جہانگیر بیگ کی شورہ پشتی کی خبر کئی بار سُن کے نواب سعادت علی خاں خاموش ہو رہے۔ مگر آخر کار ایک دن بہت برہم ہوئے اور اُن کے والد سے کہا "آپ کے صاحبزادے کی شورہ پشتیاں حد سے گزرتی جاتی ہیں اور انھوں نے سارے شہر میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ اُن سے کہہ دیجئے گا کہ اپنے اس بانکپن پر نہ بھولیں، ناک نہ کٹوالی ہو تو میں سعادت علی خاں نہیں"۔ باپ خود ہی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے۔ عرض کیا "خداوند، اُس کی شرارتوں سے غلام کا ناک میں دم ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں نہیں مانتا، شاید حضور کی یہ دھمکی سُن کے سیدھا ہو جائے"۔ یہ کہہ کے گھر آئے اور بی بی سے کہا "تمھارے صاحبزادے کے ہاتھوں زندگی سے عاجز آگیا ہوں، دیکھئے اس نالایق کی حرکتوں سے ہماری کیا گت بنتی ہے؟ جی چاہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دوں اور کسی طرف منہ چھپا کر نکل جاؤں"۔ بی بی نے کہا "اے تو کچھ کہو گے بھی؟ آخر ہوا کیا؟" کہا "ہوا یہ کہ آج نواب صاحب بہت ہی برہم بیٹھے تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی کہنے لگے اپنے بیٹے سے کہہ دینا کہ میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوالی ہو"۔ اتنے میں میرزا جہانگیر بیگ جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے گھر میں آگئے۔ ماں نے کہا "بیٹا خدا کے لئے یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ تمھارے ابا بہت ہی پریشان ہیں"۔ میرزا صاحب نے کہا "میرا کچھ قصور بھی بتایئے گا یا خالی الزام ہی دیجئے گا"۔ باپ نے کہا "کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے؟ تم نے وہ سر اُٹھا رکھا ہے کہ سارے شہر میں آفت مچ گئی۔ آج نواب صاحب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا میں سعادت علی

خاں نہیں جو ناک نہ کٹوالی ہو" باپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے پیش قبض نکال لی اور خود بھی اپنی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینک دی اور بولے "بس اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں ؟ لیجئے یہ ناک لیجا کے انھیں دیدیجئے" یہ دیکھتے ہی ماں باپ دونوں سناٹے میں آگئے اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طریقے سے نواب صاحب کے سامنے پیش کی اور واقعہ بیان کیا تو وہ بھی دم بخود رہ گئے اور معذرت کرنے لگے کہ "بھئی میرا یہ منشا نہ تھا، میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اس دھمکی سے انھیں تنبیہ ہو جائے گی" باپ نے کہا "خداوند، ایسا نالایق اور اپنی دُھن کا پکا ہے کہ کسی کا زور ہی نہیں چلتا۔ جسے نہ جان کا خیال ہو نہ عزت آبرو کا، اُس کے منھ کون لگے ؟"

اس واقعہ کے بعد میرزا جہانگیر بیگ نکٹے مشہور ہو گئے اور اب اتنے بڑے زبردست اور سند یافتہ بانکے تھے کہ شہر کے سارے بانکے اُن سے دبتے تھے، سیکڑوں بانکے اُن کے شاگرد۔ ان کے حکم کے تابع، بے عذر فرماں بردار، اور اُن کے جتھے میں بھی شریک تھے جن سے سارا شہر کانپتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور بھانڈ نے نواب سعادت علی خاں کے سامنے کوئی گستاخانہ نقل کی تو انھوں نے ہنس کے کہا "میرے سامنے تو جو چاہتا ہے کہہ جاتا ہے جب جانوں کہ تو میرزا جہانگیر بیگ نکٹے پر کوئی فقرہ تیز کرے" اُس نے عرض کی "خداوند کہہ تو جاؤں گا مگر حضور بچا لینے کا اقرار فرمائیں" نواب نے وعدہ کیا۔ اور اُس کے دو چار روز بعد ایک دن میرزا جہانگیر بیگ پورے اسلحہ لگائے دریا کنارے اپنی نشست میں مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ پچاس ساٹھ شاگردوں اور بانکوں کا گرد مجمع تھا کہ وہ بھانڈ ایک لنگ باندھے ہوئے دریا سے نکل کے آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرزا جہانگیر بیگ نے کہا "اخاہ تم ہو؟ اچھے تو ہے" یہ سنتے ہی وہ آداب بجا لایا، سامنے آکے زمین پر بیٹھ گیا اور اُن کے چہرے کی طرف ہاتھ اُٹھا کے کہنے لگا "خداوند، اتنی کٹ گئی، اور یہ جو رہی ہے وہ بھی کٹ جائے گی!" ایک بھانڈ کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی میرزا جہانگیر بیگ کو ایسا طیش آیا کہ مارے غصہ کے اس قدر کانپے کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی اور وہ بے تحاشا بھاگ کے پانی میں کود پڑا، دو چار غوطے لگائے۔ اور پانی ہی پانی کسی طرف نکل گیا۔ اب میرزا صاحب کے جتھے کے لوگ ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ کہیں ملے تو حرامزادے کو مار ڈالیں۔ آخر ایک دن نواب سعادت علی خاں نے اُسے میرزا جہانگیر بیگ کے قدموں پر گرا کے کہا "بھئی اس کی بات کا بُرا ماننا ہی کیا ؟ یہ تو مجھے بھی کہہ جاتا ہے" اور اُس کا قصور معاف کروادیا۔

شاہی کے آخر زمانہ تک ان لوگوں کا بڑا زور رہا۔ بانکپن میں کچھ ایسی امتیاز کی صورتیں تھیں کہ اکثر شریف زادے خصوصاً وہ جنھیں سپہ گری کا شوق ہوتا بانکے بن جاتے اور اپنی کوئی خاص دھج بنا لیتے۔ اگر قاعدے اور سلطنت کی قوت کے ساتھ کوئی ایسا گروہ موجود ہوتا تو دراصل یہ لوگ سلطنت کے قوتِ بازو ثابت ہوتے اور اُن کی ذات سے قوم و ملک کو بڑا نفع پہونچتا۔ لیکن بدنصیبی سے جن دنوں بانکوں کا گروہ پیدا ہوا ہے دہلی و لکھنؤ کی دونوں سلطنتیں نہایت کمزور اور عجیب غیر منظم حالت میں تھیں اور یہی بانکے جو مایۂ ناز اور ذریعۂ عروج ہو سکتے تھے اُن کے لئے باعث زوال بن گئے۔ سلطنت اُن کو دبا نہ سکتی تھی، اور اُن کی خودسری و سرکشی سے آئے دن شہر کے گلی کوچوں میں خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں، جن لوگوں کو اُن کے ہاتھ سے آزار پہونچتا سلطنت اُن کی دادرسی نہ کر سکتی اور انھوں نے اپنے ایسے ایسے جتھے بنا لئے تھے کہ بڑے بڑے رسالداروں کو بھی اُن سے دب جانا پڑتا تھا۔

ان میں باوجود احمقانہ نخوت و غرور کے یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان کے بلکہ ساری اگلی دنیا کے کج خلق سپہگروں کے خلاف یہ نہایت مہذب سپاہی تھے اور اُن لوازم اخلاق کو جو دو مہذب و شائستہ دوستوں میں ہوا کرتے ہیں اپنے حریف کے ساتھ برتتے تھے۔ کسی ادنیٰ درجے کے سپاہی سے لڑنا اور مقابلہ کرنا اپنی شان و وضع کے خلاف اور موجب توہین تصور کرتے، شریف حریف ہی سے لڑتے اور پھر اُس کے ساتھ شرفا کا سا برتاؤ بھی کرتے۔ اگر یہ ہوا کہ دو بانکوں میں لڑائی ہوئی اور لڑائی میں بھی دونوں کو اس کا لحاظ ہے کہ کوئی بات حریف کی عزت و حرمت یا مرضی و شان کے خلاف نہ ہونے پائے۔ ایک کہتا "پہلے آپ وار کریں"

دوسرا کہتا "نہیں پہلے آپ - یہ نہیں ہوسکتا" پھر جب حریف کمزور ہوجاتا تو فوراً لڑائی سے ہاتھ روک لیتے اور پھر اُس کے حق میں اُن سے زیادہ کوئی مہربان نہ تھا۔ دُنیا میں اس کے نہایت ہی سچے ہمدرد یہ تھے - اگر مغلوب دشمن اپنے پاؤں سے جانے کے قابل ہوتا تو اُس کے گھر تک اُس کی مشایعت کرتے - راستے میں بیسیوں جگہ یہ واقعہ پیش آتا کہ یہ کہتے آپ آگے چلئے اور وہ کہتا آپ آگے چلئے بعض بانکوں کے واقعات میں مشہور ہے کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اُس کے گھر تک پہونچانے گئے اور وہاں سے چلے تو حریف دوست نے کہا "تو کیا آپ تنہا جائیں گے ؟ یہ نہیں ہوسکتا" وہ انھیں ان کے گھر تک پہونچانے کو آیا اور جب وہ پہونچا کے چلا تو اتفاقاً پھر اُس کے ساتھ ہولئے اسی اخلاق میں صبح ہوگئی کہ جب یہ اُس کے گھر پہونچتے ہیں تو وہ ان کی مشایعت کے لئے ان کے ساتھ ہولیتا ہے اور جب وہ ان کے گھر پہونچتا ہے تو یہ اس کی مشایعت کے لئے اُس کے ساتھ ہولیتے ہیں۔

اکثر بانکوں کی یہ وضع تھی کہ شربتی کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بزدلی و نامردی خیال کرتے - نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا ہوتا تو اُس کی تلوار کو گویا ننگے سینے پر لیتے - چرکے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے - اسی طرح جاڑوں کا جاڑا اُسی شربتی کے انگرکھے پر گزرتا اور مجال کیا کہ کانپیں، تھرتھرائیں یا زبان سے "سُو! سُو!" کی آواز نکلے بعض اس پر بھی یہ قیامت کرتے کہ اُس باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جو سردی معلوم ہوتی اور اکڑتے جاتے۔

ان کی آخر زمانے کی وضع قطع دکھانے کے لئے ہم ایک بانکے صاحب کی صورت اپنے ناظرین کو دکھائے دیتے ہیں جنھیں خوش نصیبی سے ہم نے اپنے بچپن میں غدر کے تیرہ چودہ برس بعد [illegible] برج (کلکتہ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ صاحب عہدِ شاہی کے باقیات الصالحات میں سے تھے - غدر میں جا بجا لڑے - جب انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو ہتھیار پھینک کر بہت دنوں تک ادھر اُدھر چھپتے پھرے اور آخر جب پریشان ہوئے تو کلکتہ [illegible] کہ واجد علی شاہ کے ظلِ عاطفت میں باقی ماندہ زندگی بسر کردیں - اُن سے اگرچہ ہتھیار چھن گئے تھے مگر وضع نہیں بدلی تھی - یہ ایک کشیدہ قامت دُبلے چھریرے آدمی تھے۔ پیشانی سے گدّی تک بیچ میں سر منڈا ہوا تھا - ایک پٹا بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور دونوں دونوں دو پلڑی ٹوپی اور پگڑی کے نیچے نکلے ہوئے تھے - داڑھی چڑھی تھی اور مونچھیں ہمیشہ کھڑی رہتیں - بدن میں کھنچا ہوا چست نیچے دامنوں کا انگرکھا تھا۔ بانکوں میں عورتوں کا سا لمبے پائچوں کا کلیوں دار پائجامہ - پیٹھ پر مثلث وضع کا رومال اوڑھے رہتے، ہاتھ میں ہر وقت ایک پنکھا رہتا اور لکھنؤ کا خورد نوکا جوتا پاؤں میں تھا - مگر یکرنگی کا سب سے زیادہ نمایاں ثبوت یہ تھا کہ یہ سب کپڑے چھینٹ کے اور ایک ہی قسم کی چھینٹ کے تھے - جس چھینٹ کا انگرکھا تھا، اُسی کی ٹوپی تھی اُسی کی پگڑی تھی، اُسی کا رومال پیٹھ پر - اُسی کا پائجامہ تھا اُسی کا پنکھا تھا اور وہی چھینٹ جوتے کے بیرونی رخ پر بھی منڈھی ہوئی تھی - ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سارے بانکوں کی یہی وضع تھی - ممکن ہے کہ انھیں بزرگ نے خاص اپنی یہ وضع رکھی ہو -

مٹیا برج میں چند روز یہ اسی وضع میں رہے - جدھر سے نکل جاتے انگلیاں اُٹھنے لگتیں، اور لوگ گھبرا گھبرا کے ان کی صورت دیکھتے اور ہنستے - اب انگریزی میں یہ تو مجال نہ تھی کہ کسی کو ہنسنے پر ٹوکیں - وہ جو مثل مشہور ہے کہ دبی بلّی چوہوں سے کان کٹاتی ہے، یہ بیچارے خود ہی نظر نیچی کرلیتے - اور کوئی چاہے [illegible] یا کچھ کرے یہ اپنی آنکھیں جھکائے چلے جاتے - مگر باوجود اس کے اکڑ اور تیوروں کا وہی حال تھا کسی محفل میں بیٹھ کے باتیں [illegible] معلوم ہوتا کہ ساری [illegible] حکومت کر رہے ہیں اور کسی کی اپنے سامنے کوئی ہستی نہیں سمجھتے - جب واجد علی شاہ کا سامنا [illegible] شاہ نے کہا [illegible] اب زمانہ بدل گیا - نہ وہ ہم رہے، نہ وہ تم رہے [illegible] اب تم بھی اپنی وضع بدل دو" عرض کیا "خداوندا! اب تھوڑی سی رہ گئی ہے [illegible] اسی وضع میں گزر [illegible] - بادشاہ نے [illegible] نہیں تمھیں میرے سر کی قسم

اب وضع بدل دو، اور سمجھو جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا" یہ کہ کے بادشاہ نے ایک خواص کی طرف اشارہ کیا جس نے ایک دوشالہ لا کے اُڑھا دیا۔ جب دوسری وضع کا کپڑا اُڑھا ہی دیا گیا تو مجبور ہو گئے۔ آداب بجالا کے وہ دوشالہ لے لیا اور گھر آئے۔ پھر اس کے بعد جو گھر سے نکلا تو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

چند سال بعد اُنھوں نے مٹیا برج میں انتقال کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت پر نہیں بلکہ اُن کی وضع بدلنے ہی پر پرانے بانکوں کا خاتمہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب شریف زادوں اور عام سپہ گروں میں بانکے بننے کا شوق بڑھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ ہر گروہ میں بانکے پیدا ہونے لگے اور شہر میں بانکوں کی کثرت ہوئی تو بہت سے ایسے بانکے بھی نظر آنے لگے جن میں نہ ویسی شرافت تھی اور نہ ویسی شجاعت۔ اور جب موقع پڑتا اُن کی کمزوری کھل جاتی۔ لیکن اصلی بانکپن ملک و قوم کا ایک بہت ہی اعلیٰ درجہ کا شریفانہ جوہر تھا، جو مسلمانوں کے سوا آخر ایام میں بہت سے ہندؤں سے بھی ظاہر ہوا۔ اس اعلیٰ جوہر کا ہندوستان سے مٹ جانا اُس کی تاریخ کا ایک حسرتناک ورق ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بانکوں کی کثرت اور ہتھیاروں کے بے روک اور بے ضرورت استعمال نے ملک کے امن و امان میں فرق ڈال دیا تھا۔ شہر میں روز خانہ جنگیاں ہوتیں اور اکثر رہ گزروں پر لاشیں پھڑکتی نظر آتیں، یہی نہیں بلکہ روز بروز ثابت ہوتا جاتا کہ بانکے سپہ گر خانہ جنگیوں اور باہمی جدال و قتال میں جس قدر زیادہ باکمال اور شجاع ہیں اُسی قدر غنیم کے حملے روکنے اور میدان جنگ میں ابنائے وطن کے ساتھ شریک ہو کے لڑنے میں ناقص و ناکارہ ہیں، لیکن اس پر بھی ہم کہتے ہیں کہ یہ گروہ مٹنے کے قابل نہ تھا اس کے مٹانے کی نہیں بلکہ اس کے باضابطہ بنانے کی ضرورت تھی۔

قافیہ کے بعض عیوب

اقواء = حرف روی (یعنی قافیہ کے حرف اصلی) سے قبل کی حرکت کا مختلف ہونا۔ جیسے

حالی = غالب ہے نہ شیفتہ، نہ نیّر باقی وحشت ہے، نہ سالک ہے، نہ انور باقی

نیّر کا صحیح تلفظ کسرۂ ی کے ساتھ ہے اور انور میں واؤ مفتوح ہے۔

دبیر = غلہ جو میرے خیمہ میں ہے آہ بٹے گا، فاقہ شکنی کے لئے وہ تم کو ملے گا

بٹے اور ملے ہم قافیہ نہیں ہوسکتے۔

میر = جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

چلیاں اور ہلیاں میں اقواء کا عیب ہے۔

اکفاء = حرف روی میں اختلاف ہو جیسے جب اور تپ کا ب اور پ کے اختلاف کی وجہ سے ہم قافیہ نہیں ہوسکتے۔

میر حسن = اس طرح مدت گئی جب اسے چڑھی گرمی عشق کی تپ اسے

تحریف = حرف روی کو بدل دینا۔ میر نے اپنے ایک شعر میں میت کا ہم قافیہ پلیت لکھا ہے، حالانکہ صحیح لفظ پلید ہے۔

ہمارے عندیہ میں تو ہے وہ خبیث و پلیت

اس سے قبل کے شعر میں قافیہ میت ہے۔

ایطاء = اس کی دو قسمیں ہیں۔ خفی و جلی۔ ایطاء خفی وہ ہے جس میں اگر قافیہ کا حرف زاید حذف کر دیا جائے تو حرف روی بدل جائے جیسے سودا کا شعر ہے:-

دال روٹی اگر چہ گھر میں پکے چمچہ بھر گھی کبھی نہ اس میں رلے

پکے اور رلے کا حرف زاید (ی) حذف کرنے سے پک اور رل رہ جاتا ہے جن میں حرف روی بدلا ہوا ہے۔

ایطاء جلی = غالب نے لکھا ہے کہ ایطاء اسے کہتے ہیں کہ دو لفظ ایک صورت کے ہوں، جیسے الف فاعل گویا اور بینا کا [illegible]

الف دونوں جمع کا جیسے چراغاں اور جواناں۔

اس کا اصول یہی ہے کہ حرف زاید کے حذف کرنے کے بعد اگر حرف روی بدل جائے تو وہ ایطاء ہے، جیسے انیس کا شعر

ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خار زار ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار

زار کلمۂ زاید ہے اس کو حذف کر دینے کے بعد خار اور لالہ رہ جاتا ہے جو ہم قافیہ نہیں ہوسکتے۔

مطلع میں قافیہ کی تکرار بھی ایطاء جلی ہے۔

غلو = اگر حرف روی ایک شعر میں ساکن ہو اور دوسرے میں متحرک تو اسے غلو کہیں گے جیسے مومن نے اپنی ایک غزل میں قرار آجائے کے ساتھ مارا جائے بھی نظم کیا ہے۔ یا حافظ کا یہ شعر ہے:-

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

پہلے مصرع میں خراب کا ب ساکن ہے اور دوسرے مصرع میں تاب کا ب متحرک (بحر الفصاحت)

باب المراسلہ

ربوہ اور "نگار"

(عبدالحمید نعمانی ۔ راولپنڈی)

میں عرصہ سے تپ دق میں مبتلا ہوں اور صحت بہت خراب ہے، دعا کیجئے ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جماعت احمدیہ ربوہ کی طرف سے آپ کو ساڑھے پانچ ہزار روپیہ دئے گئے ہیں تاکہ میں نگار کو پاکستان سے نکالوں ۔
میری رائے میں آپ کو راولپنڈی آکر نگار نکالنا چاہئے ۔ اسلام آباد یہاں نیا شہر بن رہا ہے اور بڑی ترقی کی اسکیمیں سامنے ہیں ۔

(نگار) عزیزمن ، یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ آپ تپ دق میں مبتلا ہیں اور مایوس ہو بیٹھے ہیں ۔ یہ مرض اب لاعلاج امراض میں سے نہیں رہا اور اکثر مریض اس بیماری کے اچھے ہو جاتے ہیں ۔ باقاعدہ علاج جاری رکھئے ، امید ہے آپ صحتیاب ہو جائیں گے۔

مجھے ربوہ سے ساڑھے پانچ ہزار کی امدادی رقم ملنے کی جو خبر آپ نے سنی ہے ، بالکل غلط ہے ۔ اور مجھے حیرت ہے کہ آپنے جو میری افتادِ طبع سے پوری طرح واقف ہیں کیونکر اس کا یقین کر لیا کہ جو کچھ میں احمدیت کی موافقت میں لکھ رہا ہوں وہ نتیجہ ہے اس امداد کا ۔

آج تک میں ربوہ نہیں گیا اور نہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے مل سکا ، لیکن ارادہ ضرور ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہاں جماعت کی تنظیم کا مطالعہ کروں ، گو میں قادیان جاکر وہاں کی تنظیم کا بڑا گہرا اثر دل پہ لے کر آیا ہوں اور ربوہ میں بھی یقیناً وہی ہوگا جو قادیان میں دیکھ چکا ہوں ۔ بہرحال آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ بالکل غلط ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جس حد تک میرے ضمیر کا تعلق ہے وہ کسی قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا ۔

پچھلے دو سال کے اندر بے شک میں نے میرزا غلام احمد صاحب اور ان کی تحریک احمدیت کو بہت سراہا ہے ، لیکن محض بربنائے حقیقت و صداقت و آزادیٔ ضمیر ۔ مجھے معلوم تھا کہ سارا زمانہ احمدی جماعت اور مرزا غلام احمد صاحب کا مخالف ہے لیکن جب میں نے خود اس جماعت کے لٹریچر اور اس کے علمی پہلو کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مخالفت محض بربنائے عصبیت ہے اور جو الزامات میرزا صاحب موصوف پر قائم کئے جاتے ہیں ان میں صداقت کا شائبہ تک نہیں ۔

سب سے بڑا الزام ان پر یہ عاید کیا جاتا ہے کہ وہ ختم نبوت کے قایل نہ تھے ۔ حالانکہ اس سے زیادہ لغو و لایعنی الزام کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ۔ وہ یقیناً ختم نبوت کے قایل تھے اور غالباً اس شغف و شدت کے ساتھ جو ایک سچے عاشق رسول میں پایا جانا چاہئے وہ اپنے آپ کو بربنائے تقلید نبوی ، رسول کا سایہ اور اسوۂ نبوی کا مظہر ضرور قرار دیتے تھے ، سو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہر شخص جو رسول اللہ کی زندگی کو سامنے رکھ کر اسکی تقلید کرے وہ "ظل نبوی" کہلایا جائے گا اور اگر میرزا صاحب نے عملاً اسکو کر دکھایا تو وہ یقیناً

ظل نبوی بھی تھے اور بروز اسوۂ رسول بھی ۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ نہ احمدی جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ان کے کارناموں کو دیکھتے ہیں اور محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے اس کی طرف سے بدظن ہو جاتے ہیں ۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ مخالفین احمدیت بھی اس کی تنظیم ، اور اس کی وسعت تبلیغ کے قائل ہیں (جن سے دنیا کے دور دراز علاقوں میں بھی اسلام کی حقیقت لوگوں پر واضح ہوتی جارہی ہے) ، لیکن جس وقت سوال میرزا غلام احمد صاحب کے عقاید و کردار کا آتا ہے تو وہ چراغ پا ہو جاتے ہیں ۔ محض اس لئے کہ ان کے زمانہ میں چند سرپھرے مولویوں نے بربنائے رشک اپنی نا اہلیت چھپانے کے لئے مرزا صاحب موصوف کو برا بھلا کہنا شروع کیا تھا ۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرزا صاحب نے ۸۶ سے زیادہ کتابیں اپنی مختصر عمر میں لکھیں اور ان سب کا مقصود صرف تھا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کو صحیح معنی میں پیش کریں ۔ اور مسلمانوں کی ایک باعمل جماعت دنیا میں پیدا کر جائیں جو آپ خود سوچیے کہ ان کے مخالفین دس آدمیوں کی بھی کوئی جماعت پیدا نہ کرسکے اور مرزا صاحب کی تعلیم کے زیر اثر آج دنیا کے لاکھوں انسان تعلیم اسلام سے روشناس ہو چکے ہیں اور اس قدر پابندی سے احکام اسلام کے متبع ہیں کہ جس کی مثال بڑے سے بڑے عمامہ بند مولوی میں بھی نہیں ملتی ۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب اسلام کوئی خیالی مذہب نہ تھا اور نہ اس کی بنیاد کسی ذہنی فلسفہ پر قائم تھی بلکہ وہ سر تا سر عمل ہی عمل تھا اور احمدی جماعت نے اسی عملی پہلو کو سامنے رکھ کر اپنی جماعت میں ایک ایسی روح پھونک دی ہے جس کی مثال ہمیں کسی دوسری مسلم جماعت میں اس وقت نہیں ملتی ۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ افراد جو نماز با جماعت کے پابند ہوں ، جو ایام صیام کا پورا احترام کرتے ہوں ، جو صدقہ و زکوٰۃ کی رقم بغیر کسی پس و پیش کے نکالتے ہوں ، جو لہو و لعب کی زندگی سے متنفر ہوں ، جو حد درجہ سادہ معاشرت بسر کرتے ہوں ، جو کسی وقت بیکار زندگی نہ بسر کرتے ہوں ، جو ہر وقت ہر انسان کی خدمت کے لئے آمادہ رہتے ہوں ، جو صادق القول ہوں ، امین ہوں ، عہد و پیمان کے پابند ہوں ۔ ان کو آپ برا کہتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ مرزا غلام احمد صاحب کو مہدی موعود سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ جس حد تک روایات کا تعلق ہے وہ میرزا صاحب پر بھی منطبق ہو سکتی ہیں ۔

آپ آج کل علیل ہیں اس لئے مطالعۂ کتب کا وقت آپ کے پاس کافی ہوگا ، اگر نامناسب نہ ہو تو سب سے پہلے میرزا صاحب کی براہین احمدیہ پڑھ ڈالئے اور اس کے بعد ان کی دوسری تصانیف ۔ آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ میرزا صاحب کتنے بڑے انسان ، کتنے سخت قایل ختم نبوت تھے اور کیسے کیسے چھوٹے انسانوں نے ان کے بلند کردار پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ۔

اب رہا آپ کا آخری مشورہ کہ نگار پاکستان سے نکالا جائے ، سو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرا لڑکا عارف نیازی "نگار پاکستان" کے نام سے یہ بھی کر رہا ہے اور یہ پرچہ ہو بہو نگار لکھنؤ کا چربہ ہوتا ہے ۔

یہ درست ہے کہ راولپنڈی بڑی اچھی جگہ ہے اور میں بھی بہت پسند کرتا ہوں ، میرے بعض اعزہ بھی وہاں رہتے ہیں ، لیکن نگار پاکستان کی اشاعت وہاں سے ممکن نہیں کیونکہ اس کا ڈکلریشن کراچی میں منظور ہوا ہے اور وہیں اس کا دفتر قایم ہو چکا ہے ۔

رہا نگار لکھنؤ ، سو بدستور یہیں سے جاری رہے گا جب تک اس کی سکت مجھ میں باقی ہے ۔ خدا آپ کو شفاء عاجل عطا فرمائے ۔

(۲)

بہادر شاہ ظفر کی ایک غیر مطبوعہ "ہولی"!

(پرویز گل - سیالکوٹ)

جناب گوپی چند نارنگ نے نگار (دسمبر ۱۹۷۱ء) میں بہ حوالہ محمد اجمل خاں صاحب (مولف "قومی ترانے اور نظمیں") بہادر شاہ ظفر کی ایک ہولی کے دو بند درج فرمائے ہیں۔ یہ دو بند انھیں ایک قوال سے ہاتھ آئے تھے ـــــ!! مجھے اس ہولی کے ان بندوں کے متعلق صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اُس قوال نے غالباً "کم سواد" ہونے کی وجہ سے دونوں بند غلط "قلمبند" کرائے ہیں۔ یہ ہولی اب مجھے ایک صوفی منش ماہرِ موسیقی سے (جو تمام عمر کنجِ خمول میں پڑے رہے) ہاتھ آئی ہے۔ یہ ہولی بہ زمانہ نظربندی رنگون ظفر مرحوم نے کہی تھی۔

ہند میں کیسو پھاگ مچو ری جو راجو ری

ہند کا تختہ گلشن بنا تھا کیسر کی تھی کیاری
کرم ہیں مالی کے بن کیسے لٹ گئی سب اسکی پھلواری
کہاں گئی وہ باغ بہاری
ہند میں کیسو پھاگ ..... !!

گورن کے قمقمے [illegible] توپن [illegible] پچکاری
سینے پہ کھائی [illegible] دلی لکھ اور پرانسی تک تک ماری
شور دنیا میں مچیو ری
ہند میں کیسو پھاگ ...... !

خون کا رنگ بنایا سورما جھج جھجیاں مرو ڑی
دنیا چھوڑی [illegible] کنا دیر پے دھجیاں دھو ری
عجب ہے ان کی یہ ہو ری
ہند میں کیسو پھاگ ---- !

جھرمٹ مار فوج یاں سے بھاگی جون کی سب ماری
[illegible] "یہودی" نے مل کے تخت کا ناس کر و ری
پاپ دنیا کا لیو ری
ہند میں کیسو پھاگ ...... !

بہادر شاہ دولہا غازی نے مل کے دین کا ساتھ دیو ری
اپنے دم تک دیندار نے دین ہی دین کھو ری
دیندار کو رب نے دیو ری
ہند میں کیسو پھاگ ..... !

---

[۱] گنگا رام - ظفر مرحوم کا وزیر تھا (پ - گ)

غالب کی ہمہ گیر شخصیت

(پروفیسر رضی عابدی)

غالب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے - لیکن ان کی یہ ہمہ گیری عالمانہ نہیں بلکہ فنکارانہ تھی - بحیثیت عالم ہمہ گیر ہونا بحیثیت فن کار ہمہ گیر ہونے سے مختلف ہے - عالم کا کمال اکتسابی ہوتا ہے - وہ زندگی کی متنوع حقیقتوں کا مطالعہ کرتا ہے اور اس مطالعہ سے حاصل شدہ نتائج پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے بڑی محنتوں اور مسلسل کاوشوں سے گزرتا ہے - تجربات ومشاہدات اپنے نقوش اس کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں، لیکن یہ علم خواہ کتنا ہی گیر اور پختہ کیوں نہ ہو ایک عالم کے لئے خارجی حیثیت رکھتا ہے - وہ اس کی ذات کا جزو نہیں بن جاتا - علاوہ ازیں علم محض اکتساب تک ہی محدود نہیں ہے - اور صرف نتائج اندکرنا مہمل ہوجائے اگر اس علم اور ان نتائج کو قارئین تک نہ پہونچایا جائے - چنانچہ ایک عالم کا کمال اس میں ہے کہ جو کچھ اس نے مسلسل کاوشوں کے بعد حاصل کیا ہے اُسے اپنی استعداد کے مطابق مکمل ترین صورت میں قارئین تک پہونچا دے - یعنی اپنے انتہائی کمال پر پہونچ کر ایک عالم اُس آئینہ کی طرح ہے جس پر آکر ہر نقش منعکس ہوجاتا ہے - وہ دنیا سے حاصل کئے ہوئے تجربات وحوادث کو دنیا کی طرف لوٹا دیتا ہے -

ایک فن کار کی حیثیت اس سے مختلف ہے - تجربات ومشاہدات نہ صرف اس کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں - بلکہ اس کی شخصیت سے وابستہ ہوکر خود اپنی شکل وصورت بدل لیتے ہیں - فن کار کے لئے ایک تجربہ محض ایک تجربہ نہیں ہوتا بلکہ [illegible] کی شخصیت میں ایک انقلاب کا باعث ہوتا ہے - یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح ایک عالم آئینہ کی مانند ہوتا ہے اسی طرح ایک [illegible] سیال مادہ کی طرح ہوتا ہے جس طرح پانی میں کسی شے کے مل جانے سے پانی کی شکل وصورت اور ماہیت [illegible] - اسی طرح ایک تجربہ ایک حادثہ فنکار کی شخصیت میں انقلاب پیدا کردیتا ہے - ایک فن کار اپنی پوری زندگی [illegible] سے گزرتا رہتا ہے اور اس کی ہر نئی حالت اس کی پچھلی تمام حالتوں سے مختلف ہوتی ہے - جیسے پانی میں اگر [illegible] تو تمام پانی [illegible] ہوجائے گا - اس نیلے پانی میں اگر سرخ رنگ گھول دیا جائے تو جو کچھ بنے گا وہ نہ تو پانی کی طرح [illegible] پچھلے محلول کی طرح نیلا ہوگا، اور نہ ہی اس نئے جزو کی طرح سرخ ہوگا - یہ بالکل ہی کوئی نئی چیز بن جائے گا [illegible] استعارے زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتے - اسی مطالب کو اگر ہم یوں بیان کریں کہ [illegible] کی طرح نہیں ہیں بلکہ نور کی طرح ہوتا ہے تو بات شاید کچھ سہل ہوجائے - سفید روشنی مختلف قسم کی شعاعوں سے مل کر بنتی ہے جن میں قوس قزح کے سات رنگوں کی شعاعیں شامل ہیں -

تجربات ومشاہدات اسی طرح فنکار کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں جس طرح روشنی کی مختلف شعاعیں کسی جسم کا رنگ طبعیات کی رو سے اسی جسم کی جذب واظہار کی قوت پر منحصر ہوتا ہے - یعنی اس جسم پر پڑنے والی شعاعوں میں سے کچھ تو اس جسم میں جذب ہوجاتی ہیں اور کچھ منعکس ہوجاتی ہیں اور انہی منعکس ہونے والی شعاعوں سے اس جسم کا رنگ بنتا ہے - مثلاً ایک چیز اسی لئے سرخ نظر آتی ہے کہ یہ سرخ کے علاوہ تمام شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے اور اس سے صرف سرخ رنگ ہی ظاہر ہوتا ہے - اس طرح وہ

اجسام جو تمام شعاعوں کو منعکس کر دیتے ہیں۔ ہمیں سفید نظر آتے ہیں۔ ان میں مختلف شعاعیں اپنے انفرادی رنگ کھو دیتی ہیں اسی طرح ایک فنکار کی صلاحیت اس کی قوتِ جذب و اظہار پر منحصر ہے، فنکار کی خوبی اولاً اسی میں ہے کہ وہ جس قدر ہو سکے زندگی کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے اور اس کا کمال یہ ہے کہ زندگی کو اس طرح اپنی شخصیت میں جذب کرلے کہ وہ خود زندگی بن جائے۔ اس قوتِ جذب کے ساتھ فن کار کا کمال اس قوتِ اظہار پر منحصر ہے جو اس کی شخصیت کو تمام و کمال قاری تک پہونچا سکے۔ اس شخصیت کو جس میں زندگی مختلف اجزا کا محض ایک سیدھا سادا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مکمل حقیقت ہے۔

یہی قوتِ جذب و اظہار غالب کی شخصیت میں بدرجۂ اولیٰ موجود ہے اور غالب کے فن کو غالب کی شاعری کو ہمہ گیر بناتی ہے۔ فطرتِ انسانی اپنے تنوع کے ساتھ غالب کی شخصیت میں سرایت کر گئی ہے اور غالب اپنی اعلیٰ قوتِ اظہار کی مدد سے اسے شعر کے لباس میں پیش کر سکتے ہیں، چنانچہ ہر قاری کو غالب کے کلام میں اپنی فطرت کے مطابق رنگ نظر آجاتے ہیں۔ جس طرح مختلف رنگوں کے چشمے لگائے ہوئے لوگوں کو دن کی روشنی کا رنگ اپنے اپنے چشمے کے رنگ کے مطابق نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہر فطری رجحان کی تسکین کا سامان غالب کے کلام میں موجود ہے۔ اسے ابلاغ کی خوبی کہیئے۔ یا غالب کی ہمہ گیری۔

غالب کے کلام کو اگر دوسرے شعراء کے کلام کے برابر رکھ کر دیکھا جائے تو غالب کی شخصیت کس قدر اُجاگر ہوتی ہے اور ان کی عظمت کا پتہ دیتی ہے۔ میر اگر حزن و ملال کی تصویر ہیں تو سودا ایک مجلسی انسان کا نمونہ۔ میر غم کے تاثرات کو جس خوبی سے اپناتے اور پیش کرتے ہیں اس میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلہ ہو سکے۔ غم ان کی زندگی میں رچ بس گیا ہے وہ اس کی نہایت خوبی سے عکاسی کرتے ہیں، لیکن وہ دوسرے تاثرات کو اس خوبی سے پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی سے ان کی شخصیت محض حزن و ملال کو اپنا سکی۔ زندگی سے ان کا تعلق جزوی ہے ہمہ گیر نہیں۔

درد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

اس کے برعکس سودا ہر وقت ہر چیز کا مضحکہ اُڑانے اور اس کا خاکہ کھینچنے پر تلے رہتے ہیں۔ زندگی نے انھیں جو نشتر چبھوئے ہیں وہ انھیں میر کی طرح خاموشی سے نہیں سہتے بلکہ پلٹ کر وار کرتے ہیں، وہ جتنی چوٹ کھاتے ہیں اتنی ہی تلخی سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ وہ ظرافت کو پس منظر میں لاکر اس تلخی کو اور تلخ تر کر دیتے ہیں۔ زندگی نے انھیں صرف چوٹیں اور تلخیاں ہی دی ہیں۔ اور ان کی شخصیت چوٹوں اور تلخیوں ہی سے زیادہ متاثر ہوتی ہے

لیکن غالب کے یہاں درد، غم۔ طنز اور ظرافت ایسے گھل مل گئے ہیں کہ غالب مغموم، ظریف یا چوٹ کھائے ہوئے لوگوں کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں آتے۔ بلکہ وہ ہر وقت ایک مکمل انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا انسان جو رو بھی سکتا ہے اور منہ توڑ جواب بھی دے سکتا ہے۔ یہ غالب ہی ہے کہ جوئے خوں سے اندھیری رات میں چراغ جلاتا ہے اور مکمل ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلخ بھی ہو سکتا ہے ؎

جوئے خوں بہنے دو آنکھوں سے کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

غالب زندگی کے صرف ایک پہلو سے وابستگی کو فرار سمجھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی ایک توازن ہے اور یہی ان کی عظمت ہے۔ اور اس توازن کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں جس قدر ضبط سے کام لینا پڑتا ہے اس کا انھیں پورا پورا احساس ہے۔ وہ جذبہ کی شدت سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن اعتدال کو ہاتھ سے انھیں جانے دیتے اور بالآخر اس اندرونی کشمکش میں فتح ان کی برتر شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

کیونکہ جب تک غم پنہاں موجود ہے، غالب اسے نظر انداز نہیں کریں گے۔

غالب کے کلام میں حزن و ملال کی وہ کیفیات نہیں ہیں جو ہمیں میر کے یہاں ملتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا احساس غم شدید نہیں ہے اس کے برعکس یہ شاید میر کے احساس غم جتنا ہی شدید ہے۔ لیکن کسی بھی ایک کیفیت کو غالب پوری زندگی پر چھانے نہیں دیتے۔ چاہے انھیں اس کی کتنی ہی قیمت دینی پڑے۔

لیٹا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
وے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

یہی عالم غالب کی تلخ نوائی کا بھی ہے، جب انھیں دنیا سے زک پہونچتی ہے۔ جب تجربات انھیں مایوس کردیتے ہیں۔ جب ان کا دل بُری طرح چوٹ کھاتا ہے تو وہ بھی پلٹ کر وار کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہاں اُن کی عظمت کسی ایک خاص واقعہ، خاص حادثہ یا خاص شخصیت پر ان کی نگاہ نہیں پڑنے دیتی۔ بلکہ یہ بھی انھیں زندگی ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کے منھ سے آہ نکلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی کراہ رہی ہے۔ یہ ایک فرد کے دل کی آواز نہیں ہوتی بلکہ پوری زندگی کی پکار ہوتی ہے۔

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شکوہ بھی ہے اور شکر بھی، طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دردؔ نے زندگی کو تصوف کی عینک سے دیکھا اور انھیں جو چیزیں حسن حقیقی کا جلوہ نظر آیا یہاں تک کہ عالم مجاز اُن کی نظروں سے بالکل اوجھل ہوگیا، لیکن غالب کے یہاں اگرچہ تصوف بھی شخصیت میں کچھ اس طرح جذب ہوا کہ اب حقیقت و مجاز کا امتیاز ہی مشکل ہوگیا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جب وہ صوفیانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ایسا پیرایہ بیان استعمال کرتے ہیں کہ حقیقت کے پہلو بہ پہلو مجاز بھی ایک حقیقت نظر آتا ہے۔ اور اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ نظر آتا ہے:-

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

فلسفہ بھی اسی طرح غالب کی شخصیت میں جذب پاتا ہے۔

اقبال کی حکیمانہ اور شاعرانہ عظمت مسلم۔ لیکن اقبال کا میدان عمل محدود ہے۔ مذہب، فلسفہ اور سیاست اقبال کے موضوع ہیں اور اپنی اصلیت کے اعتبار سے اقبال کے ان تینوں ایک ہی ہیں، اقبال کا نظریۂ حیات کلیتہً انہی پر منحصر ہے۔ لیکن اقبال کا پیغام ایک فلسفی کا پیغام ہے۔ اقبال کی آواز ایک مدبر اور سیاست داں کی آواز ہے۔ اور اقبال کا نعرہ ایک مسلمان کا نعرہ ہے ہر چند یہ میدان بہت وسیع ہے۔ لیکن زندگی اس سے بھی وسیع تر ہے۔ فلسفیانہ تذبذب، جذباتی کشمکش اور سماجی بے یقینی کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہوسکتی ہے کہ:-

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ آواز بھی ایک فلسفی کی آواز ہے لیکن اس میں زندگی کی اور اُلجھنیں بھی شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ بلا تشبیہ

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بلاشبہ غالب کے سامنے دنیا بازیچۂ اطفال ہے اور یہ وثوق اور یہ عرفانِ حقیقت انہی کا حصہ ہے کہ

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں آگیا ‏ ‏ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

اس کے علاوہ غالب کے ہاں دل و دماغ میں اختلاف نظر نہیں آتا۔ اُن کا دماغ جو کچھ سوچتا ہے۔ دل وہی محسوس کرتا ہے۔ شق اور عقل یہاں ایک دوسرے سے نبرد آزما نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ‏ ‏ انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی، ‏ ‏ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

غرض غالب کی شخصیت ایک اتھاہ سمندر ہے، جس میں آکر بڑے بڑے طوفان بھی گم ہوجاتے ہیں۔ جہاں کوئی ہنگامہ ہنگامہ ہیں رہتا، جہاں کوئی تحریک تحریک نہیں رہتی۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ‏ ‏ ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں ‏ ‏ تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یہاں ہمیں ایک ٹھیراؤ نظر آتا ہے۔ زندگی کے ہنگاموں سے مستقل اور شعوری وابستگی کے باوجود زندگی سے ایک بے نیازی نظر آتی ہے اور یہی غالب کی عظمت ہے۔

آخر میں چند باتیں صنفِ غزل کے بارے میں بھی غالب کے متعلق کہنا ضروری ہیں ــــ اب تک کچھ افراد کو زل کی تنگ، دامنی کا شکوہ ہے اور نہ معلوم کیوں غالب کے اس شعر کو بھی

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل کے خلاف پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ شاید غزل کی وسعتِ داماں کا اعلان اس سے بہتر صورت میں ممکن نہ ہوسکتا۔ اگر غالب کی وسعتِ بیان محض تنگنائے غزل کی نسبت ہی سے وسعت پاتی ہے تو یہ بھلا کیا وسعت ہوئی۔ ایسے مفہوم سے غزل کی تنگی داماں کا اندازہ تو شاید ہوسکے لیکن غالب کی وسعتِ بیان کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے یہ کہا جائے کہ صراحی کا بے انتہا پانی ایک مختصر گلاس میں کیسے سما سکتا ہے۔ گلاس کی نسبت صراحی کا پانی یقیناً زیادہ ہے۔ لیکن اپنی جگہ صراحی بھی کچھ اتنا زیادہ پانی بھی نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ غالب کے سامنے اور اصنافِ سخن بھی تھے۔ مثلاً مسدس۔ مثنوی۔ قصیدہ وغیرہ۔ اور اگر وہ ان اصناف کو وسیع دامن خیال کرتے تو ضرور ان میں طبع آزمائی کرتے۔ اور غزل کی تنگیٔ داماں میں نہ اُلجھتے۔ لیکن غالب نے کہنا ہی یہ چاہا ہے کہ تمام اصنافِ سخن میں غزل ہی ان کے نزدیک سب سے کشادہ دامن ہے۔ اور وہ بھی ان کے بیان کے لئے ناکافی ہے۔ دراصل فنکار کے مواد اور اس کی بصیرت میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ کوئی بھی ہیئت اُسے اپنے میں سمو نہیں سکتی اور اسی لئے فنکار کو ہمیشہ تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ مثلاً مسدس یا مثنوی ہی کو لیجئے۔ ایسی منظومات میں خواہ کتنا ہی حجم کیوں نہ ہو۔ موضوع کی پابندی رہتی ہے اور شاعر موضوع سے ہٹ کر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وحدتِ خیال ہی نظم کی خوبی ہے۔ اب ایک شاعر جس کا فن پوری زندگی ہو، اور اس میں خانہ بندی برداشت نہ کی جاسکتی ہو، نظم کی تنگنائے میں مفید نہ ہوگا۔

البتہ اس کی ایک صورت ہے۔ یعنی کسی ایسے زبردست عقیدہ کا سہارا جو جزو کو بھی شاعر کے لئے کل بنادے۔ جیسا کہ

ہومر کا دیوالا میں اعتقاد، یا انیس کا واقعاتِ کربلا اور امام حسین کی شخصیت میں اعتقاد۔ انیس کا فن موضوع کی پابندی کے باوجود لامحدود رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا موضوع ہی ان کے لئے مکمل زندگی کا مرقع ہے۔ کربلا کا میدان انیس کے لئے جامِ جہاں نما ہے جس میں زندگی اپنے تمام تنوع کے ساتھ موجود ہے اور اس کا ہر تاریک و روشن پہلو اور ہر خشک و تر انھیں یہاں نظر آجاتا ہے۔ اسی طرح حسینؑ، انیس کے لئے صرف ایک انسان نہیں ہیں، بلکہ بذاتِ خود انسانیت ہیں۔ لیکن جہاں کسی ایسے عقیدہ کا سہارا نہ ہو وہاں شاعر نظم میں موضوع کی بندش سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

اب اگر ہم غزل کی ہیئت پر غور کریں، تو اس میں پابندی صرف بحر اور ردیف و قافیہ کی ہے۔ موضوع و مواد کی کوئی پابندی نہیں چنانچہ ایک ایسے شاعر کے لئے جس کے ہاں موضوع و مواد بے کراں سمندر کی طرح ہوں۔ غزل سے زیادہ آزاد اور وسیع ذریعہ اظہار میسر نہیں، غزل کے ہم وزن وہم ردیف وہم قافیہ اشعار ایک ہی ساخت اور وضع کے مختلف پیالوں کی طرح ہیں۔ جن میں ہر قسم کے موضوعات مختلف قسم کے مشروبات کی طرح بھرے جاسکتے ہیں۔ خیال صوری پیکر کی جستجو میں رہتا ہے۔ مواد ہیئت کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔ تجلی ظہور چاہتی ہے۔ لیکن یہ تجلی بے انتہا متنوع اور وسیع ہے۔ ہیئت محض اس کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اور جہاں ہیئت کم سے کم بندشیں عاید کرے گی، وہیں یہ تجلی خود بخود ظاہر ہوتی چلی جائے گی اور مواد اور ہیئت کے جھگڑوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔

چنانچہ غزل گو شاعر ایک ہی غزل میں فلسفہ و سیاست، جمالیات و اخلاقیات، حسن و عشق اور تصوف و سائنس وغیرہ سے متعلق مضامین نہایت آزادی سے باندھ سکتا ہے، یہی وہ وسعتِ داماں ہے جس نے غزل کو اتنا مقبول بنایا اور جس کی وجہ سے غالب نے اسے اپنا لیا لیکن اس کے باوجود غالب کو اس کی تنگیٔ داماں کی شکایت ہے۔ جو غالب جیسے عظیم صاحبِ فن کی جائز و فطری شکایت ہے۔ ایسے صاحبِ فن کی جس کی قوتِ جذب کا یہ عالم ہو کہ

کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

اور جس کی قوتِ اظہار یوں تڑپتی ہو کہ :۔

ٹپکا نہیں خوں ہو کے جگر آنکھ سے اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

لیکن غالب کتنے ہی عظیم فن کار سہی آخر انسان تھے۔ اور انسان بہرحال مجبور ہے۔ شعرا تلامیذ الرحمٰن ہونے کے باوجود بیکراں نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ غالب میں بھی خامیوں اور کمزوریوں کا ہونا نہایت فطری بات ہے۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوا ہے کہ کسی حادثہ نے اُن کے اعتدال کو متزلزل کر دیا ہے اور وہ فن کی ان بلندیوں سے اتر کر معمولی انسانوں کے سے جذبات کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ مثلاً عارف کی وفات پر جو مرثیہ انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کی فنکارانہ شخصیت کسی حد تک دب گئی ہے۔ وہ مرثیہ شاعرانہ جذبات سے زیادہ پدرانہ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ایسے عظیم فنکار کا اپنی [illegible] شخصی ہو جانا، بلندی سے پستی کی طرف آنا ہے، لیکن انسان بہرحال کمزور ہے۔

کسی فن کار کی ذات میں اور اس کے فن میں مطابقت ضروری نہیں ہے، اور اکثر ایسا ہوتا بھی نہیں۔ بلکہ یونہی ہوتا ہے کہ تجربات اُسے بحیثیت ایک فرد کے متاثر کرتے ہیں، اُس کے فن میں کوئی اہم مقام نہیں پاتے اور اس کے برعکس وہ تجربات جو اُس کے فن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر اس کی شخصی زندگی کو متاثر نہیں کر پاتے۔ تاہم شعوری طور پر بھی ایک عظیم صاحبِ فن کو اپنی شخصی زندگی کو اپنی فنی زندگی سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے، اس میں اتنی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ فنی اور ذاتی تقاضوں میں امتیاز کر سکے۔

اس کے علاوہ وہ توازن اور اعتدال جن کا پچھلی سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے، اکمالِ فن کی خصوصیات ہیں۔ لیکن کوئی بھی فانی انسان مستقل طور پر مکمل اور بے عیب نہیں ہوسکتا۔ اور اکثر وہ عظمت کی بلندیوں کو چھوتے چھوتے رہ جاتا ہے۔ غالب کی جس فنی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ان کی فنی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اس سے نیچے آ ہی نہ سکیں۔ اور یہ بھی ایک طرح ان کی عظمت ہے۔ کیونکہ انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ جہاں بلند ہو سکتا ہے، وہاں گر کر بلند بھی ہو سکتا ہے۔

نو عروس

(مظہر امام)

اے عروسِ نو! شباب وقت کی آئینہ دار　　سو تمن تیرے اک افسونِ تبسم پر نثار
سینچتی ہے زندگی کو تیرے جلووں کی پھوار　　اے خدائے رنگ و نکہت اے بہاروں کی بہار!

کس کے انجانے تصور میں ہے تو کھوئی ہوئی ؟
کچھ نہیں معلوم، جاگی ہے کہ ہے سوئی ہوئی

مصحفِ عارض پہ تیرے رقص کرتی ہے سحر　　ہیں خنک مرہم کی صورت تیری آنکھوں کے شرر
لہلہاتا ہے جبینِ ناز پر نورِ قمر　　تیرے نازک لب سے "کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"

تیرا جلوہ زندگی کے حسن کی تفسیر ہے
آدمی کے جگمگاتے خواب کی تعبیر ہے

مانگ میں تیری اتر آئی ہے بزمِ کہکشاں　　جسم ہے قوسِ قزح کی اک لچکتی سی کماں
بند آنکھوں میں محبت کی چھلکتی ندیاں　　کروٹیں لیتا ہے جن میں تیرے خوابوں کا جہاں

اک نیا انداز پیدا تیرے سر انداز سے
لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں کس ناز سے

کھینچتا ہے اپنی جانب زہد کو آبِ طہور　　ڈھونڈتی ہیں ندیاں آغوشِ قلزم کا سرور
آشیانوں کی طرف پرواز کرتے ہیں طیور　　ارتقا کے واسطے مضطر ہے انساں کا شعور

تو بھی جانے کو کسی آغوش میں بے تاب ہے
آج تیرا دل ہے یا اک پارۂ سیماب ہے!

صاف پیشانی پہ رنگیں بندیوں کا التزام　　روکشِ محرابِ کعبہ ابروؤں کا اہتمام
تیری آرائش زمانے کو یہ دیتی ہے پیام　　زندگی ہے زلف کی صورت سنور جانے کا نام

پا رہی ہے ابتدا سے قلبِ انساں میں نمو
زندگی کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو

وقت پر آنچل کو بھی پرچم بنا لیتی ہے زیست　　دار پر چڑھتے ہوئے بھی گیت گا لیتی ہے زیست
تیز رو لمحات کے شہپر کو جا لیتی ہے زیست　　اپنا مقصد کو ششوں سے اپنی پا لیتی ہے زیست

کر دے صحرا کو چمن اندر چمن اپنی طرح
زندگی کو بھی بنا دے تو دلہن اپنی طرح

تنویر کی سولی

(ساقی جاوید - ایم - اے - بی - ایڈ)

ہر دور میں کچھ ایسی ہی تاریخ رہی ہے
ہر دور میں ڈوبا ہے زمانے کا سفینہ
فرہاد کی ہر سانس شرر بار رہی ہے
مریم کو گنہگار ہی سمجھا ہے جہاں نے
صحرا میں ہر اک قیس بھٹکتا [illegible]
ہر یوسفِ کنعاں سرِ بازار بکا ہے
ہر وقت کسی جم کی حکومت رہی ہے
قائم ہیں چمکتے ہوئے ایوان ابھی تک
دولت کے یہ بھوکے ہیں یہ زر چاٹ رہے ہیں
دیکھو وہ کوئی آگ دہکتی ہے افق پر
خورشید برافگندہ نقاب آ ہی گیا ہے
کچھ دیر میں پھولوں پہ اداسی نہ رہے گی
تہذیب نئے رنگ میں ڈھلتی ہے زمیں پر
یہ قصر یہ مینار یہ قلعے یہ محل کیوں ؟
اب صحنِ گلستاں میں بہاریں ہی رہیں گی

صدیوں سے یونہی زیست یہاں چیخ رہی ہے
سوکھا ہی نہیں زیست کے ماتھے کا پسینہ
ہر دور میں پرویز کی سرکار رہی ہے
سورج کو شبِ تار ہی سمجھا ہے جہاں نے
کانٹے کی طرح عشق کھٹکتا ہی رہا ہے
مٹی سے کبھی ارزاں [illegible] بکا ہے
فرعون کو موسیٰ سے خصومت ہی رہی ہے
ہیں تخت پہ بیٹھے ہوئے سلطان ابھی تک
صدیوں سے غریبوں کے گلے کاٹ رہے ہیں
اک زلفِ حنا رنگ مہکتی سی افق پر
صبحوں کے پیمبر کو عتاب آ ہی گیا ہے
یہ صبحِ چمن آج سے پیاسی نہ رہے گی
تاریخ کی رو راہ بدلتی ہے زمیں پر
یہ خون سے جلتے ہوئے سطوت کے کنول کیوں
بس لالہ و ریحاں کی قطاریں ہی رہیں گی

(اختر بھوپالی)

واسطہ جس کا ترے غم سے نہ ہو — ہم وہ ہر کام اٹھا رکھتے ہیں
بتکدہ والو تمھیں کچھ بولو — وہ تو چپ ہیں جو خدا رکھتے ہیں
غیرتِ عشق کوئی راہ نکال — ظلم وہ سب پہ روا رکھتے ہیں

دل کی تعمیر کو ڈھا کر اختر
وہ محبت کی بنا رکھتے ہیں

(شفا گوالیاری)

چمن کچھ اور بھی ہیں، دشت و در کچھ اور بھی ہیں — رہِ جنوں میں نقوشِ سفر کچھ اور بھی ہیں
مہ و نجوم سے کہ سینوں کو چیرنے والو — امینِ جلوہ، نقیبِ سحر کچھ اور بھی ہیں
نہ رنگِ موجِ تبسم، کہ تیری محفل میں — فسردہ قلب، تپیدہ جگر کچھ اور بھی ہیں
مریضِ غم پہ توجہ کا شکریہ لیکن — فرائضِ نگہِ چارہ گر کچھ اور بھی ہیں

(ڈاکٹر متین نیازی)

کبھی چھیڑی بہاروں میں جو اپنی داستاں ہم نے — بہت بدلی ہوئی دیکھی نگاہِ باغباں ہم نے
پریشاں ہو نہ جائے کوئی رودادِ وفا سن کر — برائے مصلحت بدلا ہے اندازِ بیاں ہم نے

توہینِ محبت ہے اب جان کا یوں کھونا — آغاز پہ رونا تھا، انجام پہ کیا رونا

جس قدر آشنا ہوئے غم سے — حوصلے دل کے اور بڑھتے گئے
یاد آئے متین وہ کیا کیا — راہِ دشوار سے جہاں گزرے

یہ سکوتِ مسلسل گوارا نہیں — صاف کہہ دیجئے "تو ہمارا نہیں"
میں ہی دامن بچا کر گزرتا گیا — مجھ کو دنیا میں کس نے پکارا نہیں

تغیرات سے کب ربطِ گلستاں نہ رہا — بہار آئی تو کیا خدشۂ خزاں نہ رہا!
متین قدر ہوئی آہ کب نشیمن کی — چمن میں برق کے لائق جب آشیاں رہا!

(نشاط احسن)

اک صدا سی گونج رہی ہے دل کے ویرانے میں — یہ تیری آواز کی لے ہے یا میری تنہائی ہے
نشۂ غم بھی ٹوٹ گیا ہے کوئی خوشی بھی ساتھ نہیں — آج تو ہر اک گام پہ اے دل ایک نئی تنہائی ہے
دھوکا دے کے گئے کتنے ہی ساتھی چھوٹ گئے — ایک ترے در تک آنے میں کیا کیا ٹھوکر کھائی ہے

آج نشاط شعلہ نوا کو چپ سی لگی ہے جانے کیوں
کون بتائے کس عالم میں یہ تیرا سودائی ہے

(منور لکھنوی)

وہ موجِ بحرِ غم کی جو سر سے گزر گئی — کمبخت اک مقام پہ آکر ٹھہر گئی
اک شخص پر بھی کھل نہ سکا گلستاں کا راز — تا حدِ رنگ و بو نہ کسی کی نظر گئی
مرکز ترا کدھر ہے۔ بتا۔ میرے ساتھ چل — اے گردشِ خیال کہاں تو ٹھہر گئی

جینے کا اپنے کوئی تو مقصد نیا ہے
اب تک تو یوں ہی عمر منور گزر گئی

(حیات لکھنوی)

سب کچھ نظر آنے پر کچھ بھی نظر نہ آیا — میں بزمِ تماشا سے با دیدہ تر آیا
ہونٹوں پہ ہنسی آئی آنکھوں سے بہے آنسو — آیا بھی تو یوں آیا آرام اگر آیا
بیگانۂ ساحل ہو، طوفانِ حوادث میں — اس بحر میں جو ڈوبا آخر وہ ابھر آیا

آواز حیات آئی جب کوئی کلی چٹکی
اُٹھ نکہتِ خوابیدہ ہنگام سفر آیا

(متین فتحپوری)

رازِ ہستی، فطرتِ انساں سمجھنے کے لئے — عشقِ بے پایاں کے سوز و ساز کی باتیں کرو
یاس و حرماں تا بہ کے رنجوریٔ دل تا کجا — اے اسیرانِ قفس پرواز کی باتیں کرو
تا چمک جائے دوبارہ شعلہ جنونِ عشق کا — غیرتِ ناہید کی آواز کی باتیں کرو
تلخیٔ دوراں، غمِ دنیا بھلانے کے لئے — آنے والے دَور کے آغاز کی باتیں کرو

مطبوعات موصولہ

شعلۂ رنگیں مجموعہ ہے جناب جرم محمد آبادی کی غزلوں اور نظموں کا جسے غالب اکاڈمی (مدنپورہ بنارس) نے شایع کیا ہے۔
حضرت جرم، آرزو لکھنوی مرحوم کے شاگرد ہیں اور اپنے استاد کے سچے جانشین، نہ صرف صحت زبان بلکہ سلاستِ
یان کے لحاظ سے بھی۔

جناب جرم دراصل محمد آباد (اعظم گڑھ) کے رہنے والے ہیں لیکن اب عرصہ سے کلکتہ میں قیام ہے اور شعراء بنگال کے
ساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حضرت جرم کا کلام مختلف رسایل وجرایدمیں شایع ہوتا رہتا ہے اور بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ دراصل
زل گو شاعر ہیں۔ لیکن تقاضائے وقت کی بنا پر انھوں نے چند نظمیں بھی لکھی ہیں اور خوب ہیں۔

ان کا کلام قافیہ پیمائی یا دور از کار توجیہ وتعبیر نہیں بلکہ ایک خوش فکر حساس انسان کی شاعری ہے جو جذبات سے پید
وتی ہے اور تحریک جذبات ہی پر ختم۔

وہ اپنے انداز بیان سے پامال مضامین میں بھی ندرت پیدا کر دیتے ہیں اور اپنی قدرت فکر سے نئے نئے اسلوب ادا بھی۔

یہ مجموعہ چار روپیہ میں غالب اکاڈمی سے مل سکتا ہے۔

ادب اور تہذیب مجموعۂ مضامین ہے جناب فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی کا۔ ان مقالات میں سے اکثر شخصیات سے
متعلق ہیں (مثلاً مہاتما گاندھی - مولانا آزاد - شاہ نوون - مجاز وغیرہ) اور بعض نقد و تبصرہ سے
جیسے بیکراں پر ایک نظر) کچھ ایسے بھی ہیں جو غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں، جیسے ولایت خاں کی ستار نوازی پر اظہار خیال، گو
وسکتا ہے کہ اب فرنگی محل کی فضا تک ستار پہونچ گیا ہو۔ ادبی حیثیت سے مرزا سودا کی تمثیل انھوں نے خوب لکھی ہے۔

یہ مضامین دراصل فاضل مصنف کے ذاتی اثرات ہیں جو اس حیثیت سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت
یں انھیں تصنعات سے خالی ہونا چاہئے تھا، سو ہیں۔

ان مضامین کی زبان بہت سلیس اور انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔ قیمت ۳؎ ملنے کا پتہ: آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔

جدید تنقیدی زاویے تصنیف ہے جناب ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کی جس میں انھوں نے فن تنقید کے اجزاء ترکیبی پر نہایت
شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔ فاضل مصنف نے مغربی فن تنقید کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ
تنقید کے اصول و شرائط، لوازم وخصایص کیا ہیں اور نہایت شرح وبسط کے ساتھ ان کو سمجھایا ہے۔

اس کتاب کے اہم ترین باب دو ہیں ایک وہ جس میں اساس تنقید کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسرا وہ جو نظریات سے
تعلق ہے۔ انھوں نے نظریۂ ادب کی پانچ تقسیمیں کی ہیں۔ حالانکہ یہ تقسیمیں صرف "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی"
یں بھی آسکتی تھیں، لیکن انھوں نے غالباً مزید وضاحت کے لئے اس غیر ضروری پھیلاؤ سے کام لیا ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی محنت وکاوش سے کام لیا ہے اور فن نقد کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا ذکر
اس میں موجود نہ ہو۔ زبان گو سادہ وسلیس ہے لیکن انداز بیان کہیں کہیں نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات

قیمت للعہ - ملنے کا پتہ :- شاہین بک اسٹال سری نگر

گل تر

مجموعہ ہے مخدوم محی الدین کی نظموں اور غزلوں کا - مخدوم مشہور کمیونسٹ شاعر ہیں اور ان کا کلام ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے - وہ تصور و عمل دونوں حیثیتوں سے بڑے انقلاب آفریں شاعر ہیں اور کوئی بات ایسی نہیں کہتے جو صداقت و نیکی سے خالی ہو - اس مجموعہ میں ان کی بیس نظمیں شامل ہیں اور سولہ غزلیں - نظموں کا تکنک وہی ہے جو ایک کمیونسٹ کا ہونا چاہئیے اور غزلوں کا تار و پود بھی وہی جو ایک روایت پرست شاعر کا ہو سکتا ہے، لیکن بناوٹ کے نمونے البتہ کہیں کہیں نظر آتے ہیں - زبان و فن کے لحاظ سے بھی وہ بڑی حد تک صاف و بے عیب ہے -

ضخامت ۸۰ صفحات - قیمت ۸ - ملنے کا پتہ :- مکتبۂ صبا مجرد گاہ حیدر آباد دکن -

یادگار ولا

شمس العلماء عزیز جنگ ولا، دکن کے نہایت مشہور فارسی گو شاعر تھے جو نلور میں پیدا ہوئے، (۱۲۸۰ھ) لیکن بہت کمسنی میں حیدر آباد چلے آئے، یہیں تعلیم و تربیت ہوئی، یہیں منصب تعلقداری سے پنشن حاصل کی اور یہیں ۶۱ سال کی عمر میں وفات پائی (۱۳۴۳ھ)

یہ زمانہ وہ تھا جب نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان میں بھی فارسی زبان کے اچھے اچھے شاعر (شبلی و حالی وغیرہ) موجود تھے -

ولا نے لکھنؤ کے میاں محمد کامل اور قدر بلگرامی سے استفاضہ کیا، لیکن صحیح معنی میں وہ تلمیذ تھے خود اپنی طبع مبدا، فیاض کے جس نے ہر صنف سخن میں ان کی رہبری کی - ان کی متعدد تصانیف نثر میں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سب سے زیادہ مفید و اہم آصف اللغات ہے جو ۶ - ۷ سو صفحات کی ۲۸ جلدوں پر مشتمل ہے - فارسی نظم میں انھوں نے اپنا کلیات چھوڑا جو تمام اصناف سخن پر حاوی ہے -

یہ کتاب ان کا کلیات نہیں بلکہ ان کے حالات اور ان کی فارسی شعر گوئی پر عمومی تبصرہ ہے جسے جناب برق موسوی نے مرتب کیا ہے -

ولا، غزل گوئی میں حافظ کے متبع تھے اور خوب کہتے تھے - بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

خموش باش دل زار این چہ فریاد ست	ترا بہ پہلوے دلدار این چہ افتاد ست
بروز وعدہ بگفتم کنوں چہ ارشاد ست	بخندہ گفت کہ پیمان [illegible] مرا یاد ست
گو مید کہ رسید و برگشت	من بے خبرم چہ ماجرا رفت
بت ترا گفتم [illegible]	اے زتشبیہ تو بیان در تن اصنام افتاد

یہ کتاب دو روپیہ میں مکتبۂ سعدی - [illegible] اعظم آباد - حیدر آباد سے مل سکتی ہے -

Glimpses of Urdu Literature

مجموعہ ہے پروفیسر زکیر (سنٹ زیویر کالج بمبئی) کے چار انگریزی لکچروں کا جس میں فاضل لکچرر نے اردو زبان کی تاریخ اور اس کے تدریجی نشو و نما پر اظہار خیال کیا ہے - پہلے انھوں نے اس کے آغاز کا حال بیان کیا ہے، دوسرے میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے موقف پر روشنی ڈالی ہے، تیسرے میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے زمانہ کو لیا ہے اور پھر تقسیم ہند کے بعد کے عہد کو - اس لئے ان چاروں لکچروں میں تاریخ زبان اردو کے ادوار کو لے لیا گیا ہے جن سے زبان اردو گزری اور گزر رہی ہے -

فاضل لکچرر نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعات و تاریخ کے لحاظ سے نئی چیز نہ ہو، لیکن نوعیت ترتیب و اظہار کے لحاظ سے بڑی دلچسپ چیز ہے - موصوف نے نہایت اختصار لیکن پوری جامعیت کے ساتھ وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو اس موضوع

کسی بڑی سی بڑی کتاب میں پایا جا سکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ جو تھا لکچر جس میں اُردو کے موجودہ رجحان شعر وادب کا ذکر کیا گیا ہے، بڑی کار آمد چیز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں اس قدر تاریخی و تنقیدی وضاحت کے ساتھ اُردو پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہے [illegible] ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

افعال مرکبہ کتاب ہے اُردو قواعد کی جسے مولانا تمنا عمادی نے مرتب کیا ہے اور مکتبۂ اسلوب ناظم آباد کراچی نے شایع کیا ہے۔

اُردو قواعد کی متعدد کتابیں اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں، جن میں سے سب سے زیادہ شہرت مولوی عبدالحق مرحوم کی "قواعد اُردو" کو حاصل ہے، لیکن افعال مرکبہ کی تصریف اور ان سے ترکیب جمل کا مسئلہ کافی تفصیل کے ساتھ اس میں بھی زیر بحث نہ آسکا۔ حالانکہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہی ہے۔ اب مولانا تمنا عمادی نے اس پر مستقل کتاب تصنیف کرکے اس دشواری کو دور کر دیا۔ ہر چند زبان کے قواعد اہل زبان کی بول چال ہی سے وضع کئے جاتے ہیں تاہم ان کا انضباط نہ صرف غیر زبان والوں بلکہ اہل زبان کے لئے بھی ضروری ہے۔

مولانا تمنا بڑے فاضل انسان ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں بڑے وثوق و اعتماد سے لکھتے ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ کتاب یہ سلسلۂ قواعد [illegible] سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت [illegible]

شکست شب مجموعہ ہے محسن بھوپالی کے افکار منظوم کا جسے فنکدۂ حیدر آباد سندھ نے شایع کیا ہے۔ محسن نوجوان شاعر ہیں اور وہ اسی دور کے شاعر ہیں جب نظم غزل پر چھا گئی تھی اور "ادب برائے زندگی" کی میکانکی تحریک نے شاعری کو بڑی حد تک بے جان کر دیا تھا۔ لیکن اسی دور میں بعض شعراء ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے غنائی شاعری اور اس کی ٹکنک کو ہاتھ سے نہیں دیا اور ان کی فکر کا اسلوب نہ بدلا۔ انھیں میں سے ایک محسن بھوپالی بھی ہیں، جن کے یہاں شعر محض فن نہیں بلکہ اشارۂ صداقت بھی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔

ادبار طے جناب احمد عظیم آبادی کے مجموعہ کلام کا دوسرا اڈیشن ہے اور کسی کتاب کے دوسرے اڈیشن کے شایع ہونے کے معنی ہیں کہ اسے ملک نے پسند کیا اور اس کے مطالعہ کے لئے روپیہ خرچ کیا۔ اس سے زیادہ مضبوط دلیل جناب احمد کے اچھے شاعر ہونے کی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس مجموعہ کا نام زاویے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے لفظ مختلف سہواً لکھنے سے رہ گیا، یا اگر [illegible] "زاویے ہی زاویے" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ رہا یہ امر کہ وہ زاویے کیسے ہیں سو اس سوال کا حق کسی کو نہیں [illegible] زاویہ بہرحال زاویہ ہے اور اس کی متعارف قسمیں تین ہی ہیں۔ قائمہ، حادہ اور منفرجہ یہ تینوں اپنے [illegible] ہوتے ہیں۔ کلام صاف، شستہ، رواں اور دلچسپ ہے۔

قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: - آزاد کتاب گھر ساکچی، جمشید پور۔

لذتِ آوارگی جناب ڈی۔ اے اظہر کا مجموعۂ کلام ہے، جس چمنستان خوشدلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جناب اظہر بڑے دلچسپ، خوش باش و بذلہ سنج انسان ہیں۔ جنھوں نے شاعری خود خوش رہنے کی غرض سے کی اور اس کو شایع کیا۔

اس مجموعہ میں ایک حصہ غزلوں کا بھی ہے جنھیں ہم اگر ظریفانہ نہیں تو غیر ظریفانہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اصل چیز اس کا حصۂ منظومات ہے جس کا کوئی شعر سنجیدہ ظرافت سے خالی نہیں۔

اس زمانہ میں جبکہ شاعر غم [illegible] سے چھوٹ کر غم دوراں کے مصائب میں مبتلا ہو گیا ہے (جو کہیں زیادہ سخت ہے) کسی شاعر کا محض تفریح و ظرافت کو اپنا موضوع قرار [illegible] بحیثیت مسیحائے وخضر سے کم نہیں اور اگر جناب اظہر سے میں کبھی مل سکا تو تھوڑی سی زندگی ضرور اُن سے طلب کروں گا ۔ [illegible] اظہر بڑے ذہین انسان ہیں اور اپنی شاعری میں اس ذہانت سے جیسا جیسا کام انھوں نے لیا ہے اس کا صحیح [illegible] اس مجموعہ کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ۔

کتاب کتابت میں نہایت اہتمام سے شایع کی گئی ہے اور مکتبۂ جدید لاہور سے مل سکتی ہے ۔ قیمت آٹھ روپیہ ۔

خوابِ پریشاں

ناول ہے جناب [illegible] سرشار کا جسے خود مصنف نے شایع کیا ہے اور چار روپیہ میں ۶۶ ، ایسٹ روڈ کلا[illegible] سکتا ہے ۔

ناول نگاری یوں تو بہت آسان چیز ہے اگر وہ محض کہانی کی حیثیت رکھتی ہے ، لیکن اگر اس میں نفسیاتی حقایق زندگی کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر وہ ایک نوع کا فلسفہ بن جاتی ہے اور فلسفہ سے نپٹنا آسان نہیں ۔

اس ناول میں فاضل مصنف نے مفروضات فن کے ساتھ ساتھ حقایق زندگی کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے اور [illegible] لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ عہد حاضر کے ناولوں میں یہ ناول قدر اول کی حیثیت رکھتا ہے ۔

یدِ بیضا

جناب ساحر بھوپالی کا تیسرا دیوان ہے جو حال ہی میں مکتبۂ جامعہ اُردو بازار دہلی سے شایع ہوا ہے ۔ ساحر غیر معروف شاعر نہیں ہیں ، اس سے قبل ان کے دیوان اور شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں ۔

ساحر خالص جذباتی شاعر ہے اور اس کی شاعری یکسر آپ بیتی ہے ۔ وہ ان شاعروں میں نہیں جو صرف دعوائے محبت کرتے ہیں ، بلکہ اس [illegible] ان شعراء میں ہے جو واقعی اپنے دل میں محبت کی کھٹک رکھتے ہیں اور جن کی شاعری اسی کسک کی تفسیر ہوتی ہے ۔

ساحر زمانہ اور فطرت دو[illegible] کا ستایا ہوا شاعر ہے ، لیکن اس غمزدگی نے اس کی زندگی میں خشونت پیدا نہیں ہونے دی اور ساحر کی شاعری ہے ۔

اس مجموعہ کی قیمت تین روپیہ ہے ۔

دیمک کی کہانی

تالیف ہے عبدالبصیر خاں صاحب کی انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے شایع کیا ہے ۔ یہ کتاب فاضل مولف نے بڑی تحقیق و کاوش اور وسیع استفادہ کے بعد لکھی ہے ۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دیمک جسے ہم بہت حقیر کیڑہ سمجھتے ہیں ، کس عظیم الشان تنظیم کا مالک ہے اور کتنی زبردست قدرتی فراست اس میں پائی جاتی ہے ۔

اہلِ مغرب نے کیڑے مکوڑوں کی تحقیق میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن ہمارے یہاں اس موضوع پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ، حالانکہ دراصل یہ قصے کہانیوں سے زیادہ دلچسپ موضوع ہے ۔

ہمیں امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو اس سلسلہ کو اسی جگہ ختم نہ کر دے گی ، بلکہ اسی طرح دوسرے کیڑے مکوڑوں پر ایسی ، دلچسپ و مفید کتابیں شایع کرتی رہے گی ۔　　قیمت ۱۲/

ستمبر ۱۹۶۲ء

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲

ٹیلیفون ۷۹۴۶۵

شمارہ ستمبر ۶۲ء

افادات

نیاز فتحپوری

ایڈیٹر

عارف نیازی

سالانہ چندہ	دس روپے
قیمت فی کاپی	۷۵ پیسے

دار الاشاعت

دفتر نگار پاکستان ۳۲ گاندھی گارڈن ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف ۔ یوپی ۔ بی ۳۶۶۹ ۔ ۶۸ /۶۲ محکمہ تعلیم کراچی

دائیں طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا۔

نگارِ پاکستان

اکتالیسواں سال || فہرست مضامین ستمبر ۶۲ء || شمارہ ۸

ملاحظات

کچھ اپنے متعلق

پچھلے دو سال بعض ذہنی صدمات کی بنا پر میری صحت و قوت عمل دونوں بہت متزلزل رہیں حتیٰ کہ اسی دوران میں گاہ گاہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ موت کا تصور بھی مجھے خوشگوار نظر آنے لگا ۔۔۔ لیکن چونکہ میرے اعضاء رئیسہ نے میرا ساتھ نہ چھوڑا تھا، اس لئے احساس کی تلخیاں میری سخت جانی کو شکست نہ دے سکیں اور جب میں رفتہ رفتہ ان کا عادی ہوگیا تو تاثرات کی شدت بھی کم ہو چلی اور زندگی ۔ خوش گوار تو خیر کیا لیکن کچھ گوارا سی ضرور نظر آنے لگی ۔

تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن اجمالاً یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میرے اس نفسیاتی کرب و اضطراب کا تعلق صرف لکھنؤ کے ماحول سے تھا جس نے دفعتہً بالکل خلاف امید سخت اذیت رساں و روح فرسا صورت اختیار کر لی تھی اور میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فی الحال اس ماحول سے جدا ہو کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں ۔۔۔ (اور ۔۔۔ یہ جگہ، کراچی کی خنک فضا کے علاوہ اور کہاں میسر آسکتی تھی جہاں میری راحت جسم و جان کے تمام وہ اسباب مہیا ہیں جن کی ایک شخص تمنا کر سکتا ہے ۔۔۔

چنانچہ میں یہاں ۳۱ جولائی کو آگیا ہوں اور ماضی و مستقبل دونوں کے تصور سے خالی الذہن ہو کر آیا ہوں ۔ رہا سوال "منزل گہہ مقصود" کا سو اس کی فکر جب مجھ ہی کو نہیں، تو آپ کیوں اس کی جستجو کریں ۔

عالم بے خبری راہ بھی ہے منزل بھی !

عرصہ سے احباب کا تقاضہ ہے کہ میں اپنے سوانح حیات قلم بند کر جاؤں اور اب کچھ دنوں سے یہ اصرار بڑھتا جا رہا ہے، غالباً اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں مجھے اب زیادہ جینا نہیں، لیکن شاید انہیں یقین نہ آئے گا ۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے جتنا جینا تھا جی چکا ۔ اب میں کہاں ؟

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

یہ درست ہے کہ اب سے تقریباً ۸۰ سال قبل جو آنکھ کھلی تھی وہ اب تک بند نہیں ہوئی اور جس دل نے ۱۳۰۲ ھ کی کسی تاریخ میں دھڑکنا شروع کیا تھا وہ اب تک دھڑک رہا ہے، اور اگر زندگی دراصل عبارت ہے "چشم تماشا نگر" اور "قلب جراحت اثر" سے تو یہ بھی غلط نہیں کہ اس وقت تک ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور دل نے جو کچھ محسوس کیا اس کی یاد ہنوز محو نہیں ہوئی، لیکن افسوس ہے کہ میں اس کے اظہار سے قاصر ہوں ۔

بے نالہ می رود جرس کاروان ما ۔

اور یوں بھی غالباً اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اسی داستان کے منتشر ٹکڑے آپ کو نگار کے صفحات پر بہ آسانی مل سکتے ہیں : ۔

لگا چلا ڈھیر راکھ کا میں بجھا چلا سینہ دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

اور اس "دبی دبائی آگ" کی کہانی تو آپ ہی کو سنانا ہے ۔ میں اب کیا کہوں گا ۔ از نفس انچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم ۔

نیاز

امیر خسرو

ڈاکٹر تارا چند

(ترجمہ سید نظیر حسین)

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی ملک کے سب لوگ ایک ایک مذہب رکھتے ہوں - ایک نسل کے ہوں - ایک زبان بولتے ہوں اور ان کے خیالات میں کوئی فرق نہ ہو - ہر ملک کی آبادی بھانت بھانت کی ملتوں اور قسم قسم کے گروہوں سے مل کر بنتی ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس کے بارہ میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں تنوع نہیں - تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ قومیت کا تقاضا یہی ہے کہ نسل، مذہب، تمدن اور زبان کے اختلاف کے باوجود سیاسی وحدت کا جذبہ سب میں یکساں پایا جائے -

آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کی ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں - حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کا فرق قومیت کے راستہ میں حائل ہو - اس کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ خصوصاً وسطی زمانہ کی تاریخ کو شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد وغبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں کیونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے کا تاریخ پر بڑا اثر ہوتا ہے اور تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیے غور نہیں کیا - "تاریخ" قوم کی ملی اور ہیجانی سرگزشت کی یاد ہے اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد سے وابستہ ہے، اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وجدانی سلسلہ ہے جو قوم کی مختلف نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مورخین کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے اور روایتوں کی غلط تفسیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر دیتی ہے -

میری خواہش ہے کہ امیر خسرو اکیڈمی ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ کو اپنے اصلی رنگ میں ملک کے سامنے لائے اور غلط فہمیوں کے دروازے بند ہو جائیں، امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانہ میں کیا جذبے رکھتے تھے، انھیں ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی ملک بھی شامل تھے ترجیح دیتے تھے - ان کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی -

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے اس زمانہ میں موجود تھا، آج سے ۷۰۰ سال پہلے سماجی یا فردی زندگی میں اس کی تلاش بیکار ثابت ہوگی۔ وسطی زمانہ میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا۔ رشتہ بندی کے اصول جدا تھے ان میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ کے لوگوں کا رشتہ کسی (حقیقی یا خیالی) مورث اعلیٰ سے جاملتا تھا، سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان قبیلوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے سیکڑوں قبیلے اور ذاتیں تھیں اور یہی حالت مسلمانوں کی تھی۔ سیاست کا دارومدار نسبی اصول پر تھا۔ ہندوستان کے کچھ شمالی حصّوں پر جو خاندان حکومت کرتے تھے وہ توران اور خراسان سے آئے تھے، ان کا مذہب اسلام تھا مگر ان کی سیاست کی بنیاد دین اسلامی نہیں کہی جاسکتی، ان کے کاموں میں اسلامی جذبہ کار فرما نہ تھا، ان کی سیاست خاندانی اور عشایری مفاد پر مبنی تھی، اور یہی صورت ہندو راجوں مہاراجوں کی تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جو فاتح باہر سے آئے وہ مذہب اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور یہ بھی کہ جن ہندو راجوں نے ان کا مقابلہ کیا وہ ہندو مذہب کی رکھشا کے لئے لڑے، دونوں طرف لڑائی زر۔ زن اور زمین کے واسطے تھی، دونوں طرف مذہب کی دُہائی دینے والے وہ مولوی اور پنڈت تھے جنھیں تلوار اُٹھانے سے سروکار نہ تھا۔ تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا، حالانکہ اس کے لئے کوئی شرعی حجت موجود نہ تھی۔ اس وقت سندھ میں بدھ مذہب کا خاندان راج کرتا تھا، برہمن وزیر نے اس کے خلاف سازش کی اور تخت سے اُتار دیا، عربوں کو خانہ جنگی کی خبر ملی، کچھ شکایتیں لے کر لوگ حجاج تک پہونچے۔ لیجئے موقع ہاتھ آیا، سمندری ڈاکوں کا بہانہ مل گیا۔ داہر سے معاوضہ طلب کیا گیا اور اس کے انکار پر دھاوا بول دیا گیا، رعایا نے جو راجوں کے ظلم سے تنگ تھی حملہ آوروں کا ساتھ دیا، سندھ کے شہر اور قلعے محمد بن قاسم کے ہاتھ آئے، دونوں میں سے کسی کے سامنے نہ کوئی مذہبی مقصد تھا اور نہ اخلاقی۔

محمود غزنوی کے حملوں کو مذہبیت کے گہرے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے، حالانکہ تاریخی حقیقت کچھ اور ہے، سامانی خاندان کے امیر، سبکتگین کے دل میں اپنے آقا کے خلاف آگ بھڑکتی ہے، سبکتگین کا لڑکا محمود جو ایک جری سپاہی اور اولوالعزم سپہ سالار تھا، سامانیوں کو خراسان سے نکال کر سلطنت کا مالک بن جاتا ہے، اس کے سامنے آل بویہ اور خلیفہ بغداد کا جھگڑا آتا ہے، آل بویہ مذہبًا شیعہ تھے، خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے، خلافت خود ہی دم توڑ رہی تھی اس نے اپنی عمر میں کچھ سال بڑھانے کے لئے محمود کا سہارا ڈھونڈا، محمود کو ایران پر تسلط حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مسلم اور غیر مسلم فوج لے کر شمالی ایران کو روندنا شروع کر دیا، ایلخانیوں اور دیلمیوں سے جنگ چھڑ گئی، ادھر مشرق کی سرحد پر ہندوستانی راجے جنھیں سبکتگین نے افغانستان سے باہر کر دیا تھا اس تاک میں تھے کہ کھوئے ہوئے ملک کو پھر سے لے لیں، محمود نے دو طرفی لشکر کشی شروع کر دی، کبھی ہندوستان پر حملہ کرتا تھا اور کبھی وسط ایشیاء یا ایران پر، نہ مسلمان ریاستوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا نہ ہندو راجوں نے۔

اس نے اسلامی علاقوں پر بھی قبضہ کیا اور مندروں کو بھی گرایا اور دولت کو لوٹا، نہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت

کی نہ ہندوؤں کو چھوڑا۔ درباری شاعروں نے تعریف کے پل باندھ دئے خلیفہ نے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطاب سے نوازا، کوئی پوچھے جس شخص نے ایران کے مسلمان حاکم خاندانوں کو تباہ کردیا اور خلافت کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا یہاں تک کہ چنگیز اور ہلاکو غیر مسلم سرداروں نے اسلامی مملکتوں اور عباسی خلافت کو خاک میں ملا دیا، اسے کس طرح اسلامی دولت کا دایاں ہاتھ اور اسلامی ملت کا امین سمجھا جائے، پھر محمود کے تگ و تاز کے دوران میں ہندو سماج اور ہندو ریاست کا کوئی نشان نہ تھا، محمود آتا ہے اور متھرا، نگرکوٹ، قنوج اور سومنات کو تہ و بالا کردیتا ہے لیکن کہیں اس کا ذکر نہیں کہ کسی ہندو سنگھٹن نے ان پوتر ستھانوں کی حفاظت کے لئے کوئی کوشش کی ہو، غزنی سے پاٹن اور کالنجر تک دھاوے ہوتے ہیں، سوا مقامی راجوں کے کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، کیسا تعجب ہے ان نیم وحشیانہ خونریزیوں کو ہندو دھرم اور اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا کیا جواب ہے، کیوں محمود نے اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی بھرتی کر رکھے تھے کس طرح محمود نے ہندو سرداروں سندر، تلک، سیوندرا پر اعتماد کیا۔ احمد نیالتگین، ہندوستان کا حاکم مقرر ہوتا ہے، بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے، محمود، تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجتا ہے، تلک اور ہندو جاٹ ملکر نیالتگین کا قلع قمع کر دیتے ہیں، کرمان میں جنگ ہوتی ہے محمود کی فوج کا سردار نوش تگین دو ہزار ہندو اور ایک ہزار ترک اور ایک ہزار کرد اور عرب سپاہیوں کو لے کر لڑنے جاتا ہے، دشمنوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر فوج تتر بتر ہوجاتی ہے، ہندوستانی افسر بھاگ کر غزنی پہونچتے ہیں، محمود انھیں برخاست کرتا ہے، چھ ہندو افسر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ جگر میں خنجر بھونک لیتے ہیں اور جان قربان کردیتے ہیں۔ وسط ایشیا میں مرو کے مقام پر بھی محمود کے ہندو سپاہی لڑتے نظر آتے ہیں۔ شابورگان میں ہندو فوجی خیموں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ ہندو فیلبان محمود کے جنگی ہاتھیوں کی فیلبانی کرتے ہیں۔ بلخ کے نزدیک ہندو فوج کا خیمہ ہے، اور اس جگہ کا نام کافروں کا حصار ہے، ان واقعات کی کیا تشریح ہے؟ بت شکن بادشاہ اور بت پرست سپاہیوں کا کیا رشتہ تھا؟۔ ہندو افسر کیوں مسلمان امیر کے لئے جان دیتے تھے، مسلمان امیر کیوں ہندو افسروں پر بھروسہ کرتا تھا؟

محمود کی اولاد قریب ۱۵۰ برس تک پنجاب پر حکومت کرتی ہے، اس عرصہ میں ہندوستان میں کہیں ہل چل نہیں ہوتی، ہندو سماج میں کوئی ایسا من چلا نہیں اٹھتا جو مذہب کے نام پر راجاؤں کو جمع کرے اور مقابلہ پر آئے۔ پھر غزنویوں سے اگر کوئی پنجاب کو خالی کراتا ہے تو وہ غوریوں کا خاندان ہے جن کے معرکوں سے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، شمالی ہندوستان اور دکن میں ترکوں کی حکومت قایم ہوتی ہے، ایک کے بعد دوسرا خاندان تاج و تخت کا مالک بنتا ہے گو کسی خاندان کی حکومت سو برس سے زیادہ نہیں چلتی۔

التمش۔ بلبن۔ علاؤ الدین خلجی۔ محمد بن تغلق نے بڑے دبدبہ کے ساتھ حکومت کی، لیکن ان کی کامیابی ان کی ذات تک محدود رہی، ان کے مرتے ہی طوایف الملوکی پھیل گئی، نہ کوئی ایسی ملت قایم ہوسکی جو ان میں سے کسی خاندان کی پشت و پناہ ہوسکتی اور نہ کوئی ایسا سماجی طبقہ بنا جو انھیں سنبھالے رکھتا۔ اگر ہندوؤں نے ان سے طاقت چھیننے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ خود ان کے قبیلوں اور خاندانوں میں ایکتا نہ تھی، مذہبی اور سماجی زندگی کو سیاست کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا، اسلامی ملت اور ہندو سماج کے تصور سے کوسوں دور تھے، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے

کہ مذہبی جنگ وجدل ایک فسانہ ہے جسے انیسویں صدی کے فرنگی تاریخ دانوں نے گھڑا۔ ممکن ہے اسے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح سمجھتے ہوں، ممکن ہے انھیں سچ مچ یقین ہو کہ واقعات کی نوعیت یہی ہے، لیکن کیا اب بھی یہ وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے گلے سڑے غلافوں کو اتارا جائے اور ان فرضی نظریوں کی سختی کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے۔ تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پڑھنا چاہئے۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو مذہب خاص اہمیت رکھتے تھے جو انتہائی لطیف اور پاکیزہ خصوصیات کے حامل تھے، دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کے پشت پناہ تھے، ان کے وسیلہ سے انسان حقیقت میں انسان بنتا تھا، اپنی حیوانی خواہشوں پر غلبہ پاتا تھا، دونوں وجدان اور نفس میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور انصاف، محبت اور خدمتِ خلق کی دعوت دیتے اس لئے کس طرح ان مذہبوں کو قتل وغارت۔ دشمنی اور آزار کا حامی مانا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ جنگ وجدل کی وحشیانہ حرکت کے لئے ہر زمانہ میں لوگ عذر ڈھونڈھتے رہتے ہیں، اپنے بہیمانہ اعمال کو مذہب کے سر تھوپتے ہیں، بیسویں صدی یورپ کی دونوں لڑائیوں میں دونوں طرف کے عیسائی پادری اپنی قوم کو حق بجانب اور دوسری قوم کو گمراہ کہتے تھے، خدا اور پیغمبر سے دُعا مانگتے تھے کہ مذہب کے دشمنوں کو شکست نصیب ہو۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہندوستان کے وسطی زمانہ کی تھی، سچ پوچھئے تو مذہب اور دھرم کی ٹٹی کے پیچھے ملک اور دولت کے لالچی شکار کھیلتے تھے، ملت اور سماج کا جو تصور آج ہے اس وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا، یہ محض تاریخ دانوں کی تاریخی کوشش ہے جو اس زمانہ کے کارناموں میں آج کل کے محرکات کو کارفرما سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کی تصویر کے دو رخ ہیں ایک طرف امن وسکون کا نظارہ ہے، اس میں انسانیت وہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے، دوسرا رخ لال خون سے رنگا ہوا ہے، اس زمین میں انسانی خون کے پیاسے، جاہ ودولت کے لالچی، گھمنڈ کے گھوڑوں پر سوار اِدھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کا پہلے رخ سے واسطہ ہے اسے تاریخ سے وابستہ کرنا مذہب کی توہین ہے انسانیت اور اخلاق کا منھ چڑھانا ہے۔

مجھے اس لمبی تمہید کی ضرورت اس لئے معلوم ہوئی کہ امیر خسرو کے خیالات کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کا جاننا ضروری ہے، جس زمانہ میں امیر خسرو نے زندگی بسر کی اس زمانہ کے ذہنی ماحول کا اثر ان پر ناگزیر تھا، ان کے قلم سے بھی کبھی کبھی ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، وہ اسلام کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور دوسرے مذہبوں پر اس کی برتری کے قایل ہیں، کبھی کبھی ایسے نکتے بھی بیان کرتے ہیں، جو رواداری کی نزاکتوں کو ٹھیس لگاتے ہیں، باوجود اس کے گہری نظر سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ ان کا دل اور دماغ ہندستانیت سے کس قدر لبریز تھا۔

اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قران السعدین تھی جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے، ان کے والد لاچین قبیلہ کے ترک تھے، ماں نسل سے ہندوستانی اور عماد الملک راوت عرض کی بیٹی تھی۔ خسرو اپنے بارہ میں خود لکھتے ہیں:۔

"زنسل عارض آسود منم" یعنی نانا رنگ کے سانولے تھے، باپ بے پڑھے تھے لیکن امیر آدمی تھے، پیشہ سپاہی کا تھا مگر خسرو آٹھ برس کے ہوئے تو سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا، بوڑھے نانا کی سرپرستی میں دہلی میں تعلیم ہوئی، مہربان ماں کی

لاڈلی گود میں پلے اور بڑے ہوئے، لیکن مکتبوں اور استادوں کی شاگردی سے زیادہ فایدہ نہیں اُٹھایا، خسرو تلمیذ الرحمان تھے، قدرت نے ذہانت کوٹ کوٹ کے بھر دی تھی۔ شاعری کو طبیعت سے فطری مناسبت تھی، ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں:۔ " دراں صغرسن کہ دنداں میافتا دسخن میگفتم"۔ خواجہ عزالدین سے جو بڑے عالم تھے خسرو سخن کا لقب ملا۔ انیسویں سال میں بچپن کے کلام کا دیوان "تحفۃ الصغر" تیار ہو گیا۔ امیر خاندان کے تھے، شروع ہی سے امیروں کے درباروں سے تعلق ہو گیا۔ خسرو نے اپنی بہتّر برس کی عمر میں سات سلطنتوں کا زمانہ دیکھا، اکثر نے ان پر عنایت کی اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی، عزت کی نگاہ سے دیکھا، کچھ حاسدوں کو یہ پسند نہ آیا لیکن ان کی دشمنی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خسرو کو ابتدائی جوانی میں محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت کا فیضان حاصل ہوا، ان کی صحبت میں دُنیا کے علایق سے تیاگ۔ قناعت کی برکت۔ بے نیازی سیکھی۔ اقرار کرتے ہیں:۔

نیت آں دارم ازیں پس بہ راز   کز در شہ نیز شوم بے نیاز

پشت نہ جویم نہ نیای زکس   چوں بہ خداوند کنم روی و بس   (قران السعدین)

استغنا کا یہ عالم تھا:۔

من کہ نہادم زسخن گنج پاک   گنج زر اندر نظرم چیست خاک   (قران السعدین)

خسرو صوفی منش، درویش صفت انسان تھے، ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی، انکی شاعری بھی ان صفتوں کی حامل ہے، شاعروں میں ان کا پایہ اونچا ہے۔ ہندوستان میں کوئی ان کا مثل پیدا نہیں ہوا زندگی میں خراسان اور ایران سے خراج تحسین حاصل کیا اور آج بھی ایران میں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔

شاعر کے بارہ میں کہا جاتا ہے اپنے زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے، خسرو اس قول کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا ستھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں۔ اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے۔ زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں۔ شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے۔ راہ عشق کے پیچ و خم۔ محبت کے متانوں کے ناز و نیاز ہیں، آرزوؤں کی سنہری دُنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ۔ پند و نصیحت۔ حکمت و تدبیر۔ تصوف و معرفت، الغرض خسرو سخن کی قلمرو سے کوئی چیز باہر نہیں۔ کلام کا حجم اتنا ہے کہ ایک مقالہ میں اس کا احاطہ غیر ممکن ہے۔ میں آج اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

میرے مضمون کا پہلا عنوان ہے "خسرو اور ہندوستان"، پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو کا دعوےٰ تھا کہ ہندوستان دُنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ کہتے ہیں:۔ "کشور ہند است بہشت بریں" اور اس کے ثبوت میں ایک نہیں سات حجتیں پیش کرتے ہیں۔ حجتوں کو جانے دیجئے ان کے پیچھے جو جذبہ ہے اس کو دیکھیے،

ہست مرا مولد و ماوی و وطن

پھر دس دلیلیں اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں ہند کو روم، عراق، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے، کئی دلیلیں اس بات کی دی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا، خراسان سے بہتر ہے۔

آم اور انجیر کا مقابلہ کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو انجیر کے سامنے آم کی کم قدر کرتے ہیں، لات زن کا لقب دیتے ہیں۔ پھولوں کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لے کر تعریف کرتے ہیں۔ گل کوزہ۔ صد برگ۔ بیلا۔ جوہی۔ کیوڑا۔ رائے چمپا۔ مولسری۔ کرنا۔ سیوتی وغیرہ۔ سب کا بیان کرنے کے بعد خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں۔

ایک کپڑے کے بارہ میں کہتے ہیں:۔

جامہ ہندی کہ نداند نام　　　　از تنگی تن بنماید تمام

یہ ڈھاکہ کا "آبِ رواں" تو نہیں جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل جاتا تھا؟

ہندوستان کے پرندوں کا بیان بھی سن لیجئے طوطے کے بارہ میں کہتے ہیں جانور نہیں آدمی ہے۔ کوے کی کائیں کائیں میں بھی خاص اثر ہے، اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور چڑیا تو پنہاں راز کی خبر دیتی ہے، لیکن مور کے لئے تعریفوں کے دریا بہا دئے ہیں، پوچھتے ہیں:۔

گر نہ بہشت است ہمیں ہند چرا　　　　از پئی طاؤس جناں گشت مرا

کہیں اسے طائر فردوس کہا ہے، کہیں بتایا ہے کہ ہدہد جو مرغ سلیمان ہے اس کے زریں تاج کو دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخر میں فیصلہ دیدیا ہے۔

ایں ہمہ دانند کہ پیدا و نہاں　　　　نیست چنیں مرغ در اطراف جہاں

جانوروں میں ہرن کی چال، گیدڑ کے زیر و بم۔ گھوڑے کے ناچ۔ بندر کی عقل۔ بکرے کا لکڑی پر چاروں سُم رکھ کر ٹھرکنا اور ہاتھی کا آدمیوں کی طرح کام کرنا، بہت مزے لے لے کر سناتے ہیں، لیکن ہندی حسینوں کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں۔ بلخ کے خوبرویوں کی آنکھیں ضرور چمکتی ہیں لیکن چہروں پر ترشی ہوتی ہے، خراسانی سُرخ و سفید ہوتے ہیں لیکن خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں، روم اور روس کا حال مت پوچھئے۔

سپید و سرد ہم چو گسندہ یخ　　　　کز ایشاں دم خورد خاتون دوزخ

تاتاریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ختن والیوں میں ملاحت نہیں، سمرقندی اور قندھاریوں میں شیرینی کی کمی ہے تو مصریوں میں چستی اور چالاکی کی، غرض کہیں بھی وہ خوبروئی اور دلربائی نہیں جو ہند کے حسینوں میں ہے۔

ہندوستان میں جو جگہ سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہی آپ کا شہر دہلی ہے، کہتے ہیں۔

شہرت دہلی کنف دین و داد　　　　جنت عدن است کہ آباد باد

ہست چو ذات ارم اندر صفات　　　　حرسہا اللہ عن الحادثات

پھر اس کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے ثبات کو فلک ثابتہ کا نمونہ بتاتے ہیں۔ جامع مسجد کو کعبہ سے ملا دیتے ہیں قطب مینار کو آسمان تک پہونچانے والی سیڑھی اور آسمان کو سنبھالنے والے ستون سے، حوض خاص کے پانی کو ایسا کہ جس میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے جس کی تہ میں ریت کے دانوں کو اندھا آدمی رات کی اندھیاری میں گن سکتا ہے دہلی بلند مرتبہ تاجداروں کا پایۂ تخت ہے جہاں ملک کے بزرگ اور مملکت کے رکن رہتے ہیں، اس کے باشندے

فرشتہ سیرت اور اہل جنت کی مانند خوش دل اور خوشخو ہیں، صنعت میں۔ علم و ادب میں۔ گانے بجانے اور کرتبوں میں کوئی ان کا مقابل نہیں۔

ہند کے موسموں کا بیان اس آب و تاب کے ساتھ کرتے ہیں کہ جاڑا آتا ہے تو ہندوستان جنت نشان ہو جاتا ہے، گھر اور باہر، باغ اور میدان، سبزہ زار بن جاتے ہیں، بہار میں پھول ہنستے ہیں، بلبلیں گاتی ہیں، عاشق اور معشوق گھروں سے باہر سیر کو نکل آتے ہیں، دُنیا نوروز کا جشن مناتی ہے، گرمی تو اس ملک کا خاصہ ہے، لیکن اس لئے ہے کہ :-

مہرِ فلک گرم شد اندر وفاش گرم ازاں گشتہ جہاں را ہواش

برسات کا موسم آیا تو آسمان پر بادلوں کا شامیانہ چھا گیا، جنگل میں ہر طرف سبزہ کی صفیں طیار ہو گئیں، دھان کے پودوں کے سر پانی میں ڈوب گئے، باغوں میں پھلوں کے درخت میووں سے لد گئے نالے اور ندی چڑھ گئے، بطخیں اٹھلاتی ہوا میں گھومنے لگیں، پھر خزاں کی فصل نے ہوا کے جھپڑوں کو گلشنوں کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا، چنبیلی سوکھ کر پیلی پڑ گئی، بنفشہ نے نیلا لباس پہن لیا، سوسن، صد برگ، سیوتی کے پھولوں کی پتیاں گر گئیں اور درخت ننگے ہو گئے بلبل غمگین اور طوطے گونگے ہو گئے۔

اپنے دلیش کے چرندوں، پرندوں، ہوا، پانی، نگر اور جنگل، مرد، عورتوں، رنگ روپ سے خسرو اس قدر متاثر تھے کہ بار بار ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے گن گانے سے تھکتے نہیں، لیکن یہ تو پھر بھی سطحی چیزیں ہیں اور شاعر کا بھی دھیان اس طرف گیا ہے جو بات کم ملتی ہے وہ ہندوستانی تہذیب۔ زبان اور مذہب سے تعلق رکھتی ہے جس طرز سے خسرو نے ان پر گہری نظر ڈالی ہے اور ایک بے لاگ مگر ہمدردی سے بھری ہوئی تنقید کی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

زبان کا مسئلہ آج بیسویں صدی میں جھگڑوں کی جڑ ہے، ایک تیرھویں صدی کا وطن پرست شاعر زبانوں کا کس طریقہ سے مقابلہ کرتا ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو، ہندوستان کی سب عوامی بولیوں سے واقف تھے، کم سے کم نام کی حد تک، گو ان کے اپنے لفظ یہ ہیں :-

من بہ زبانہای کساں بیشتری کردہ ام از طبع شناسا گذری
دانم و دریافتہ وگفتہ ہم جستہ و روشن شدہ زاں بیش وکم

پھر سندھی۔ لاموری (پنجابی)۔ کشمیری۔ کنیڈبی (کنہر)۔ دوار سمندری (تامل)۔ تری (آندھرا)۔ گوری (بہاری) بنگالی۔ دہلوی کے نام گناتے ہیں۔ یہ زبانیں آج بھی رائج ہیں اور ہندوستان کے آئین میں درج ہیں مگر ہندوستان کی ان بولیوں کے علاوہ سنسکرت زبان ہے جو پُرانے زمانہ سے برہمنوں کے نزدیک منتخب ہے، لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں اور ہر ایک برہمن بھی اس کی حدوں سے واقف نہیں، اس زبان میں چار وید ہیں، علم و دانش کے آئین ہیں اور قصّے اور افسانے۔ سنسکرت ادب کا سبق پڑھاتی ہے اور فنون کو سکھلاتی ہے، صرف و نحو و علم و ادب میں سنسکرت عربی سے مشابہ ہے اور فارسی سے برتر۔

فارسی اور عربی کا مقابلہ خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں کیا ہے اور فیصلہ دیا ہے :-

"پس از روی حجت معقول ضرورت است کہ پارسی بر عربی راجح باشد"

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ ہو مگر اس شعر پر حجت ختم کردی ہے :-

مرا ہر حجتی کامد ز سوی خویشتن گفتن تو ہم گر حجتی داری ز سوی خویش بیرون کش

فارسی اور عربی کی بحث میں یہ مانا ہے کہ عربی کی فضیلت محض شرعی ہے اس لئے اس کے اشعار میں قرآن سے استشہاد کیا ہے لیکن شعری نہیں، ثابت کیا ہے کہ تین وجہوں سے فارسی، عربی پر سبقت رکھتی ہے اول میزان فارسی، میزان عربی سے بہتر ہے، دوم عربی میں لفظوں کے معنی کئی کئی ہیں اور ایک معنی کے کئی کئی لفظ ہیں، ایسا فارسی میں نہیں۔ تیسرے عربی میں صرف قافیہ ہے اور فارسی میں قافیہ بھی ہے ردیف بھی۔ کہتے ہیں :-

"پس چوں شعر فارسی بہ حسن وزن و لطافت معنی و ازدیاد ردیف از مادر طبع زاید، ایں حسن مادر زادہ راکجا اندازہ باشد"

پس عربی سے سخن و شعر کے نقطۂ نظر سے بہتر ہے اور سنسکرت "برتر ز دری" نہ سپہر میں کہتے ہیں اگرچہ دری شیریں ذنکریں ہے لیکن سنسکرت میں ذوق عبادت اس سے کم نہیں۔

زبانوں کے موازنہ میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں، عربی، فارسی اور ترکی کے دنیا میں پھیلنے کا سبب بیان کرتے ہیں :-

چو بہ گروہ رسد از گفت شہاں عام شود در ہمہ اطراف جہاں

مثالیں دی ہیں، جب خلافت بغداد پہونچی تو پارسیوں کا زور ہوا اور سب عرب آئین پارسی ہوگئے، غوری اور ترک جن کی زبان فارسی تھی ہندوستان میں نمودار ہوئے تو ہم سب نے فارسی سیکھ لی، چونکہ عربی قرآن کے لئے چن لی گئی تھی اس لئے اس کی جگہ فصاحت کی دنیا میں نادر ہوئی، اصل یہ ہے زبانیں بہت ہیں اور ہر ایک زبان میں اپنا نمک ہے، پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ شور وغل کہ میری زبان اوروں سے بہتر ہے یا یہ کہ ایک شعریت قند ہے اور دوسری سرکہ بیہودہ گفتگو ہے۔

زبانوں کے ساتھ علم کا ذکر آجاتا ہے تو کہتے ہیں ...... کہ ہند کی ہوا تمام دنیا سے بہتر ہے اور صرف باغ جنت سے ایک درجہ کم .... خسرو کے نزدیک یونان کا فلسفہ مشہور ہے، لیکن ہندوستان نہ صرف تہی مایہ ہی نہیں بلکہ ہر علم میں بہتر فکر کا مالک ہے۔ یہاں منطق ہے، نجوم ہے اور معقولات میں برہمنوں نے ارسطو کے دفتر قانون کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے، علم طبیعی، ریاضی، ہیئت۔ سب ہی ان کے یہاں ہیں، مثلاً ابو معشر جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ستارہ شناس تھا، دس برس ہند میں رہا اور اس نے بنارس میں علم نجوم سیکھا وہ خود قبول کرتا ہے جو کچھ اس نے سیکھا وہ سب ہند کی سیاہی کی بدولت تھا، ہندسہ کا علم بھی ہندوؤں کا وضع کیا ہوا ہے صرف ان کی ایک صفر کی ایجاد سے ریاضی بنی، اقلیدس علم کے درجہ پہ پہونچے، صفر کی رقم دریافت کرنے کا سہرا آسا نامی عالم کے سر ہے اور اس کے نام کے ساتھ ہند جوڑ دینے سے ہندسہ کی اصطلاح بنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (باقی)

مکاتیب شبلی

بنام مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

(ابوعلی اعظمی)

مولانا شبلی گوناگوں حیثیتوں کے مالک تھے، اور اسی اعتبار سے ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ جس میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی کے ممتاز افراد شامل تھے، ان میں سے ہر ایک سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی، اور ان سے خط و کتابت کا سلسلہ قایم تھا۔ انہی میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے، جن سے پہلی مرتبہ ملاقات بمبئی میں ہوئی اور اس پہلی ہی ملاقات میں دونوں بزرگ ایک دوسرے کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ اور اسی ملاقات و تاثر نے رفتہ رفتہ دوستی، یگانگت اور اخلاص و [illegible] کی صورت اختیار کرلی، جو مولانا شبلی کی زندگی تک قایم رہی، آج کی صحبت میں انہی کے نام مولانا شبلی کے چند خطوط پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ان دونوں بزرگوں میں مراسلت و مکاتیب کا سلسلہ مولانا ابوالکلام کے ندوہ کے زمانۂ قیام ہی میں شروع ہوگیا تھا، وہ ندوہ کے سب اڈیٹر تھے، اس کے لئے اداریہ لکھنے، لوگوں سے مضامین حاصل کرنے، اور پھر ان کے جمع و ترتیب کی خدمت انہی سے متعلق تھی، جسے وہ مولانا شبلی کی نگرانی میں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اس درمیان میں مولانا شبلی کو کسی ضرورت سے بھوپال جانا پڑا جہاں ان کا قیام خلاف توقع کچھ طویل ہوگیا، اس لئے خاص مضامین اور دوسرے امور کے متعلق خط لکھ کر ان سے استفسار کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام نے ان کو کئی خط لکھے، اور مولانا نے ان کے جواب دئے، ایک خط میں تو کسی مضمون کے متعلق جو یہاں الندوہ کے فایل میں موجود تھا ہدایت [illegible] دوسرے میں اپنے کسی مضمون کی ڈاک سے بھیجنے کی اطلاع اور صحت کے ساتھ کاتب سے لکھوانے کی تاکید کی ہے، مولانا آزاد، الندوہ کی سب اڈیٹری کے فرایض کچھ اس طرح ادا کرتے تھے کہ مولانا کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، اور برابر اس کے لئے تاکید کرتے [illegible] تھے۔ بھوپال گئے، تو وہاں بھی اس کا خیال رہا اور الندوہ کے وقت پر شایع ہونے کی ان کو تاکید لکھی، مولانا آزاد اوراڈ [illegible] کی طرح روزانہ کام کرنے کے عادی نہیں تھے، جس سے لوگوں کو شبہ رہتا تھا کہ الندوہ وقت پر شایع ہوسکے گا یا نہیں، لیکن [illegible] اشاعت کا وقت قریب آتا وہ مستعد ہوجاتے اور پرچہ مرتب کرکے پریس کے حوالے کردیتے اور وہ وقت پر چھپ کر شایع ہوجاتا۔

چند ہی ماہ کے قیام کے بعد مولانا ابوالکلام، ندوہ سے امرتسر چلے گئے، جہاں ان کا قیام مولانا سید سلیمان ندوی، صاحب حیات شبلی کی روایت کے مطابق دو سال رہا، اسی دوران میں انھوں نے اپنے بھائی مولانا ابوالنصر غلام یسین آہ کی معیت میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، ابھی وہ بغداد ہی میں تھے کہ یکایک ان کے بھائی بیمار پڑ گئے، اور مرض نے شدت اختیار کر لی، اور وہ اسی حالت میں تنہا بمبئی واپس آگئے، جہاں کچھ دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، مولانا ابوالکلام، عراق، شام و موصل اور شمالی ایران کی سیاحت سے واپس آئے، تو اس کے دو ہی ایک سال کے بعد ان کے والد بھی وفات پاگئے، رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو امرتسر سے بلوا کر اپنا جانشین بنایا اور وہ اپنے والد کی جگہ ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے اور اسی سلسلہ میں بمبئی میں جہاں ان کے والد کے ہزار ہا مُرید تھے۔ پہلے قیام کیا۔ پھر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، جو بعد میں ان کی ہر قسم کی سیاسی و قومی، ملی و ادبی و صحافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ مولانا شبلی سے خط و کتابت کا سلسلہ درحقیقت یہیں سے شروع ہوتا ہے جو مولانا کی وفات نومبر ۱۹۱۴ء تک رہا، آخری وہ تار تھا جو مولانا شبلی نے اپنی وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو کلکتہ کے پتہ سے ان کو بھیجا تھا، یہ تار ان تمام تاروں سے لمبا تھا، جو بیماری کے آخر دنوں میں مختلف لوگوں کو دئے تھے، ان کو سیرۃ کی تکمیل کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے اعظم گڑھ بلایا گیا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی وقت پر نہیں پہونچ سکا، اور مولانا ابوالکلام کو تو وہ تار ہی نہیں ملا، اور وہ نہ آسکے، اور مولانا شبلی یہ حسرت اپنے ساتھ لے گئے۔

دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا سید سلیمان نے مولانا شبلی کے خطوط کے جمع و ترتیب کا ارادہ کیا تو مولانا ابوالکلام کو بھی اسکے متعلق لکھا، انھوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

> "مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ مل سکیں کچھ ملے تو پرائویٹ معاملات یا ندوہ کے متعلق ہیں، اور ان کی اشاعت غیر ضروری"۔

بہرحال سید صاحب کے اصرار سے مولانا شبلی کے تمام خطوط جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے انھوں نے سید صاحب کے حوالے کردئے، اور وہ مکاتیب شبلی جلد اول کے پہلے اڈیشن میں آگئے، ان میں سے جو بعد کو دستیاب ہوئے وہ دوسرے اڈیشن کے اوراق کی زینت بنے، ان سب کو ملا کر خطوط کی تعداد ۳۳ ہوجاتی ہے۔ خطوط زیادہ تر علمی ہیں، مولانا نے ان میں یا تو علمی مشاغل کا تذکرہ کیا ہے یا کوئی نئی یا پرانی کتاب کہیں سے ہاتھ آگئی ہے، تو اس کی اطلاع ان کو دی ہے، اور اس مسرت میں ان کو بھی شریک کرنا چاہا ہے۔

شروع کے چند خطوط تو بالکل کاروباری ہیں، یعنی نوعمر مدیر الندوہ کو بعض زیر ترتیب مضامین کے متعلق ہدایات ہیں، بقیہ تمام تر علمی و ادبی ہیں، جن کے بار بار پڑھنے سے بھی ذوق کو تسکین نہیں ہوتی۔ پھر ان میں غایت محبّت و تعلق کی بنا پر اور زیادہ کیف پیدا ہوگیا ہے۔ کاش کہ وہ سب خطوط محفوظ ہوتے اور مکاتیب شبلی کی ایک جلد تنہا انہی کے نام کے خطوط پر مشتمل ہوتی، اور ہم اس سے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہونچاتے۔

مولانا شبلی علم و دانش، فضل و کمال، شہرت و عزت اور عظمت و جلال کی جس معراج پر تھے، اس سے یہ توقع کرنا، کہ انھوں نے بھی ان نوجوان دوست کے عقیدت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہوگا، ذرا مشکل ہے، لیکن مولانا شبلی کے نام ان کے ایک آدھ خط حُسنِ اتفاق سے جو مل گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عقیدت و محبّت و نیازمندی کے ان نذرانوں کی

حفاظت کا اہتمام ضرور کیا گیا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے وہ محفوظ نہیں رہے، اور ضائع ہوگئے، ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک اور غبار خاطر اپنی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ جن کا وہ حامل ہے، طیار نہ ہو جاتا، اور اُردو کی صنفِ خطوط نگاری کے ذخیرہ میں ایک اور بیش قیمت چیز کا اضافہ نہ ہو جاتا۔

مولانا شبلی کے خط و کتابت کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس میں سرسید اور محسن الملک سے لے کر منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مؤلف حیات النذیر، مولوی حامد حسین قادری بچھرایونی مولف داستان اُردو تک سبھی شامل تھے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی، لیکن وہ جتنا کھل کر مولانا ابوالکلام کو خط لکھتے تھے، کسی کو بھی نہیں لکھتے تھے، ان سے کوئی پردہ نہیں تھا، سب کچھ ان پر ظاہر کر دیتے تھے، ان کے احباب و اعزہ و تلامذہ کے وسیع حلقہ میں یہ اختصاص کسی کو بھی حاصل نہیں تھا، اور یہ اتنا درپردہ تھا کہ اگر خطوط منظر عام پر نہ آتے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مولانا شبلی اپنے ان اولوالعزم نوجوان دوست سے اس درجہ اخلاص رکھتے تھے، حد یہ ہے کہ اپنے سب سے زیادہ مخلص، ہمراز و ہم داستان ولایق صد اعتماد دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے بھی اس کا پردہ رکھا، اور ان کو خبر نہیں ہونے دی۔ مکاتیب شبلی میں مولانا شروانی کے نام ۱۱۸ خطوط ہیں، لیکن کسی خط میں بھولے سے بھی مولانا ابوالکلام کا ذکر کسی تقریب سے نہیں آیا ہے۔

منشی افتخار عالم صاحب حیات النذیر لکھ کر فارغ ہوئے تو یکایک ان کو خیال پیدا ہوا کہ لگے ہاتھوں حیات شبلی بھی کیوں نہ لکھ ڈالیں، جس کا مولانا شبلی ان کو قطعاً اہل نہیں سمجھتے تھے۔ منشی افتخار عالم نے اس کے متعلق ان کو لکھا، تو انھیں بڑا تعجب ہوا، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:-

> "ہاں اور سنی! افتخار عالم صاحب، مولوی نذیر احمد کی لالف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات مانگے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوائیے۔ بھیئی بتا تو نہ دوگے، ایسے لوگ لائف لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی؟"

بعد میں یہ خدمت مولانا شبلی کے حسب توقع، تمام مکروہات دنیوی سے فارغ ہونے کے بعد ان کے عزیز ترین شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے انجام دی اور حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا، اس میں مولانا ابوالکلام سے مولانا شبلی کے تعلقات کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔

بمبئی کے قریب جنجیرہ نام کی ایک ریاست تھی، جہاں کے ایک انتہائی ترقی یافتہ، مسلم خاندان کی علم دوست و علم پرور خواتین سے جن میں عطیہ فیضی بیگم علم الکمال کے لحاظ سے بہت ممتاز تھیں، ان کے بڑے مخلصانہ اور مشفقانہ تعلقات تھے وہ مولانا کی بڑی قدرداں اور ان کے مذاق ادب کی دلدادہ تھیں ان سے خط و کتابت کا بھی سلسلہ قایم تھا، لیکن عام طور سے لوگ اس کو جانتے نہیں تھے، ایک مرتبہ تو مولانا شروانی کو لکھتے لکھتے رہ گئے، لیکن مولانا ابوالکلام کو اس کا علم تھا۔

انھیں خواتین کی دعوت پر مولانا ایک مرتبہ جنجیرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی مہانداری اور وہاں کی آب و ہوا کی لطافت سے مولانا بیحد متاثر ہوئے۔ اور اپنے تاثرات کا اظہار ایک غزل میں کیا، جس کے دو شعر مولانا ابوالکلام کو بھی لکھ بھیجے

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے　　　یہاں فکرے وجام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف، یہ سبزہ، یہ منظر، یہ بہارستاں عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

پوری غزل یہ ہے، جس کو مولانا شبلی نے جنجیرہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے ہاتھوں سے لکھ کر عطیہ کو دی تھی۔

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہو گی خیال روزہ و فکرِ وضو ہو گی تو کیوں ہو گی

جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصرِ معلیٰ میں اسے خلدِ بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی

جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو کسی شے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی

کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستاں عطیہ! تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

عطیہ کے شوہر مسٹر رحمین فیضی نے جو بمبئی کے ایک مشہور آرٹسٹ ہیں مولانا کی ایک تصویر بنائی۔ مولانا ابوالکلام کو اس کا علم ہوا، تو اس کو دیکھنے کی خواہش کی تو مولانا ان کو لکھتے ہیں:-

"ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے، میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے، ابھی پوری تیار نہیں ہو چکی میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا، نائب سفیر ٹرکی جو نہایت خوبصورت شخص ہے اس نے خواہش کی کہ اس کے ساتھ تصویر کھنچواؤں، چنانچہ ایک انگریزی کارخانہ میں فوٹو لیا گیا، توفیق آفندی بھی اسی گروپ میں ہے۔"

اس فوٹو کی ایک کاپی مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی مانگی تھی، تو ان کو لکھتے ہیں:-

"فوٹو کی ایک ہی کاپی میرے پاس ہے اور اس پر سفیر ٹرکی کے دستخط ہیں، کہ اس نے یہ فوٹو مجھ کو دیا ہے۔"

اول الذکر تصویر مسٹر رحمین فیضی کے کمال مصوری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۳ء میں آرٹ گیلری کی بھی زینت بن چکی ہے۔ اس کی وہاں بے انتہا قدر کی گئی، اور نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم نے اس کا فروخت کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا وہ اب تک جنجیرہ کے ایوان رفعت کی زینت ہے۔

مولانا شبلی کو ترکوں سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، ان کو اسلامی جاہ و جلال کا حامل سمجھتے تھے ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ٹرکی حکومت کے نائب سفیر متعینہ ہندوستان نے جو ان کا مرتبہ شناس تھا، ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی خواہش کی تو بطیب خاطر راضی ہو گئے، اس سے مولانا کے غیر معمولی تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں:-

"وہ اگرچہ اردو، فارسی، عربی، کوئی زبان نہیں جانتا تاہم اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے، جب وہ نہیں آتا تو خود ملنے کو جاتا ہوں، اس نے خواہش کی کہ میں اپنا فوٹو اس کے ساتھ کھنچواؤں، میں نے منظور کیا، مجھ کو تصویر سے دلچسپی نہیں۔ لیکن ایسا انکار بھی نہیں۔"

یہ تصویر مولانا کو اتنی پسند تھی کہ اپنی دستی تصویر کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی کرنا انھوں نے ضروری سمجھا

مولانا شبلی کو مسلم لیگ کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس کی بنیاد نواب وقارالملک وغیرہ کے ہاتھوں ڈھاکہ میں رکھی گئی تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا شبلی ہی نے کی اور زندگی کے آخر تک وہ اپنی اسی پالیسی پر قایم رہے اور اسکے خلاف تیز و تند نظمیں لکھتے رہے، جو کشاف و دصان کے فرضی ناموں سے الہلال، زمیندار، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ میں بڑے آب و تاب سے چھپتی رہیں، اور لوگ بڑے مزے لے لے کر ان کو پڑھتے رہے، کھل کر تو کبھی سامنے آتے نہیں، لیکن در پردہ تعریض و طنز کا

کوئی دقیقہ انھوں نے اٹھا نہیں رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کے بڑے سرگرم و فعّال سکریٹری مولوی عزیز مرزا صاحب تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی شاخیں ایک ایک شہر میں قایم ہو جائیں تاکہ اس کی آواز گورنمنٹ میں اور زیادہ موثر ہو جائے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک مرتبہ مسلم لیگ کے متعلق ایک پمفلٹ شایع کیا، جس میں مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کی ضرورت کو بڑے پرزور دلایل سے ثابت کیا تھا، جس کی داد اور تو اور خود وقت کے وائسرائے نے بھی دی، مولانا شبلی تو ان مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، ان کو معلوم ہوا تو مولانا ابوالکلام کو فوراً لکھا کہ:-

"مولوی عزیز مرزا صاحب کو مبارک باد لکھئے، ان کے پمفلٹ متعلق مسلم لیگ کی داد جناب وایسرائے بہادر نے دی اور اس کا اعلان تار کے ذریعہ سے اخبارات میں ہوا، ان کو شکایت تھی کہ لوگ مسلم لیگ قایم نہیں کرتے، اب کس کو انکار ہوگا"۔ (۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء)

دیکھئے ان چند جملوں میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔

مولانا ابوالکلام عنفوان شباب ہی میں اپنی جادو بیانی اور سحر نگاری کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا ہفتہ وار الہلال اپنی نوعیت کا ہندوستان میں تنہا اخبار تھا جو ملک کے گوشہ گوشہ میں جاتا تھا، اور بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا، اس طرح سے سارا ہندوستان ان کی طرف متوجہ اور ان کی زیارت کا مشتاق و آرزو مند ہو گیا تھا، جہاں جاتے تھے ان کا شاہانہ استقبال ہوتا تھا، مولانا شبلی ایک مرتبہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدر آباد گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ہر شخص مولانا ابوالکلام کا نادیدہ پرستار، ان کی زیارت کا آرزو مند، ان کی تقریر سننے کا مشتاق ہے، مولانا وہیں سے ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ کا تمام حیدر آباد مشتاق ہے، لیکن یہاں کوئی شخص حدود ریاست کے اندر کوئی آزادانہ تقریر نہیں کر سکتا، ایسی حالتوں میں لوگ یہ کرتے ہیں کہ رزیڈنسی کے حدود میں جلسے کرتے ہیں، جو بالکل شہر سے متصل ہے اور ریاست کے تمام شایقین شریک ہوتے ہیں۔

مفصل انتظامات دریافت اور استصواب کے بعد لکھوں گا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل حیدر آباد سے کہیں زیادہ خود مولف ہی اس وقت مولانا ابوالکلام کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے اور اس کے لئے اپنے خاص اہتمام میں جلسہ کرنا چاہتے تھے، اب نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا شبلی کا یہ شوق پورا ہوا یا نہیں، لیکن جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے، مولانا ابوالکلام، نظام کے عہد اقتدار تک کبھی حیدر آباد نہیں گئے۔ ان کو نظام حیدر آباد کی علم دوستی، علما نوازی، ہنر پروری، اور علم و فن کی راہ میں ان کی بے پناہ اور عدیم المثال فیاضی و زر پاشی کے باوجود ان سے کبھی عقیدت نہیں پیدا ہوئی، نہ ساری عمر ان کے ابر کرم سے جس سے سارا ہندوستان سیراب ہوتا تھا، انھوں نے فیضیاب ہونے کا ننگ گوارا کیا۔

ارباب کمال کی خود ان کے اپنے وطن میں عموماً قدر نہیں ہوئی۔ لیکن مولانا شبلی اس سے مستثنیٰ تھے، وہ جب اپنے لمبے لمبے سفروں سے واپس آتے تھے، تو سارے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی، اور ہر شخص جان جاتا تھا، کہ مولانا شبلی آگئے ہیں اور پھر چہار طرف سے مشتاقان دید ارجوق درجوق زیارت و ملاقات کے لئے پہونچ جاتے تھے، جب تک ان کا قیام وطن میں رہتا

ان کا فیض جاری رہتا اور لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہتے، ہمارے شہر کے مشہور نعت گو شاعر علامہ اقبال سہیل کو وطن کے اسی دوران قیام میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا اور انھوں نے مولانا سے عربی ادب و محاضرات کی بعض ادبی کتابیں مثلاً حماسہ ابی تمام اور الکتاب وابتین وغیرہ پڑھی تھیں، اس کا ذکر مولانا سہیل کی نامکمل سیرت شبلی میں بھی ہے اور اسی کو مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بھی نقل کر دیا ہے۔

مولانا شبلی اپنے غیر معمولی علمی اور ادبی کمالات کی شہرت کی بنا پر ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی بیگانہ نہیں تھے جہاں جاتے تھے، ان کی آمد کا شور ہو جاتا تھا، اور ان کی زیارت کے لئے لوگ امنڈ پڑتے تھے، لکھنؤ، الہ آباد، کلکتہ اور بمبئی کو تو مختلف وجوہ سے وطن ثانی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جہاں ان کا قیام کبھی کبھی ہفتوں نہیں، مہینوں ہو جاتا تھا، اس لئے ان شہروں کا ایک ایک بچہ ان کو جان گیا تھا، لیکن ان شہروں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی جاتے تھے، تو ان کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوتا تھا، اور وہاں کے عوام و خواص ان کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ دورہ کے سلسلہ میں بانکی پور پٹنہ گئے، تو ان کو لینے کے لئے ایک کثیر مجمع اسٹیشن پر اکٹھا تھا اور باوجود مولانا کے انکار و اعراض کے جوش عقیدت میں آدھے راستہ سے ان کو جلوس کے ساتھ فرودگاہ تک لے گیا جس کا مولانا شبلی پر بڑا اثر تھا، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:-

"صبح کو بانکی پور پہونچا، غایت کثرت سے مجمع تھا، عمائد شہر اور تمام طلبہ کالج موجود تھے، نہایت سخت اصرار کے ساتھ طلبہ نے گاڑی کھینچی اور فرودگاہ تک لائے۔ میرے اصرار کا اتنا اثر تھا کہ آدھی راہ کے بعد یہ مشغلہ شروع ہوا ورنہ وہ تو اسٹیشن ہی سے کانٹوں میں گھسیٹنا چاہتے تھے، یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پسند نفس کو پھریری نہیں آئی ہوگی، لیکن واقعتاً ہنسی آتی تھی، کہ عجب خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں۔"

لیکن مولانا شبلی نے وہیں سے اپنا دورہ ملتوی کر دیا اور لکھنؤ روانہ ہو گئے، لکھتے ہیں:-

"دورہ کرتا ہوں تو لکھنؤ میں سالانہ جلسہ کے متعلق جو کام چھیڑے ہیں، ابتر ہو جائیں گے۔"

ندوہ ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، اور اس کے ضروری کاموں پر اپنی ذاتی دلچسپیوں کو بھی بے تکلف قربان کر دیتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے۔ مولانا شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے، خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔" (۴۲)

ایک اور خط میں انھیں کو لکھتے ہیں:-

"عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کے گلگشت نے عالم طلسم میں پہونچا دیا تھا، بھاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہونچا، کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں، اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت عدن کو خیرباد کہا تھا، بہرحال پھر اسی خرابہ (ندوہ) میں آگیا۔" (۴۱)

مولانا شبلی کے پاس فارسی کے نوادر کتب کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا، جس کو وہ بہت محبوب رکھتے تھے، ان میں ایک مشائخ چشت کے حالات میں جہاں آرا بیگم کی تصنیف مونس الارواح کا ایک نادر بیش قیمت قلمی نسخہ بھی تھا، جو شاہجہاں کے دربار کے خاص کاتب رشید الدین وطواط کے ہاتھ کا دبیز زرافشاں کاغذ پر نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے، اب وہ کتب خانہ دار المصنفین کی زینت ہے، اس کا خط اتنا پاکیزہ روشن اور دیدہ زیب ہے کہ بس دیکھتے رہ جایئے، چار سو برس گزر جانے کے بعد بھی اس میں تڑپ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب ابھی ابھی لکھ کر اس سے فارغ ہوا ہے، پیرس میں آل ورلڈ نمائش کے موقع پر یہ گرانقدر قلمی کتاب بھی نمائش میں رکھنے کے لئے طلب کی گئی۔ اور وہ پندرہ ہزار کے بیمہ پر پیرس بھیجی گئی، لیکن مولانا کو پھر بھی خطرہ تھا کہ کہیں ضایع نہ ہو جائے۔

مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"میری کتاب جہاں آرا بیگم کی تصنیف، ولایت کی نمائش میں طلب ہوئی ہے، میں نے لکھ دیا ہے کہ ضرور واپس ملے"۔

ان کو اس قسم کے نوادر کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنا رہتی تھی، اسی طرح ایک آل ورلڈ نمائش ۱۹۱۲ء میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے سابق دار السلطنت الہ آباد میں بھی ہوئی تھی، اس میں بھی قلمی نوادرات و مخطوطات کی نمائش کا ایک شعبہ تھا، جس میں جا بجا سے نہایت نادر اور بیش قیمت قلمی کتابیں نمائش کے لئے منگوائی گئی تھیں، ان میں دیوان فیضی کا ایک نادر نسخہ بھی کہیں سے آکر نمائش کی زینت بننے والا تھا مولانا کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کے لئے نمائش دیکھنے کی ایک وجہ ترغیب پیدا ہو گئی، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:-

"الہ آباد کی نمائش میں ایک اور اضافہ ہوا یعنی نوادرات میں ایک دیوان فیضی بھی ہوگا اور وہ دسمبر کے اوایل تک پہونچ جائے گا"۔

اب وہ الہ آباد کی مشہور پبلک لائبریری کی زینت ہے۔

مولانا شبلی کے زمانۂ حیات میں تین بڑے اہم واقعات پیش آئے، اور انہی نے درحقیقت مسلمانوں کو بیدار کر دیا، ان میں سے دو جن سے مسلمان بیحد متاثر تھے، ایک غزوۂ طرابلس ہے اور دوسرا جنگ بلقان ہے۔ ان دونوں میں جن لوگوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی، اور ترکوں کی حمایت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ان میں پیدا کر دیا، ان میں دو بزرگ بہت ممتاز تھے، ایک مولانا شبلی اور دوسرے ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی ترکوں کی حمایت میں پرجوش نظمیں لکھتے تھے جو فرضی ناموں سے الہلال کلکتہ، زمیندار لاہور، اور مسلم گزٹ لکھنؤ میں چھپتی تھیں، اور مولانا ابوالکلام اپنے اخبار الہلال میں نہایت پرزور اور ولولہ انگیز مضامین لکھتے تھے ان کو پڑھ پڑھ کر مسلمان اتنا جوش میں بھر گئے کہ وہ اپنا سب کچھ ترکوں پر نثار کرنے کے لئے طیار ہو گئے، ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکوں کی امداد کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے جو طبی مشن گیا تھا، وہ بھی درحقیقت ان کے اسی جوش و خروش کا مظہر تھا اور وہ جب اپنے فرایض ادا کر کے بمبئی کے ساحل پر اترا ہے تو اس کے استقبال کے لئے مولانا شبلی بمبئی میں موجود تھے اور ممبران وفد کے بخیر و عافیت واپس آنے پر ان کو پرزور مبارکباد دی، اور ایک قصیدۂ تہنیت بھی پیش کیا، جو ان کے بے پناہ جذبۂ ملی و جوش دینی کا پورا آئینہ دار ہے، آج بھی اس کے پڑھنے سے اس وقت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

تیسرا مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ ہے، جب یہ حادثۂ خونیں پیش آیا ہے، مولانا اپنے مستقر لکھنؤ سے بہت دور بمبئی میں تھے، اخبارات کے ذریعہ اس ہنگامہ کی خبریں ان تک پہونچیں تو تڑپ گئے، اور اس اثر کے تحت انھوں نے پے در پے متعدد نظمیں لکھیں جو اس واقعہ کے کئی برس بعد تک ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھیں اور اب بھی ہیں، وہ اس قدر موثر پرجوش اور ولولہ انگیز تھیں کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے جس ہفتہ وہ الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے رجز کا کام دیتیں، اور وہ انگریزوں کے خلاف انتہائی جذبۂ انتقام اور جوش و خروش سے لبریز ہو جاتے، ان نظموں میں اب بھی وہی جوش و خروش کا طوفان ہے، جن کو پڑھ کر آج بھی انگریزوں کے خلاف خون کھول جاتا ہے، ایک نظم میں کان پور سے دوری، اور اس سعادت سے اپنی محرومی پر نہایت دلدوز الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے، فرماتے ہیں :-

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

واقعہ کان پور کا ان پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ ان دو قطعوں سے بھی کیا جا سکتا ہے :-

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی　　　اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں، مگر میں نے چند قطرۂ خون　　　کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے
کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم،　　　کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سُن لو وہ گنج ہائے گرانمایہ دفن ہیں،　　　کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کان پور میں

لیکن اس واقعہ کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ملی مسئلہ بنانے میں جس کے قلم و زبان کو سب سے زیادہ دخل ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے، انھوں نے اپنے اخبار الہلال میں اس کی حمایت میں مسلسل پرجوش مقالات لکھے اس طرح سے ایک کی پر اثر اور ولولہ انگیز نظموں نے اور دوسرے کے آتشیں اور جوش انگیز مقالات نے سارے مسلمانوں کو جوش سے بھر دیا۔ اور وہ مسجد کی حرمت اور تقدیس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے طیار ہو گئے، مختصراً اصل واقعہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، کہ مسلمانانِ کان پور نے مولانا آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسہ کان پور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، انھوں نے ایسی پرجوش تقریر کی کہ سارا مجمع جوش سے لبریز ہو گیا اور جلسہ کے ختم ہونے کے بعد اسی جوش و خروش میں کی حالت میں اس نے مسجد کا رخ کیا، اور مسجد کے منہدم حصہ پر اینٹیں چننی شروع کر دیں اس وقت سکھ فوج کا پہرہ پڑ رہا مسٹر ٹیلر کمشنرِ کان پور نے موقع پر پہونچ کر ان نہتے مسلمانوں پر جو مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، فوج کو حملہ کا حکم دے دیا، اور انھوں نے نہایت بے رحمی اور بے دردی سے نہ صرف گولیاں برسائیں، بلکہ قریب پہونچ کر ان کے جسموں کو برچھوں اور نیزوں سے چھلنی کر دیا، جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے، جن میں ننھے ننھے معصوم بچے بھی شامل تھے، شہداء کا صحیح اندازہ تو نہ ہو سکا، لیکن خود گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کی تعداد تیس سے کم نہ تھی، اس سے سارے ہندوستان میں ایک قیامت مچ گئی۔ جس سے حکومت بھی متاثر ہوئی۔ اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر سر علی امام مرحوم تھے، انھوں نے مولانا محمد علی اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیام دیا، اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی، لیکن اس سلسلہ میں حکومت اور مسلمانوں کے نقطہائے نظر میں بڑا شدید اختلاف تھا، مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کو سزا دی جائے، مسجد جیسی تھی ویسی ہی پھر بنوا دی جائے، قیدیوں کو قید و بند سے رہا کر دیا جائے اور جو لوگ شہید ہو گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کیا جائے، لیکن مصالحت کی گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، ملزموں پر سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، مظلوموں کی مالی مدد کی جائے گی، لیکن مسجد کا جو حصہ منہدم کر دیا گیا ہے، اس کے پھر بنوانے پہ مسلمانوں کی طرف سے

اصرار نہ کیا جائے گا۔ مولانا نے اس پر ایک طنزیہ قطعہ لکھا اس کا ایک ایک شعر مسلمانوں کے اس وقت کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے بعض شعر یہ ہیں:-

جزءِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں

آپ کہتے ہیں، وضوخانہ تھا مسجد تو نہ تھی
یہ بجا مسئلۂ فقہ کی تعبیر نہیں

آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ
حاملِ فقہ نہیں واقفِ تفسیر نہیں

بالآخر مصالحت کی گفتگو کامیاب ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند خود کان پور آئے، حکومت کی طرف سے سر علی امام نے نمایندگی کی، اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے، اور دونوں کے اتفاق رائے سے معاملہ اس طرح طے ہوا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، مقدمے واپس لے لئے جائیں گے، اور مسجد کا منہدم حصہ اس طرح تعمیر کیا جائے گا کہ اوپر چھت ہوگی، جس سے وضوخانہ کا کام لیا جائے گا، اور نیچے سے آمد و رفت کے لئے سڑک یا راستہ بنا دیا جائے گا۔ اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا اور وائسرائے بہادر نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، جس کا احرار اور وفاداران حکومت دونوں نے شکریہ ادا کیا، مولانا نے بھی وائسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ کہ کر اپنی شکرگزاری کا فرض ادا کیا، جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

اے ہمایوں گہر و افسر اورنگ شہی
وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے

تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفرمندیٔ سلطانی ہے

تیرے لطف و کرم عام نے دیدی یہ ندا
کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے

تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازووں میں یہ ترے زورِ جہاں بانی ہے

گرچہ مدحِ امراء میں نے نہیں کی ہے کبھی
شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے

مولانا ابوالکلام کو جو گروہِ احرار کے سرخیل تھے، اور جنھوں نے اپنے اخبار الہلال کے ذریعہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کا آل انڈیا مسئلہ بنا دیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:-

"برادرم، کان پور کا معاملہ جس طرح فیصل ہوگیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ مولانا شبلی کی قومی و ملی زندگی کا سب سے آخری مگر سب سے زیادہ جاں گداز حادثہ تھا، جس سے ان کے قلب و دماغ نے بے حد اثر لیا، اور اپنی پراثر نظموں سے انھوں نے سارے ہندوستان میں ایک قیامت برپا کر دی، اگر وائسرائے کی مداخلت سے تعجیل تمام مصالحت نہ ہو جاتی تو مسلمانوں کا جوش آگے بڑھ کر معلوم نہیں کیا رخ اختیار کرتا اور اس بیخودی و سرشاری اور شدت جذبات میں وہ کیا کچھ نہ کر ڈالتے۔ ابھی بلقان کا شورِ محشر بپا تھا اور مسلمانوں کے دل برطانوی وزارت خارجہ کی سیاسی

روش سے سخت مشتعل ہی تھے، کہ صوبۂ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور ان کے ماتحت حکام کان پور کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں اور غلط کوشیوں نے مسجد کان پور کی صورت میں ان کے اضطراب و اشتعال کا ایک نیا سامان پیدا کر دیا، اور وہ غم و غصہ سے اور زیادہ لبریز ہو گئے، گورنمنٹ نے اس جوش کے دبانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، لیکن وہ باوجود قاہری و سلطانی و جباری کے بھی کامیاب نہ ہو سکی، اور اس کو مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جبکہ برطانوی حکومت کا اقبال نصف النہار پر تھا۔ اور اس کے حدود فرمانروائی مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں بڑھتے چلے جا رہے تھے اس کے طنطنۂ جبروت سے ایشیا تو ایشیا سارا یورپ کانپتا تھا، اس حادثۂ خونیں کے ٹھیک ایک برس کے بعد مسلمانوں کی ملی زندگی کا یہ رجزخوان ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا، لیکن اس کی رجزیہ نظموں نے انگریزوں کی سیاست کے خلاف، لوگوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کا جو شدید ترین جذبہ پیدا کر دیا تھا وہی درحقیقت ہندوستان کی تحریک آزادی کا نقطۂ آغاز ہے، جس کے بعد یہ جذبہ بڑھتا گیا، اس لحاظ سے مولانا شبلی، ہندوستان کی تحریک آزادی کے اولین محرک ہیں جن کو ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سیاحت قمر

اگر سیاحت قمر کا مقصود صرف یہ ہوتا کہ کوئی راکٹ وہاں تک پہنچ جائے یا کوئی انسان وہاں پہنچکر مر جائے تو یہ بات زیادہ اہم نہ تھی۔ کیونکہ اس صورت میں ہمارے لئے کوئی ذریعہ اس امر کی تحقیق کا نہ تھا کہ واقعی کوئی راکٹ یا انسان وہاں پہنچا بھی یا نہیں۔ لیکن جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہم وہاں پہنچیں اور لوٹ بھی آئیں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس وقت امریکہ کا منشائے فکر یہی ہے۔

ہر چند وہاں کے بعض ماہرین سائنس اس اقدام کے موافق نہیں ہیں اور وہ پوچھتے ہیں کہ "چاند تک پہنچنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔" لیکن خلش جستجو اس نوع کے اعتراضات کی پروا نہیں کرتی اور وہ برابر اپنی کوشش میں مصروف ہے چنانچہ مریخی راکٹوں اور اپالو نامی فضائی جہاز کی تیاری کے لئے ۲۰ ہزار ارب ڈالر کا بجٹ منظور ہو چکا ہے اور اس کی پہلی قسط یعنی ۲ کروڑ ڈالر صرف کرنے کے ٹھیکے بھی دیدیئے گئے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ چھ سال میں یہ تمام تیاریاں مکمل ہو جائیں گی اور ۱۹۶۸ء تک امریکی انسان سر زمین قمر تک پہنچ جائے گا۔

اس مقصد کے لئے کیلیفورنیا میں اپالو نامی جہاز زیر تعمیر ہے جس کا وزن ۶۷ ٹن ہوگا۔ اور ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرے گا، یہ سفر ۶۰ گھنٹوں میں ختم ہوگا اور اس کے مسافر چاند میں دو تین قیام کرنے کے بعد پھر امریکہ واپس آجائیں گے۔

اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے جو جو آلات تیار کئے جائیں گے یا جتنے تجربات عمل میں آئیں گے ان کی تفصیل سے شاید سائنسداں خود بھی ہنوز واقف نہیں ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چھ سال کے عرصہ میں وہ اپنی تیاریاں مکمل کر سکیں گے یا نہیں۔

نورُاللغات اور فرہنگِ اثر

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(طاہر محسن کاکوروی)

نوراللغات — آدھا پاؤ۔ تھوڑا۔ بہت کچھ۔ کسی قدر۔ (ظفر)

جو میرے رونے پہ ہنستے ہیں یارب ان کو غم نصیب اگرنہ ہو سب آدھا پاؤ ہو تو سہی

فرہنگِ اثر — ظفر نے غم کو ایک اکائی مان کر دعا کی ہے کہ میرے غم کا نصف (آدھا) یا چوتھائی (پاؤ) حصہ میرے دشمنوں پر ڈال دے تاکہ انھیں میری مصیبت کا اندازہ ہو اور مجھ پر ہنسنے کے بہانے روئیں۔ بول چال میں آدھ پاؤ بمعنی سیر کا آٹھواں حصہ ہے نہ کہ آدھا پاؤ۔ اس سے بھی میرے بیان کردہ مطلب کی تصدیق ہوتی ہے۔

طاہر — ملاحظہ ہو امیراللغات۔ تھوڑا بہت۔ تھوڑا سا۔ (رجان صاحب) ق ؎

اس جوائی خصم کا مُنہ میٹوں ادھی پوچھئے پر وہ ہارا ہٹ

ہوگئے دیکھتے ہی نستے ہرن پاؤ آدھا رہا نہ سارا لوٹ

لکھنؤ میں اس جگہ فصحا تھوڑا بہت بولتے ہیں۔ اور شعر کے مطلب کی تو کہئے مت۔ اہلِ سخن آج کل ایک شعر کے کئی کئی مطلب بیان کر دیا کرتے ہیں۔

نوراللغات — آدمی کا جنگل۔ وہ مقام جہاں کثرت سے آدمی ہوں۔ (ناسخ) ؎

قیس کی قیس جانے لیکن ہیں وحشی ہوں آدمی کے جنگل کا

فرہنگِ اثر — شعر کی بات اور ہے نثر میں آدمیوں کا جنگل کہتے ہیں۔

طاہر — امیراللغات میں ہے "آدمی کا جنگل"۔ وہ مجمع جہاں خلایق کا انبوہ ہو۔ (اسیر) ؎

کیا دل لگے جنوں میں وحدت پسند ہوں میں مردم گیا ہے صحرا جنگل ہے آدمی کا

مخزن المحاورات میں آدمی کا بن یا جنگل دیا ہے اور بہار ہند میں آدمیوں کا جنگل ضرور لکھا ہے لیکن سند میں ناسخ کا وہی مذکورہ شعر جو نوراللغات میں ہے پیش کیا ہے۔

نوراللغات — آدھا آدھا ہونا۔ شرمندہ ہونا۔ تھوڑا تھوڑا ہو جانا۔

فرہنگِ اثر — لکھنؤ میں کٹ کٹ جانا۔ پانی پانی ہو جانا اور نہ معلوم کیا کیا بولتے ہیں پرانی زبان تھوڑا تھوڑا ہونا بھی ہے۔ مگر آدھا آدھا ہونا بمعنی شرمندہ ہونا کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔

طاہر — مخزن المحاورات میں ہے "آدھا آدھا ہونا"۔ جی شرمانا۔ محجوب ہونا۔ تھوڑا تھوڑا ہونا محاورات ہند میں بھی

اسی طرح مثل نور اللغات درج ہے۔

نور اللغات — آدھی کو چھوڑ کر ساری کو دوڑنا۔ تھوڑے پر قانع ہوکر زیادہ کی کوشش کرنا۔ (ذوق) ؎

مگر خدا دیوے قناعت ملہ یک مفتہ کی طرح — دوڑے ساری کو نہ کبھی انسان نہ آدھی چھوڑ کر

فرہنگِ اثر — وہی شعر کو محاورے کا بدل بنانا۔ اصل مثل اس طرح ہے "آدھی چھوڑ ساری کو دوڑنا"

طاہر — امیر اللغات میں "آدھی کو چھوڑ ساری کو دوڑنا" درج ہے۔ اور بہار ہند۔ مخزن المحاورات اور محاورات ہند میں مثل نور اللغات درج ہے۔ ہاں "کر" کا لفظ ضرور کتابت کی غلطی ہے جو زاید ہوگیا ہے۔

نور اللغات — آر پار۔ ایسا سوراخ جو ایک طرف سے دوسری طرف ہو جائے۔ (فصحا وار پار بولتے ہیں)

فرہنگِ اثر — یہ فیصلہ غالباً اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں وار پار لکھا ہے اور آر پار کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس بنا پر آر پار کی فصاحت زایل نہیں ہوتی۔

طاہر — امیر اللغات میں "آر پار" (پار اوار اس کی اصل ہے جس کے معنی سنسکرت میں اِس طرف اُس طرف) جو سوراخ ایک طرف سے دوسری طرف برابر نکل جائے۔ (فصحا وار پار بولتے ہیں)۔ کاش اثر صاحب نے نور اللغات کا ضمیمہ ملاحظہ فرما لیا ہوتا جس میں یہ اضافہ کر دیا گیا تھا "ایک طرف سے دوسرے سرے تک (حالی) ؎

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُر خطر سے — گئے وہ کود آنکھ بند کر نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

شاید حضرت اثر فرمائیں کہ یہ دہلی کی زبان ہے لکھنؤ والے نہیں بولتے تو ہم ان کی تشفی کے لئے مراثی میرانیس جلد ششم سے صفحہ ۹۹ کے بند ۱۲۸ سے دو شعر لکھے دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

آئی صدا علی کی یہ پہلو سے ایک بار — اے ابنِ فاطمہ تری غربت کے میں نثار

سچ ہے کہ سر بسر تنِ عباس ہے فگار — آفت کی برچھیاں ہیں کلیجے کے وار پار

اب فیصلۂ فصاحت کا حضرتِ اثر پر چھوڑتا ہوں۔

نور اللغات — آذار۔ (ف۔ مذکر) ایک رومی مہینہ کا نام جو چیت یا مارچ کے مہینے کے مطابق ہوتا ہے، بہار کے مہینہ کا نام

فرہنگِ اثر — اردو میں یہ لفظ رائج نہیں۔ پلیٹس سے آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا، نہ معلوم آذری کو کیوں چھوڑ دیا وہ بھی اسی کے ذیل میں تھا۔ آذر کے بھی وہی معنی ہیں جو آذار کے ہیں آذر کی موجودگی میں آذار لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

طاہر — امیر اللغات — : رسالہ قواعد فارسی میں ہے کہ ابر آذری غلط ہے اور ابر آذاری صحیح ہے۔ اس واسطے کہ آذار بہار کے مہینہ کا نام ہے اور آذر خزاں کے مہینے کا۔ مؤلف کے نزدیک ابر آذری ماہ بہار کے معنی میں بھی آیا ہے تو اور صحیح یہ ہے کہ آذار ایک رومی مہینے کا نام ہے جو چیت اور مارچ کے مہینے سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور ان ایام میں سورج برج حوت میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں آذار اول ماہ بہار ہے اور آذر

سال شمسی کے نویں مہینے کا نام ہے جو پوس اور جنوری سے مطابقت رکھتا ہے اور اس زمانہ میں آفتاب برج قوس میں ہوتا ہے پس یہ مہینہ خزاں کے مہینوں میں سے ہے جیسا کہ ارباب لغت نے تصریح کی ہے پس اب یہ ثابت ہو چکا کہ آذار ماہ بہار کا نام ہے اور آذر ماہ خزاں کا تو اطلاق ابر آذاری کا ابر بہار پر۔ اور اطلاق ابر آذری کا اُس ابر پر جو خزاں میں برسے صحیح ہوگا اور رفع اختلاف اس طرح ہو سکتا ہے کہ آذر مخفف آذار کا بھی آیا ہے جو نام ماہ بہار کا ہے۔ جیسا کہ مؤلف غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ (آذر بفتح ذال معجمہ مخفف آذار ماہ رومی) پس جہاں ابر آذری بمعنی ابر بہار شعرائے کلام میں ہو وہاں آذر کو مخفف آذار جاننا چاہیئے نہ کہ نام ماہ خزاں" ہفت قلزم۔ فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ انندراج سب مؤلف نوراللغات کے موید ہیں۔

نوراللغات ــــ آرام جان۔ (بلا اضافت و باعلان نون) (لکھنؤ) مذکر۔ ایک قسم کا پاندان۔ حسندان۔ (تسلیم) ؎

ہم نے جو پان مانگا باتوں میں زہر گھولا ۔۔۔ اور آ گیا جو دشمن آرامجان کھولا

فرہنگِ اثر ــــ یہ آرام جان نہیں، آرام دان ہے۔ علامت ظرف دان ہے نہ کہ جان۔ پاندان۔ سبودان۔ اگالدان وغیرہ میرے پاس جو نسخۂ امثال ہے (ناتمام ہے اور مؤلف کا نام تحقیق نہ ہو سکا) اس میں صاف صاف آرام لکھا ہے۔ اس عبارت کے ساتھ "ایک چھوٹا پاندان جو مقابہ کی قطع کا ہوتا ہے اور یہ لکھنؤ میں ایجاد ہوا ہے" بعد ازاں خود ہی آرام دان لکھ کر اس کو آرام جان کا مرادف قرار دیتے ہیں۔ کوئی تک بھی ہے۔

طاہر ــــ امیراللغات = آرام جان۔ نمبر (۱) (بلا اضافت آرام و باعلان نون) چھوٹا سا پاندان جس کا ڈھکنا قبدار خاصدان کی قطع کا ہوتا ہے اور اندر تھالی بھی ہوتی ہے اس کو حسندان بھی کہتے ہیں۔ لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ تذکیر و تانیث جلیس میں ہے آرام جان۔ مذکر۔ تسلیم کا شعر لکھ کر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں "آرام جان اور حسندان لکھنؤ کا ایجاد خاص ہے"۔

نوراللغات ــــ آزاد۔ آزادہ۔ آزاد اور آزادہ کا فرق۔ آزاد۔ اس کو کہتے ہیں جس کی رہائی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔ اور آزادہ، اس کو کہتے ہیں جس کی رہائی اسی کے اختیار میں ہو۔ آزادہ میں "ہ" اس غرض سے ہے کہ دال کی حرکت ظاہر ہو سکے۔

فرہنگِ اثر ــــ یہ غیاث اللغات بحوالۂ بہار عجم کا ترجمہ ہے۔ "آزاد بجائے مستعمل میشود کہ اختیار رہائی او بدست دیگرے باشد۔ و آزادہ بجائے مستعمل میشود کہ اختیار رہائی او بدست ہمیں کس باشد" میرے لئے اس عبارت کا سمجھنا ہی ایک ہم ہے۔ آزاد اور آزادہ دونوں گرفتار ورنہ آزادی اپنے یا پرائے بس میں کیوں ہو۔ اگر آزاد اور آزادہ میں فرق ہے تو میری رائے یہ ہے کہ "آزادہ وہ شخص ہے جو کسی کا پابند نہ ہو اور ہر قسم کے تعلق سے بری ہو"۔ "آزادہ یا آزادہ رو۔ وہ ہے جو اپنے دل یا ضمیر کے سوا کسی اصول یا قواعد کا پابند نہ ہو۔ من موجی۔ نحوی اعتبار سے آزادہ آزاد کا مزید علیہ ہے، جیسے آشیاں سے آشیانہ۔ موج سے موجہ"۔

طاہر ــــ امیراللغات ۔ ــــ " بعض اہلِ تدقیق یہ فرق تجویز کرتے ہیں کہ آزاد وہ ہے جس کی رہائی دوسرے
کے اختیار میں ہو۔ جیسے لونڈی، غلام ۔ اور آزادہ اُسے کہتے ہیں جس کی رہائی خود اُسی کے ہاتھ میں
ہو، جیسے خواہش نفس آزادہ"
فرہنگِ جہانگیری میں ۔ آزاد شش معنی دارد ۔ اول در فرہنگ ہا بمعنی بے قید مسطور است ۔ چنانچہ
اگر کسے گوید کہ فلاں بندہ را آزاد کردم ۔ ارادۂ آں باشد کہ از قید عبودیش نجات دادم ۔ فرہنگ انندراج
آزاد و آزادہ ۔ ف ۔ بمعنی غیر بندہ کہ عرب عتیق ضد عبید گوید ۔ بے قید و بے تعلق را نیز گویند و تفرقہ دیگر
آنکہ آزاد کسے را گویند کہ اختیار دادن خلاص و نادادن آں بدست دیگرے باشد ۔ اما چیز یکہ اختیار خلاص
شدن ازاں بدست ایں کس باشد پس رہائی یافتہ ہی چنیں بندہ آزادہ گویند ۔ ہفت قلزم، لطائف اللغات
لغات فیروزی اور لغات فارسی بھی نوراللغات کی تائید میں ہیں ۔

نوراللغات ــــ آسا جئے نرا سا مرے ۔ امیدوار امید کے آسرے پر جیتا ہے اور مایوس مرتا ہے ۔ (نراسا ۔ ناامید ۔ مایوس)
فرہنگِ اثر ــــ میں نے اس مثل کو اس طرح بھی سنا ہے "آسا مرے نراسا جئے"
طاہر ــــ امیراللغات میں مثل نوراللغات ہے اور خزینۃ الامثال میں دونوں طرح درج ہے ۔

نوراللغات ــــ آس ہونا ۔ نمبرا ۔ امید ہونا ۔ بھروسا ہونا ۔ نمبر۲ ۔ حمل ہونا ۔ (دیکھو آس نمبر۲ ۔ بچہ پیدا ہونے کی امید)
فرہنگِ اثر ــــ آس ہونا ۔ حمل کے آثار نمودار ہونا ہے اور عورتیں زیادہ تر آس سے ہونا بولتی ہیں نہ آس ہونا ۔
طاہر ــــ امیراللغات ۔ نمبر۲ ۔ حمل ہونا ۔ مثال کے لئے دیکھو آس نمبر۲ ۔
بہار ہند میں آس ہونا یا آس ہے لکھا ہے ۔ نمبرا ۔ امید ہونا ۔ توقع ہونا ۔ نمبر۲ ۔ عورتیں حمل ہونے کی جگہ
بولتی ہیں ۔ (ملاحظہ ہو نوراللغات میں آس ہونا سے پہلے صفحہ ۹۲ پر آس سے ہونا بھی لکھا ہوا ہے ۔

نوراللغات ــــ آسکت (ع) (س ۔ بسکون دوم ۔ بفتح سوم) مونث عوام کی زبان میں آلکسی ۔ سستی ۔ کاہلی ۔
فرہنگِ اثر ــــ اردو میں الکسی کہتے ہیں کوئی تخصیص نہیں کہ آسکت قصباتی زبان ہے ۔
طاہر ــــ امیراللغات ۔ آسکت ۔ ھ ۔ مؤنث ۔ آلکسی ۔ سستی ۔ کاہلی ۔ عوام کی زبان ہے ۔ ارمغان دہلی اور فیلن
نے بھی اس کو لکھا ہے اور معنی بھی وہی لکھے ہیں جو نوراللغات میں دئے گئے ہیں ۔

نوراللغات آسمان زمین کا رونا ۔ (مجازاً) غم کا عام ہونا ۔
فرہنگِ اثر ــــ جہاں تک مجھے علم ہے یہ نہ تو کوئی محاورہ ہے نہ روزمرہ ہے شاعری ہو تو ہو مگر کوئی مثال نہیں پیش کی گئی ۔
طاہر ــــ امیراللغات ۔ (آسمان و زمین کا رونا ۔ غم و تاسف کا عام ہونا ۔ (فقرہ) اس کی مصیبت پہ تو آسمان و زمین
روتے تھے) دیکھئے دریائے لطافت میں آسمان و زمین کا رونا درج ہے ۔

نوراللغات ــــ آسمان و زمین کے قلابے ملانا ۔ نمبرا ۔ انتہائی کوشش کرنا ۔ محال کو ممکن کر دکھانا ۔ (کیف) ؎

ابھی ملا دوں زمیں آسماں کے قلابے اگر تلاش سے میری وہ مہ لقا ملجائے

مسودۂ قلمی نوراللغات میں ذوق کا یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

قلابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو اس مہروش کے ملنے کی بتلا مجھے صلاح

فرہنگِ اثر —— صحیح محاورہ و نشست الفاظ "زمین آسمان کے قلابے ملانا" ہے۔ نظم کی بات اور ہے مگر نثر میں محاورے کے الفاظ مقدم و موخر کرنا جایز نہیں۔ لطف یہ ہے کہ مثال میں جو شعر پیش کیا گیا ہے میری تائید میں ہے۔ (کیفؔ)

ابھی ملا دوں زمین آسمان کے قلابے اگر تلاش سے میری وہ مہ لقا مجھے ملجاے

(نثر میں آسمان کے نون کا اعلان ہوتا ہے۔ زمین آسمان کے قلابے ملانا)

طاہر —— امیر اللغات۔ آسمان زمین کے قلابے ملانا۔ نمبر (۱) انتہائی کوشش کرنا۔ (کیفؔ) ؎

ابھی ملا دوں زمین آسمان کے قلابے اگر تلاش سے میری وہ مہ لقا مجھے ملجائے

نمبر (۲) ہل چل مچانا۔ ہنگامہ برپا کرنا۔ (اسیرؔ) ؎

گھبرا کے ایک آہ بھی کھینچوں اگر اسیرؔ قلابے آسمان و زمیں کے ملاؤں میں

بہار ہند نمبر ۱ محال کو ممکن بتانا۔ نمبر ۲ جھوٹ بولنا۔ نمبر ۳ خلاف قیاس بات کہنا۔ ۴ فریب یا چالاکی کرنا۔ نثر و نظم میں آسمان کے اعلان نون کا جھگڑا ارباب ذوق طے کریں۔ ہم نے مستند کتابوں کے حوالے دیدئے ہیں۔

نوراللغات —— آسمان و زمین کھا گئے۔ کہیں پتہ نشان نہیں ہے۔ (شوقؔ) ؎

رشک یوسف جہاں میں تھے جو حسیں کھا گئے ان کو آسمان و زمیں

فرہنگِ اثر —— اصل روزمرہ یوں ہے۔ آسمان کھا گیا کہ زمین۔ جس طرح فاضل مؤلف نے درج کیا ہے اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر کھا گئے۔

طاہر —— امیر اللغات۔ آسمان زمین کھا گئے۔ یعنی کہیں پتہ نہیں۔ (نواب مرزا شوقؔ) ؎

رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں کھا گئے ان کو آسمان و زمیں

اور یوں بھی بولتے ہیں۔ (جیسا نوراللغات کے صفحہ ۔ ۲ پر درج ہے)۔ (آسمان کھا گیا کہ زمین) مگر وہاں مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کیا ہوئی۔ کہاں نیست و نابود ہوگئی۔ (ظفرؔ) ؎

کہاں گیا مرا قاصد خبر نہیں اس کی زمین نے کھا لیا کہ ہے آسمان نے کھایا

نوراللغات میں آسمان "و" زمین لکھا ہے جس میں واؤ کا اضافہ اصلاح کاتب ہے۔

نوراللغات —— آسمان دیکھنا۔ کمال یاس میں نظر بند کرنا۔ تعجب۔ حیرت۔ مجبوری کی حالت میں آسمان پر نظر کرنا۔ ؎

وہ ماہرو نظر نہیں آتا تو اے حبیبؔ ہم بار بار دیکھتے ہیں آسمان کو

۲۔ جب متلی ہوتی ہے تو عورتیں کہتی ہیں کہ آسمان دیکھو۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اوپر نظر کرو تاکہ طبیعت دوسری طرف متوجہ ہوجائے۔ ملاحظہ ہو ضمیمۂ نوراللغات میں آسمان دیکھنا یا آسمان کو دیکھنا۔

نوراللغات —— آسمان کا تھوکا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔

فرہنگِ اثر —— "اپنے ہی" کا ٹکڑا جزو محاورہ نہیں۔ محاورہ بغیر اس کے ہے۔

طاہر —— امیر اللغات۔ آسمان کا تھوکا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔ خزینۃ الامثال۔ آسمان کا تھوکا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔

مرزا غالب اور مصحفی

(افسر امروہوی)

(قسط ششم)

غالب کے کلام میں اگرچہ صنائع و بدائع بہت کم پائے جاتے ہیں تاہم رعایت لفظی سے جس کو اس دور میں شعرائے لکھنؤ نے بہت زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ وہ بھی بالکل محفوظ نہ رہ سکے تھے بایں ہمہ انھوں نے دو چار اشعار کو چھوڑ کر اکثر اس صنعت میں جدتیں اور لطافتیں پیدا کی ہیں۔

شیخ مصحفی کا شمار قریب قریب شعرائے متقدمین میں ہے اور متقدمین اساتذہ کو رعایت لفظی اور ایہام سے بہت زیادہ رغبت تھی شیخ مرحوم کے کلام میں اس کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مثالیں ملتی ہیں تاہم موصوف کی صفائی طبع اور روانی بیان نے اس صنعت کو کہیں بدنما نہیں ہونے دیا۔ رعایت ہے مگر اس لطف کے ساتھ کہ یک لخت اس طرف کسی کی نگاہ نہیں جا سکتی۔ مثلاً ؎

اللہ رے تیرے سلسلۂ زلف کی کشش | جاتا ہے دل اُدھر کو کھنچا کائنات کا
ہنستا ہے پریشانیٔ عاشق پہ جو ہر دم | اس گل نے زمانے کی ہوا کو نہیں دیکھا
رد بات کا ہرگز نہیں اس بزم میں مجھ کو | جوں آئینہ اک میں بھی ہوں منھ دیکھنے والا
خدا کے واسطے چوب قفس کو سُرخ نہ کر | ہمارے خون پہ باندھی ہے کیوں کمر صیاد
کیا قیامت ہے کہ وہ شوخ چھپائے منھ کو | اپنا دیدار ہمیں روز جزا دکھلا کر
آیا نہ وہ تو صورت پروانہ جل گیا | ہیں دیکھ کر چراغ سر شام کی طرف
خدا کے واسطے چاک قفس میں پھول نہ رکھ | کہ برگ گل مری چھاتی پہ سنگ ہے صیاد
مصحفی جا کے میں گلزار سے ناشاد آیا | نہ ہوئی نکہتِ گل سے بھی ہواداریٔ دل
ہے تیرگی میں کس کو سفید و سیہ کا فرق | زندانیوں کو شام و سحر دونوں ایک ہیں
وہی دشت اور وہی گریباں چاک | جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں
نرگس کی ہے وہ آنکھ نہ گل کا وہ رنگ ہے | کیا ان دنوں ہوائے گلستاں پلٹ گئی

بعض مقامات پر رعایت لفظی سے ایک عجیب لطافت پیدا کی ہے ؎

کی ذرا آب دم شمشیر قاتل نے کمی | ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

آب دم شمشیر قاتل کی کمی کرنے کے لحاظ سے پیمانہ لبریز ہونا ایک لطیف رعایت ہے ؎

سر سے اک شعلہ لگا ایسا کہ ساری جل گئی | کچھ نہ پوچھو ہم سے شمع انجمن کی سرگزشت

سر سے شعلہ لگ جانے کے بعد سرگزشت کا استعمال کس قدر مزے دار ہے ؎

ہم جانتے ہیں کوچۂ جاناں کا مرتبہ | مسجود خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے

مسجود خلق ہونے کے لحاظ سے سرزمین کہنا بے مثل رعایت ہے۔

کہا تو نے نہ دیکھا کر مجھے، کیا عذر ہے مجھکو بجا لاؤں گا تیرا حکم تا مقدور آنکھوں سے

نہ دیکھنے کی تاکید کے بعد آنکھوں سے اس کی تعمیل کرنا لفظی رعایت کی دنیا میں لاجواب مثال ہے۔

درد و غم، حسرت و تمنا، و یاس و ناکامی کے مضامین میں مرزا غالب نے میر تقی مرحوم کو اپنا پیشرو بنایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بقول سید امداد اثر جذب و تاثیر کے لحاظ سے ان کے اشعار میں ایسی نشتریت ہے کہ دوسرے اُردو شعراء کے یہاں ذرا کم دیکھنے میں آئے گی۔

یہی مضامین یاس و ناکامی شیخ مصحفی مرحوم کا حصہ ہیں جیسا کہ ہم نے مماثلت میرؔ و مصحفی کے سلسلے میں ثابت کیا ہے۔ اگرچہ شیخ مرحوم کے اشعار درد انگیز و حسرت خیز کی معقول تعداد درج کی جا چکی ہے۔ تاہم مرزا غالب کے مضامین زار نالی کے سلسلے میں گزیدہ اشعار کا ایک اور انتخاب پیش کیا جاتا ہے ؎

درد و غم کو بھی ہے مقدر شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

گھیرے رہی اُسی کو گلستاں میں رات برق جس شاخ پر چمن میں مرا آشیانہ تھا

اس طرف ہم ہونگے رخصت اس طرف تو جائیو کاٹ دے اے شمع اک شب گریہ و زاری میں اور

کیا تھا جمع مال اپنا مصیبت یہ نہ سمجھا تھا شرارے برق ہو ہو کر گریں گے میرے خرمن پر

ہم اسیران قفس لطف چمن کیا جانیں کون لے جاتا ہے ہمکو گل و گلزار کے پاس

ہو چکے وہ دن کہ رشک قمر تھا رو برو مصحفی اب میں ہوں تنہا اور شب تار ہجراں

اتنا نہیں کوئی کہ خبر اس کی آکے لے کب سے بجھا پڑا ہے چراغ مزار دل

آیا نہ وہ تو صورت پروانہ جل گیا میں دیکھ کر چراغ سر شام کی طرف

نے محرم چمن نہ شناسائے باغ ہیں ہم اپنے ہی نصیب کے ہاتھوں سے داغ ہیں

زبان بریدہ سے لے ہم صفیر ہم بھی ہیں جہاں میں اور قفس میں اسیر ہم بھی ہیں

فلک کہاں تو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں

نہ تنہا ہم ہی مثل گل گریباں چاک رہتے ہیں جو تیرے ملنے والے ہیں وہ سب غمناک رہتے ہیں

یار ہیں جتنے سب، مہرباں کوئی نہیں ہم سے ہنس کر بولنے والا یہاں کوئی نہیں

وائے ناکامی کہ فریادی ہیں ہم اس شہر میں جز خموشی داد رس اپنا جہاں کوئی نہیں

جو ہم تنہائی میں فریاد کیا کرتے ہیں وصل کی شب کے مزے یاد کیا کرتے ہیں

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو وہ نہ آئے اور جھپکے تو وہی خواب پریشاں دیکھوں

وصل کا روز جسے کہتے ہیں سب اہل جہاں میں بھی وہ دن کبھی لے کر گردش دوراں دیکھوں

ہائے جن آنکھوں سے دیکھا رخ روشن اس کا پھر انھیں آنکھوں سے روئے شب ہجراں دیکھوں

نہ یہ طاقت کہ اس کی بزم سے اُٹھ کر میں گھر جاؤں نہ مقدور اس قدر مجھ کو کہ قرباں ہو کے مر جاؤں

ساتھ لے جائے کہاں عشق کی رسوائی کو گور بھی تنگ ملی ہے ترے سودائی کو

ہیں وہ بیکس ہوں کہ مانند چراغ سر راہ مر بھی جاؤں تو کوئی آکے نہ دے مجھکو

اس قدر چشم خلائق میں سُبک ہوں کہ اگر　　ڈوبنے جاؤں تو دریا نہ ڈبوئے مجھ کو

نہ یار ہے نہ کوئی آشنا ہے میرے ساتھ　　خدا کے ساتھ ہوں میں اور خدا ہے میرے ساتھ

ہم نے چاہا تھا کریں گے رُخ جاناں پہ نگاہ　　رہ گئی ضعف سے آکر سر مژگاں پہ نگاہ

عزم ہو تجھکو اگر برق ادھر آنے کا　　پہلے کر لیجیوُ مرے سر و ساماں پہ نگاہ

قصہ کوتہی عمر جو چھیڑا اُس نے　　شمع بھی روئی سحر تک ترے بیمار کے ساتھ

شاہد رہیو تو اے شب ہجر　　جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

جورِ فراق بھی ستم آسماں بھی ہے　　دل کی طرف سے یاس کبھی ہے خوف جاں کبھی

دیکھوں قفس میں گر کسی مرغِ اسیر کو　　اتنا کہوں کہ کچھ خبر آشیاں بھی ہے

حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کی روئیے　　جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

ہزاروں حوادث ہیں تا زندگی ہے　　یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

رشک ہے حال زلیخا پہ کہ ہم سے بدبخت　　خواب میں بھی نہ کبھی وصل سے مسرور ہوئے

کارواں دور گیا پاؤں تھکے جی ہارا　　کون اب منزلِ مقصود کو پہنچائے مجھے

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہوا چلی ہے　　اپنا دل فسردہ تصویر کی کلی ہے

سراغِ قافلۂ اشک کیجئے کیونکر　　نکل گیا ہے یہ کوسوں دیارِ حرماں سے

بیاباں در بیاباں ہر طرف آوارہ پھرتے ہیں　　نہیں بھولے ہیں ہم ایسے کہ ہمکو راہ یاد آئے

نہ غنچہ لائی نہ گل ارمغاں ہزار افسوس　　ہمیں قفس میں نسیم بہار بھول گئی

جو کچھ شکستہ قفس کی بھی تیلیاں ملتیں　　تو ہم انھیں کو خس و خار آشیاں کرتے

مرزا غالب کی مضامین نگاری مسلم ان خیالات کی پرواز بعض اوقات اس قدر بلند ہوتی ہے کہ سامعین اور ناظرین کا طائرِ فہم رسائی حاصل کرنے میں ناکامیاب رہ جاتا ہے ۔ ایسی بلند پروازی اور علو تخیل کا طفیل ہے کہ آج جانشینان حضرت داغ کی طرح شارحین دیوان غالب کی بھی ایک معقول تعداد ہند و پاک میں نظر آتی ہے ۔

مصحفی مرحوم میر کی طرح بعید الفہم اور پیچ در پیچ مضامین کو شانِ غزل گوئی کے منافی خیال کرتے تھے ۔ وہ ایسی شاعری کے قائل نہ تھے جسے سن کر سامع کا ذہن مصیبت اور دماغ کی کشاکش میں پڑ جائے ۔ بلکہ ایسی شاعری کے دلدادہ تھے، جو دماغ کے بجائے دل کو سرمایۂ لطف سے مالا مال کر دے ۔ اس قدر تخالف و طبائع کے بعد دونوں کے دیوان سے یکسانیت مضمون کی مثالیں بہم پہنچانا آسان کام نہیں ۔ باایں ہمہ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جو بلحاظ الفاظ کتنے ہی متغائر کیوں نہ ہوں مگر بلحاظ معنی ایک دوسرے کے بالکل موافق ہیں ۔ اور یہ شاید اثر اس بات کا ہے کہ شیخ مصحفی کی طرح مرزا غالب بھی غزل گوئی میں نظیری نیشاپوری کے مقلد و متبع تھے ۔

تمام موجودات عالم کو جن دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان میں نیچا درجہ مادیات کا ہے اور اونچا درجہ مجردات کا ۔ مجردات اپنی لطافت کے لحاظ سے نامحسوس اور غیر مرئی ہیں ۔ اور جب ظہور کرتے ہیں تو محسوس اور مرئی اشیاء کے پردے میں ظہور کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام موجودات عالم کو انوار الٰہیہ کا مظہر اتم مانتے ہیں اور ہر صاحب دل کو مشورہ دیتے ہیں کہ معمورۂ عالم کی حدود سے گذر کر لق و دق میدان میں جلوۂ ذات کی

تلاش کرنا فضول اور لایعنی ہے۔ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

سنسان دشت میں مجھے چل اے جنوں　　ظلِ درخت سایۂ دیوار کچھ تو ہو

کیونکہ بقول مرزا غالب ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ فصلِ بہاری کا

رشک ایک شریف جذبہ ہے کیونکہ حقیقی محبت محبوب کی کسی چیز کو بھی دوسروں کے حصے میں آنا گوارا نہیں کر سکتی شاعرانہ طور پر اس کی انتہا یہ ہو سکتی ہے کہ محبت کرنے والا خود اپنی ذات پر بھی رشک کرنے لگے شیخ مصحفی فرماتے ہیں :۔

رشک اوروں سے جو ہے ہمکو ترے کوچے میں　　اپنے پیروں کے نشان آپ مٹا جاتے ہیں

یعنی یہ کہ جب ہم ہی اس کوچہ سے جا رہے ہیں تو ہمارے پاؤں کے نشان بھی یہاں کیوں رہ جائیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں :۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے　　میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

عاشقانہ شاعری میں خلوت اور وصل کے مرقع تمام شعرائے اُردو نے کھینچے ہیں لیکن ایسے لوگ کم ہیں جنھوں نے لطیف طرز ادا کو ہاتھ سے نہ دیا ہو اور عشق و محبت کے دامن کو بوالہوسی کی چھینٹ سے بچانے کی سعی کی ہو شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہیں۔

بیدار ہیں طالع انھیں لوگوں کے جو ہرگز　　پاؤں پہ ترے رکھ کے سر اپنا نہ اٹھائیں

اور مرزا غالب کا شعر ہے۔

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں　　جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

وصل اور خوش نصیبی کی نقشہ کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔

معشوق کی جفا جفا ہی لیکن اس سے کم از کم اتنا پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ اس نے اپنے عاشق کو فراموش نہیں کیا۔ یہ فراموش نہ کرنا عاشق کے لئے سرمایۂ تسکین و موجب سکون ہے کیونکہ اس سے باہمی تعلق باطن کا ثبوت ملتا ہے۔ اور عاشق دنیائے محبت میں بالکل تہی دامن نہیں رہ سکتا اس لئے شیخ مصحفی فرماتے ہیں ؎

دیتے نہیں جو داد تو بیداد کیجئے　　یعنی کسی طرح تو ہمیں یاد کیجئے

اور مرزا غالب کہتے ہیں :۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اس یقین کے ساتھ کہ. . . . . بادشاہ کسی گدا کا مہمان نہیں ہو سکتا۔ کوئی دردمند اپنے مسیحائے دردِ دل کو یک لخت اپنے سامنے دیکھ لے تو اس کی حالت اسکے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ کبھی مکان کو دیکھے کہ بدل تو نہیں گیا کبھی آنے والے کو دیکھے کہ دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے یا آخر رہ جائے یہ سوچنے لگے کہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ شیخ مصحفی کہتے ہیں :۔

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیش نظر معشوق ہے ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

اور مرزا غالب برجستگی کے ساتھ یوں کہتے ہیں ۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ایک مذہبی مسئلہ ہے کہ طالبان دیدار خداوندی قیامت کے دن دیدارِ خداوندی سے شرف اندوز ہوں گے ۔ فلسفیانہ طور پر اس کے دلائل کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے خیال میں شاعرانہ حیثیت سے اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ :۔

شاید اس کے حسن میں باقی ہے آرائش ہنوز روزِ محشر پر جو رکھا وعدۂ دیدار کو

مرزا غالب کا خیال بھی یہی ہے لیکن وہ دلیل سے کام لینا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ محوِ آرائش ہستی کے انہماک خود آرائی پر ایک لفیس نقاب اور ڈال دیتے ہیں ۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اہل درد کے خیال میں دردِ عشق راحتِ باطن کا موجب اور لطف زندگی کا سرمایہ ہونے کے باعث ایسی قابل قدر چیز ہے کہ جیتے جی ہاتھوں سے نہیں کھونا چاہیئے ۔ اس لئے وہ ہمیشہ ایسے زخم کی تمنا کرتے ہیں جو مندمل ہو کر خندہ زنی کا سبب نہ بنے ۔ اور قیامت تک اپنی تازگی کو بحال رکھے کیونکہ علاج پذیر زخم کی تمنا کرنا بوالہوسی میں داخل ہے ۔ شیخ مصحفی فرماتے ہیں :۔

وہ زخم چاہتا ہوں تری تیغ تیز کا جو روز حشر منھ پہ میرے خندہ زن نہ ہو

اور مرزا غالب کہتے ہیں :۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

منزل تسلیم و رضا میں پہنچ جانے کے بعد عاشق کو رغبت و نفرت کا احساس نہیں رہتا اب وہ اس حالت میں ہوتا ہے کہ معشوق کے ہر حکم پر گردن جھکانے اور ہر کام کو بہ نظر استحسان دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا حتیٰ کہ معشوق کو غیر کے ساتھ گرم اختلاط دیکھ کر بھی خاموشی سے کام لیتا یا عاجزانہ الفاظ میں اس تفریقِ سلوک کی طرف اشارہ کر دیتا ہے ۔ شیخ مصحفی کہتے ہیں ۔

غیر سے گرم ملو ہم پہ یہ بیداد رہے اور تو کیا کہیں ہم تم سے مگر یاد رہے

مرزا غالب کہتے ہیں ۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اہل باطن کے لئے دنیا ایک قید خانہ ہے عیش و عشرت کا زمانہ ہو یا رنج و غم کے ایام ۔ ان کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی، ہر موسم بہار کی آمد کے وقت دل میں اُمنگ اور طبیعت میں ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کنج قفس سے نکل کر جسے دنیا والے جسم کہتے ہیں اپنے گلشن مقصود کی سیر کریں لیکن بد قسمتی سے کوئی موقع نصیب نہیں ہوتا اور یہی سوچتے سوچتے ایک عرصۂ دراز منقضی ہو جاتا ہے ۔ شیخ مصحفی فرماتے ہیں ۔

فصل گل سو بار آئی ہم نہ چھوٹے قید سے بند ہیں کنج قفس میں ایک مدت ہو گئی

مرزا غالب کہتے ہیں ۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو　　　وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

عشق کا تقاضہ ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے جفائیں سہے تکلیفیں اُٹھائے بعض اوقات صبر و سکون سے کام لے اور بعض اوقات آہ و زاری کا موقع حاصل ہو تو درد دل کہے اور جہاں تک ممکن ہو دعویٰ عشق میں ثابت قدم اور راہ وفا میں مستقل رہے لیکن جب تمام ترکیبیں بے سود ثابت ہوتی ہیں اور نا آشنا معشوق کے آشنا ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو زندگی وبال ہو جاتی ہے اور پھر ایک منٹ بھی زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا ایسی حالت میں معشوق کی غیر متغیر سرد مہری عاشق کو عشق و وفا کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے اور جب یہ مایوس محبت مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو اس کے خیال میں بندشِ حیات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کسی مخصوص جگہ کی قید نہیں رہتی شیخ مصحفی فرماتے ہیں ۔

کوچہ ہو ترا یا کسی مقتل کی زمیں ہو　　　مرنا ہی ہمیں مدِّ نظر ہے تو کہیں ہو

اور مرزا غالب کا شعر ہے ۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

بے پروائی حسن کا شیوہ ہے اور عیش و عشرت میں استغراق بے پروائی کا نتیجہ اس لئے معشوق بزم نشاط کو آراستہ اور بزم صہبا کو قائم رکھے اور دردمند محبت کی طرف خیال بھی نہ کرے تو چنداں حیرت انگیز نہیں البتہ عاشق کو اپنی کم نصیبی اور نارسائی پر گریہ و زاری کرنے کی وجہ ہے کہ معشوق کی محفل عشرت میں باریاب نہیں۔ شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہیں ۔

شب تری مجلس میں واں دور قدح چلتا رہا　　　تا سحر یاں آنسوؤں سے سبحہ گردانی ہوئی

دور قدح کے ساتھ سبحہ گردانی تازگی مضمون کی بہترین مثال ہے اسی حالت کا نقشہ مرزا غالب اس طرح کھینچتے ہیں ۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال　　　یاں ہجوم اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

اہل عشق جانتے ہیں کہ عشاق کے رنج و راحت اور تکلیف و آرام کا سرچشمہ معشوق ہے ایک ہی ہستی کسی وقت روح کو توانائی اور دماغ کو سکون پہنچاتی ہے اور دوسرے وقت طبیعت میں ہیجان اور دل میں اضطراب پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے

شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہیں ۔

مُردوں کو جلاتی ہے ترے پاؤں کی ٹھوکر　　　اس چال پہ مرنا ہے بجا کبک دری کا

مطلب یہ ہے کہ ایسے معشوق کی رفتار پر جان دینا بالکل درست ہے جس کے پاؤں کی ٹھوکر مردوں کو زندہ کرتی ہے کیونکہ ادھر جان دینے والا جان دے گا اور ادھر زندہ ہو جائے گا مرزا غالب اسی مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں ۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا　　　اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

دونوں شعروں میں محاورات نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں البتہ مفہوم اصلی مرزا غالب کے یہاں ذرا نمایاں ہے اور شیخ مصحفی کے یہاں در پردہ ۔

اسبابِ طرب جتنے تھے موجود تھے لیکن   ہمت مری طالب نہ ہوئی چرخِ دنی سے   مصحفی

نسیہ ونقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے   غالب

حیران ہے کس کا جو سمندر   مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے   مصحفی

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا   آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے   غالب

نہ گیا اس پری کو خط لکھنا   ہاتھ جب تک میرے قلم نہ ہوئے   مصحفی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں   ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے   غالب

رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے   یہ سمجھ لیجیو کہ ہمسایوں کے گھر بیٹھ گئے   مصحفی

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں   دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں   غالب

عکس آئینہ میں دیکھا تو گیا ہاتھ سے دل   آپ ناظر ہوئے وہ آپ ہی منظور ہوئے   مصحفی

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا   غالب

بے کسی پر رحم آتا ہے اگر میں مٹ گیا   پھر کہاں اس کا ٹھکانا، در بدر ہو جائیگا   مصحفی

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب   کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد   غالب

مرزا صاحب مرحوم کی ندرت پسند طبیعت کا اقتضا تھا کہ اپنے لئے زمینیں جداگانہ اختیار کرے پھر بھی پانچ سات غزلیں ایسی ہاتھ آگئی ہیں جن میں دونوں باکمالوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ انہیں کے چند ہمقافیہ اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ہم قافیہ اشعار کا تقابل کرتے ہوئے شیخ مصحفی و مرزا غالب کے زمانۂ شاعری کے فصل و لبعد اور رنگ شاعری کے اختلاف کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ دو شاعر ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہو سکتے۔

مجھے اشکوں میں یوں لختِ جگر بہتے نظر آئے   کہ جیسے وقتِ شب دریا میں عالم ہو چراغاں کا   مصحفی

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے   مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا   غالب

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر   نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوالِ زنداں کا   مصحفی

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے   دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا   غالب

شب مہتاب میں کیا کیا سماں ہمکو دکھاتا ہے — بکھرنا چاند سے چہرے پر اس زلفِ پریشاں کا — مصحفی
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا — غالب

نہ سمجھا قدردان ظلم ہوگا ہیں وہ رہبر دیوانے — دیئے ہیں تازیانے کھا کے بوسے دست رہزن پر — مصحفی
فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر — غالب

جو چاہا دل نے وہ ہم نے نہ چاہا واہ ری ہمت — رہے گا حشر تک خون تمنا اپنی گردن پر — مصحفی
جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی — گریبان چاک کا حق ہوگیا ہے میری گردن پر — غالب

اسیری گر مقدر ہے تو ہرگز غم نہ کھا اس کا — گراں قمری کو کب ہے طوق اپنا اپنی گردن پر — مصحفی
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے — کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر — غالب

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز — اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز — مصحفی
اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رندِ شاہد باز — غالب

زلف جھک کر سلام کرتی ہے — رُخ کو اور رُخ کہے ہے عمر دراز — مصحفی
تو اور آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہائے دور دراز — غالب

اس کا آہستہ بولنا ہے غضب — تسپہ ہے قہر نرمی آواز — مصحفی
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز — غالب

اے صبا اس گلی میں گر جائے — کہیو میرا بھی تو سلام نیاز — مصحفی
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو — ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز — غالب

آنے دیتا ہے مجھے بزم میں اپنی وہ کب — جس نے دم بھر نہ دیا بیٹھنے دیوار کے پاس — مصحفی
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے — بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس — غالب

کون آتا ہے عیادت کو دلِ زار کے پاس — لوگ سب جمع ہیں اُس نرگس بیمار کے پاس — مصحفی
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس — غالب

آیا تھا کون بند کھلے رات باغ میں	جو آج چاک چاک ہے جیب قبائے گل	مصحفی
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو	جس کا خیال ہے گلِ جیب قبائے گل	غالب

اس کا یہی سبب ہے جو گرم فغاں نہیں	میرا تو اس چمن میں کوئی ہمزباں نہیں	مصحفی
پاتا ہوں داد اُس سے کچھ اپنے کلام کی	روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں	غالب

یہ جسم زار روح کو کیونکر وبال ہو	دوشِ ہوا پہ نگہت گل کچھ گراں نہیں	مصحفی
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب	سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں	غالب

حیراں سا کھڑا ہے اسے ہو گیا ہے کیا	آئینہ کس کے حسن کا آئینہ دار ہے	مصحفی
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی	اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے	غالب

حیراں ہوں اسقدر کہ شب وصل بھی مجھے	تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے	مصحفی
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا	آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے	غالب

کیا جانئے اکسیر ہے عنقا ہے یہ کیا ہے	ملتی نہیں جو چیز زمانے میں وفا ہے	مصحفی
مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت	دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے	غالب

پیار آیا مگر
بے اختیار آیا

نونہال
ایک ہنستا کھیلتا چاق چوبند اور چلبلا بچہ پل بھر میں ہر ایک کی
توجہ اور پیار کا مرکز بن جاتا ہے۔ ناقص غذا اور حیاتین کی کمی بچہ سے
شرارت اور ماں سے مسرت چھین لیتی ہے اور بچہ کمھلائے ہوئے پھول
کی طرح نڈھال ہو جاتا ہے۔ مناسب دیکھ بھال صحیح غذا اور ایک اچھے
ٹانک کے انتخاب پر بچہ کی صحت ماں کی مسکراہٹ اور مستقبل کی دولت کا انحصار ہے
اسی لئے
سمجھدار مائیں اپنے بچوں کو نونہال بے بی ٹانک پلاتی ہیں۔
"نونہال بے بی ٹانک میں وہ تمام اجزا پوری طرح موجود ہیں جو بچہ کی جسمانی
نشوونما اور اسکو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

رُباعیات شادؔ عظیم آبادی

(ارشد کاکوی)

اس [illegible] سے اختلاف [illegible] گنجائش ہی نہیں کہ سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء ـ ۱۹۲۷ء) اردو کے چند ممتاز ترین شاعروں [illegible] ایا [illegible] آپ کتنی ہی محدود دو مختصر فہرست بنایئے اس میں شادؔ کی جگہ ضرور رہو گی۔ ان کی شہرت زیادہ تر ان کی غزلوں پر محدود ہے۔ اگر ایک طرف غنائی احساسات کی حامل ہیں تو دوسری طرف ان میں فکر کا علو، خیال کی عظمت، احساس کی گہرائی اور بیان کی [illegible] ہے۔ غالبؔ کی طرح شادؔ کی آنکھیں بھی ان کی گرد و پیش کی زندگی اور اس کی ٹھوس حقیقتوں کے لئے وا تھیں۔ انکی زبان [illegible] فکر، ان کا اسلوب اظہار سبھوں میں ایک بلندی و ارجمندی ہے۔ ان کے دیوان غزلیات کے کئی ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ [illegible] تمام سربرآوردہ نقادوں نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ شادؔ کا رجحان فکر فلسفیانہ اور حکیمانہ ہے۔ لیکن اس کے [illegible] میں شاعرانہ آہنگ ہے۔ شادؔ کی شاعری خشک فلسفہ نہیں اور یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں صرف "حریم ناز" کی باتیں [illegible] وہاں شادؔ کے الفاظ تصویر کشی کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ کاکل و رخسار کا بیان ہے تو اتنا شاداب اور زندہ کہ الفاظ متحرک تصویریں بن جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ رُباعی کی صنف میں بھی شادؔ نے کچھ دل کش و دامنگیر چیزیں ہمیں دی ہیں۔ ابھی حال ہی میں "سرزمش ہستی" کے نام سے شادؔ کے غیر مطبوعہ قطعات بھی شائع ہوئے ہیں جن کا [illegible] کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

رُباعی آسان صنفِ سخن نہیں۔ اس کی اپنی چند مخصوص بحریں ہیں۔ یہ انتہا درجہ کی فن دانی کی متقاضی ہے۔ کوئی مصرع [illegible] ڈھالا نہ [illegible] ڈھلا ڈھلایا ہو اور چوتھے مصرع کر تو جو جان رُباعی ہے خاص طور پر بہت ہی بے ساختہ اور برجستہ ہونا چاہیے [illegible] مواد اور موضوع کا تعلق ہے یہ ہمیشہ عام سطح سے اوپر کی بات ہوتی ہے۔ اس دور کے ایک بڑے بانکے رُباعی گو [illegible] ملیح آبادی کے مندرجہ ذیل سطور سے صنفِ رُباعی کے مطالبات کا اندازہ کیجئے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"رُباعی ایسی زہرہ گداز چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا اور اچھے سے اچھے شاعروں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔ یہ کمبخت [illegible] طبع، شعری ذوق، ذہانت اور تخیل کے بل بوتے پر قابو میں آنے والی چیز ہی نہیں۔ یہ نامراد رباعی تو مطالبہ کرتی ہے [illegible] تجربات، عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات، کا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ظالم اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ شاعر اپنے [illegible] کے عطر کو ایسے نوک پلک کے قلیل الفاظ میں ادا کرے جس سے کثیر معنی اُجاگر ہو جائیں اور جنون شاعرانہ و عقل حکیمانہ کو اس رازسے سمو دیا جائے جس انداز کے ساتھ سنگم میں گنگا اور جمنا کے دھارے ہم آغوش ہوتے ہیں"

واقعہ یہ ہے کہ جنون شاعرانہ اور عقل حکیمانہ کے امتزاج سے جو بادۂ سخن تیار ہو سکتی ہے اس میں دو آتشہ کا کیف ہوتا ہے [illegible] دو آتشہ کے لئے جو ظرف سب سے زیادہ موزوں ہے وہ ظرف رباعی ہے۔

رباعیات شاد میں فکر و احساس کی تندی و سرشاری بھی موجود ہے اور طرزِ ادا کی متانت و پختگی بھی۔
فرماتے ہیں ؎

تنہا ہے چراغ دور پروانے ہیں
اپنے تھے جو کل آج وہ بیگانے ہیں
نیرنگی دنیا کا نہ پوچھو احوال
قصے ہیں، کہانیاں ہیں، افسانے ہیں

اللہ پہ بالطبع بشر مائل ہے
ہر حال میں مطمئن اسی پر دل ہے
مشکل ہے کہ ثابت ہو دلیلوں سے خدا
انکار تو اس سے بھی سوا مشکل ہے

ہے غرق کوئی تصویر باطل میں
بیوجہ ہے کوئی خوش اس آب وگل میں
سرمست مئے خیال سب کو پایا
خالی نہیں ایک بھی بھری محفل میں

رباعیات شاد اور رباعیات خیام کا تقابلی مطالعہ مناسب ہو یا نہ ہو شاد کی رباعیاں خیام کی یاد دلا دیتی ہیں۔ دونوں میں اتفاق و اختلاف کے نمایاں پہلو مل جاتے ہیں۔ دونوں میں زاہدوں کی خود نمائی اور ریا کاری پر گہرا طنز ہے۔ خیام کہتا ہے ؎

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی!
ہر لحظہ بہ دام دیگرے پابستی
گفتا کہ شیخ ہر آنچہ گوئی ہستم
اما تو چنانچہ می نمائی ہستی!

شاد کہتے ہیں :-

واعظ جب تک کہ بر سرِ ممبر ہے
رندوں کی طرف روئے سخن اکثر ہے
انصاف سے اتنا تو بتادے کوئی
کیا کینہ کشی سے مے کشی بدتر ہے

دونوں کے یہاں انسانی آلام اور دنیاوی تفکرات کا دردمندانہ احساس ہے۔ دونوں کے یہاں فرار کی تبلیغ ہے، لیکن دونوں کے یہاں فرق اور بڑا فرق ہے۔ خیام کے یہاں جاں گسل احساسات کو ختم کرنے کے لئے ، مئے اندوہ رُبا ، ملتی ہے ۔ ایک شعری مجموعہ، ایک جام شراب، ایک پارچہ نان اور ایک رُخ زیبا، یہ ہے خیام کا تجویز کردہ علاج ، برخلاف اس کے شاد موت کے تصور کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ آنے والے آخری وقت کے خیال سے باخبر ہی نہیں، اس سے سرشار بھی ہیں۔ انھیں اس لمحہ کا انتظار ہے جو ہماری

مشکلوں اور پریشانیوں کا واحد علاج ہے اور جو ہمارے لئے ابدی راحت کا پیغام ہے۔

غالب:۔ غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ذوق:۔ موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو — غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

خیام اور شاد دونوں کے یہاں اس حقیقت کی نشان دہی ملتی ہے۔

خیام:۔ چندیں غم مال و حسرت دنیا چیست — ہرگز دیدی کسے کہ جاوید بزیست
ایں یک نفسے کہ در تنت عاریتست — با عاریتے عاریتے باید زیست

شاد:۔ دریائے وجود سے گزرنا ہے ہمیں — ایک روز اسی گھاٹ اترنا ہے ہمیں
اے شاد کسی سے بل کی لیں ہم کیونکر — سیدھی تو یہ بات ہے کہ مرنا ہے ہمیں

یہ موت ہی کا تصور ہے جو زندگی کے آڑے ترچھے خطوط سے گریز کی تلقین کرتا ہے۔ موت کو بھولنا زندگی کو بھولنا ہے۔
اس نقطہ پر دونوں متفق ہیں لیکن یہاں سے دونوں کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں اور دونوں متوازی خطوط پر چل نکلتے ہیں جو کبھی نہیں ملتے۔ خیام عالم گمشدگی اور کیفیت ربودگی کی وکالت کرتا ہے اور شاد کامل ہوش و حواس اور خبر و نظر کے ساتھ راہ حیات طے کرنے کے مدعی ہیں۔ شاد بخت خفتہ سے "خواب خوش بھی نہیں چاہتے کیونکہ اس قرض کو کبھی نہ کبھی ادا کرنا ہوگا"[1]

گزرے ہوئے کل کا افسوس اور آنے والے کل کا ہراس خیام کے مسلک میں گناہ ہے ؎

از نامدہ باز ز دمکن چہرۂ خویش — در آمدہ ہا آب مکن زہرۂ خویش
بردار ز دنیائے دنی بہرۂ خویش — زاں پیش کہ دہر برکشد دہرۂ خویش

لیکن شاد عظیم آبادی کو ابدی اور ازلی ملاقات کی ساعت کا انتظار ہے جب یہ قطرہ اپنے سمندر میں جذب ہو جائے گا، اور روح کا گہرا اضطراب ختم ؎

راضی ہے کوئی نگار بے پروا سے — خوش ہے کوئی ہجر کے غم و ایذا سے
مجھ پر تو ہے احسان اجل کا میری — قطرے کو ملا دیا ہے کس دریا سے

مٹنے کی دعا حق سے کئے جاتے ہیں — کس شوق سے زہر غم پئے جاتے ہیں
کیونکر کٹتی ہے کچھ نہ پوچھو اس کو — مرنے کی امید میں جئے جاتے ہیں

خیام کا "امروز" فردا کو بھول کر سوجانا چاہتا ہے اور شاد کا "امروز" فردا کی یاد میں جاگنے کا خواہاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بادہ ریز فضا کے باوجود خیام کی رباعیاں بہت ہی مایوس، قنوطی، اور دل گرفتہ شخصیت کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ خیام کی تمام سرشاری بس ایک خود فریبی ہے یا اسے ایک انتقام سمجھئے۔ جس میں غریب شاعر جبری مسرت اور سرشاری کے سہارے خود کو بہلا رہا ہے شاد کو ہر لمحہ دیدار حسن ازل کی تمنا ہے اور اسی تمنا کی تکمیل کے یقین نے ان کے دل کو رجائیت کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے ؎

کیا خوف ہے دنیا سے گزر جانے میں — کیوں ڈرتے ہو شاد اپنے گھر جانے میں
کچھ خیر تو ہے زندگی میں راحت کیسی — راحت تو ہے میری جان مر جانے میں

---

[1] غالب کا ایک شعر ہے ؎
لوں وام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

جب تک ہے یہ جسم اک گرفتاری ہے — جب روح جدا ہوئی سبک باری ہے
جینا کہتے ہیں جس کو ہے خوابِ گراں — مرنا کیا شے ہے؟ عین بیداری ہے

کوہِ الم و غم سے دبا جاتا ہوں — ناحق لبِ گور رواں رہا جاتا ہوں
اس تن کے شکنجے سے نکل جلد اے روح — تو کرتی ہے دیر میں گھٹا جاتا ہوں

اور اس ساعت کا تصور کتنا دلکش اور کس قدر روشن ہے ؎

ممبر پہ ہوں رتبۂ دوبالا دیکھو — فردوس کا ہاتھوں میں قبالا دیکھو
روشن ہے کہ میری شبِ عمر آخر ہے — بجھتی ہوئی شمع کا اُجالا دیکھو

موت کے تصور کو اتنے رجائی انداز میں پیش کرنا کہ یہ بجھتی ہوئی شمع کا اُجالا ہے قابلِ داد ہے ؎

یہ دل تو ازل ہی سے ترا شیدا ہے — دیدار کی حسرت میں مٹا جاتا ہے
پردہ تو ان آنکھوں ہی تلک ہے محدود — آنکھیں ہوئیں جب بند تو پردہ کیا ہے

شاد نے اس خیال کو اپنی غزل کے ایک شعر میں بھی بیان کیا ہے ؎

شاد اہلِ شک یونہی شک میں پڑے رہ جائیں گے
ہم انھیں آنکھوں سے اک دن دیکھ لیں گے روئے دوست

رباعیاتِ شاد میں غمِ ذات اور غمِ حیات دونوں ہیں۔ لیکن اس غم کے پس پردہ صالح صحت مند عقائد کا اظہار بھی ہے۔ گھٹن اور اضمحلال کی فضا نہیں ہے۔ زندگی شاد کی نظر میں "جبر" تو ہے لیکن یہ جبر وہ جبر نہیں جو زندگی میں جاہ و مال کے عدم حصول اور اپنی ناکامیوں اور شکست خوردگیوں کے احساس سے پیدا ہوتا ہے بلکہ اس جبر کی نوعیت یہ ہے کہ قطرے کو وصال بحر میں جو دیر ہو رہی ہے اور عشقِ بے تاب کو حسنِ ازل کے دیدار میں جو رنج انتظار کھینچنا پڑ رہا ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ شاد زندگی کو "دونوں کے لیئے مفت بدنام" ہونے کی جگہ سمجھتے ہیں۔ یہ زندگی تو ایک راستہ ہے اور ہر رہرو کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ جلد سے جلد منزل سامنے آجائے اور گوہرِ مقصود مل جائے۔ کہتے ہیں اور کس چاؤ سے کہتے ہیں ؎

اربابِ قیود تجھ کو کیا دیکھیں گے — خواہانِ نمود تجھ کو کیا دیکھیں گے
رویت کے لئے شرط ہے میدانِ فنا — پابندِ وجود تجھ کو کیا دیکھیں گے

شاد کے یہاں زندگی کا تصور "قنوطی" ہے اور موت کا تخیل "رجائی"۔ ایک فارسی شاعرہ نے اجل کو نگارِ زیبا سے تشبیہ دی ہے جو سیاہ برقعے میں ملفوف ہے۔ اگر ہم اس "حسنِ مستور" کو دیکھ لیں تو بے اختیار اُدھر کھنچ جائیں ؎

اجل ہے کیا اک نگارِ زیبا سیاہ برقعے میں منھ چھپائے
ڈرے کبھی موت سے نہ انسان جو حسنِ مستور دیکھ پائے

(ترجمہ عندلیب شادانی)

شاد کے یہاں موت کی حیثیت اسی حسنِ مستور کی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر مقامات پر اپنی غزلوں میں بھی موت کی تمنا کو معراج حیات سمجھتے ہیں ؎

اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو
خضر کیا ہم تو اس جینے میں بازی سب سے جیتے ہیں دل اب اُکتا گیا اللہ اکبر کب سے جیتے ہیں

خیام فلسفہ جبر کا قائل ہے ؎

از رفتہ قلم ہیچ دگر گوں نہ شود وز خوردنِ غم بجز جگر خوں نہ شود
گر در ہمہ عمر خویش خوں نابہ خوری یک قطرہ ازاں کہ ہست افزوں نہ شود

شاد فلسفۂ اختیار پر ایمان رکھتے ہیں ؎

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے
قانون میں فطرت کے نہیں جبر روا سب کچھ ترے اختیار میں رکھا ہے

خیام کی للکار یہ ہے ؎

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما کاے رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

شاد کا درس یہ ہے ؎

جس بات کا ڈر تھا وہ شتاب آپہونچا ہنگام رحیل و پاتراب آپہونچا
جاگو جاگو کہ حشر تک سونا ہے چونکو چونکو کہ وقتِ خواب آپہونچا

اب بحرِ فکر کے دو چار گہر ہائے صداقت کی آب و تاب دیکھئے اور ان سے شاد کی رفعتِ قلب و نظر کا اندازہ کیجئے ؎

مسلک جو الگ الگ نظر آتے ہیں یہ دیکھ کے راہگیر گھبراتے ہیں
رستے کا فقط پھیر ہے رہرو آخر منزل پہ پہونچتے ہیں تو مل جاتے ہیں

مذکور زباں پہ صبح و شام اس کا ہے منقوش ہر اک دل پہ کلام اس کا ہے
جینے کے زمانے میں تو سب جیتے ہیں جو مر کے جئے جہاں میں نام اُس کا ہے

اب دو رباعیاں ایسی ملاحظہ کیجئے جن میں ذاتی غم و حرماں کا اظہار ہے۔ لب و لہجہ کی تپک اور سوز و گداز سے ایک ایک مصرع معمور ہے ؎

دل وضع جہاں سے سخت آزردہ ہے آفت میں پھنسا ہوا ہے افسردہ ہے
اس باغ میں پھول اک یہی تھا وہ بھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ پژمردہ ہے

طینت میں بدی نہ کھوٹ ہم رکھتے ہیں پردہ ہے نہ کوئی اوٹ ہم رکھتے ہیں
سونا کیسا ؟ کراہتے ہیں شب بھر پہلو میں غضب کی چوٹ ہم رکھتے ہیں

شاد کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اسی مفہوم کو اس رُباعی میں بھی ادا کیا ہے ؎

وہ سوچ لے ہر طرح سے جو بزم میں آئے ایسا نہ ہو ایں وآں میں یونہی رہ جائے
ساقی نے تو بھر کے رکھ دیا ہے اسکو کیا ساغر ہے اسی مست کا جو ہاتھ بڑھائے

مزید ایک رُباعی کے ساتھ اس ذکر کو ختم کرتے ہوئے مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ شاد کی رُباعیاں بہ اعتبار فن جس قدر بے عیب ہیں بحیثیت مواد و متن بھی ان میں اعجاز بیمبرانہ اور رفعتِ حکیمانہ پائی جاتی ہے ؎

کیوں زیست سے نفرت ہمیں ہر دم نہ رہے
دل جن سے قوی تھا اب وہ ہمدم نہ رہے
ہنستے بھی ہیں شاد بول بھی لیتے ہیں
ہم ہیں تو وہی شاد پر وہ ہم نہ رہے

غالب کے اُردو قصاید

(ملک محمد اسماعیل خاں)

غالب نے صرف غزل ہی نہیں بلکہ دوسرے اصنافِ شعر مثنوی، قصیدہ، رُباعی، قطعہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور سب میں جدت و ندرت سے کام لیا ہے۔ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ :۔ " یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس حد تک شاعری کا تعلق ہے (محض غزلگوئی کا نہیں) غالب بڑا انقلابی شاعر تھا اور اُس نے اسلوبِ شاعری بدلنے کے لئے اظہار بیان کے ایسے نئے نئے زاوئے پیدا کئے جن کی تازگی آج بھی بدستور قایم ہے "

غالب قدرت کی طرف سے بڑا غیر معمولی دماغ لے کر آئے تھے اور روشِ عام پر چلنا ننگ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اُردو نثر، غزل، قصیدہ جس چیز کو لیا اُس میں بدیع الخیالی اور قادر الکلامی کا نقش چھوڑ گئے۔

غالب نے دو قصیدے ۲۵ سال کی عمر سے قبل اپنی شاعری کے پہلے دور میں لکھے، جو منقبت میں ہیں۔

ع ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار

ع دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

اکرام نے ان کے کلام کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، اُن کے مطابق دور اول ۱۸۰۶ء سے شروع ہو کر ۱۸۲۱ء پر ختم ہوتا ہے یہ قصاید اُن کے ابتدائی زمانے کی مشق ہیں جو تقلید بیدل و اسیر کا دور تھا اس لئے ان میں وہ اغلاق و اشکال موجود ہے، اسکے بعد انھوں نے اُردو میں قصیدہ نگاری ترک کر دی، اس کی ایک تاریخی وجہ بھی ہے وہ یہ کہ غالب جب میدانِ قصیدہ گوئی میں اُترے تو ذوق کی حیثیت مسلّم ہو چکی تھی، اس لئے غالب نے اس میدان کو ترک کر دیا اور ذوق کی وفات تک اُردو میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ذوق کے انتقال ۱۸۵۴ء کے بعد وہ "استادِ شہ" مقرر ہوتے ہیں، اس عہد میں غالب نے دو قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھے جو ان مصرعوں سے شروع ہوتے ہیں :۔

ع ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام،

ع صبحدم دروازۂ خاور کھلا

اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایت فارسی شاعری کے زیر اثر قایم ہوئی، اور قصیدہ کے جو اصول فارسی قصاید میں برتے جاتے تھے وہی بجنسہ اُردو میں منتقل ہوئے، چنانچہ غالب کے پیشروؤں اور معاصروں مثلاً سودا، انشا، ذوق، یہاں تک کہ مومن نے بھی قصیدے میں روایتی اسلوب، روایتی انداز اور مقررشدہ اصولوں سے سرمو انحراف و اختلاف نہیں کیا، قصیدے کے رسمی محاسن کچھ اس طرح ذہن پر جم گئے تھے کہ کسی نئی راہ کی طرف خیال بھی نہ جاتا تھا، لیکن غالب کی طبیعت میں جالی کے

بقول ایک غیر معمولی اُپج تھی اور وہ پامال شدہ عام راہوں سے الگ چلنا چاہتے تھے، اس لئے اُنھوں نے غزل کی طرح قصیدے میں بھی بت شکنی کا مظاہرہ کیا، اور اپنے لئے ایک الگ راہ پیدا کی۔

غالب نے اپنے قصاید میں شعریت کا خون قصیدہ نگاری کی خاطر نہیں کیا۔ غالب کے قصاید چونکہ عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں اس لئے انھیں نہیں سراہا گیا اور نہ اُن پر خاطر خواہ توجہ دی گئی۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہاں قصیدہ کے رسمی محاسن نہ سہی، شاعری کے محاسن تو ہیں، جن سے عموماً قصیدے خالی ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا مقصود ہے کہ غالب کے قصاید کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں اور اُن میں وہ کون سے محاسن ہیں جن کی وجہ سے اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا! —— پہلے اُن کے ابتدائی دور کے قصیدوں کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اُن میں کیا خصوصیات ملتی ہیں؟۔

یہ دونوں قصیدے حضرت علیؑ کی شان میں ہیں۔ ان قصیدوں میں اگر غالب کی مذہبی شیفتگی اور ندرت پسند طبیعت کو دخل نہ ہوتا تو وہ ذوق کے قصیدوں کی صف میں آ جاتے۔ غالب نے اپنے مذہبی جذبہ اور اپنے پاکیزہ ذوقِ شعری کی بنا پر اُن میں بھی تازگی پیدا کر دی ہے۔ غالب نے اُسی قدر قافئے استعمال کئے جس حد تک ضروری تھے۔ برخلاف اس کے ذوق کے یہاں قافیہ پیمائی قصیدہ کے بندھے ٹکے سانچے کے لحاظ سے تھی۔ غالب کے ان قصیدوں میں ٹکنیک کی کوئی جدت نہیں ملتی۔ صرف تخیل کی بلندی اور الفاظ کی شوکت نظر آتی ہے، البتہ ان میں ایک والہانہ انداز ضرور ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن میں خلوص اور جوشِ عقیدت بدرجۂ اتم موجود ہے، خصوصاً دوسرے قصیدے میں منقبت کا انداز بڑا والہانہ ہے جس سے اُن کے مذہبی جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

پہلے قصیدہ کی تشبیب بہاریہ ہے۔ جہاں تک تخیل کا تعلق ہے اس میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ معنی آفرینی پر نظر، خیالات کا اشکال، اسلوب کا تکلف اور تراکیب کی اجنبیت زیادہ ہے جو تقلیدِ بیدل و اسیر کا فیضان ہے۔ تشبیب میں بہار کا سا لیکن خوبی یہ ہے کہ پامال اور فرسودہ خیالات کا پتہ نہیں۔

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ — ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ — تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت — کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل — راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم — سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار
کف ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز — دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی — بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

قصیدے کی روح گریز ہے جو تشبیب اور مدح کو ملاتی ہے۔ تشبیب اور مدح دونوں کے مضامین بالکل مختلف ہوتے ہیں شاعر کا کمال اسی میں ہے کہ وہ دونوں میں ایسا ربط پیدا کر دے کہ سامع تشبیب کے بعد فوراً مدحیہ اشعار کے سننے کا مشتاق ہو جائے اور بلا تصدیات میں بات پیدا ہو جائے۔ آورد معلوم نہ ہو بلکہ بدیع اور بے ساختہ ہو۔ غالب نے تشبیب سے

ممدوح کے ذکر کی طرف نہایت پُر لطف طریقہ سے گریز کیا ہے مثلاً :۔

لعل سے کی ہے زمزمۂ مدحتِ شاہ　　طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

اب مدح ملاحظہ ہو کس عقیدت اور جوش و خروش سے کی ہے اور یہی اس قصیدہ کا خاص وصف ہے ؎

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا　　چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور　　رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام　　رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ وقار

ذرہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز　　گرد اُس دشت کی امید کو احرامِ بہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی　　جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

دوسرا قصیدہ بھی منقبت میں ہے۔ اس کی تشبیب فکریہ ہے جس میں وحدت کا اثبات کرتے ہوئے کثرت کی نفی کی ہے اور دنیا اور علایقِ دُنیا سے بیزاری کا اظہار کیا ہے، پھر متنبہ ہو کر کہتے ہیں ؎

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ　　یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر　　یاعلی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

اس کے بعد حضرت علی کی مدح شروع ہوتی ہے یہ پہلے قصیدہ کی مدح سے زیادہ جوش، شیفتگی اور عقیدت کے ساتھ کی گئی ہے، دوسرے اس قصیدہ کا اندازِ بیان بھی پہلے کی بہ نسبت صاف ہے اور خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے ؎

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ　　وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

غالب کا یہ مخصوص "بیدلی رنگ" جس میں جذبے سے زیادہ تخیل کی کشیدہ کاری ہوتی تھی وہ یہاں مقبول نہ ہوا، لوگوں نے اُن کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ بعض طنز نگاروں نے یہاں تک کہ دیا کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

شروع شروع میں غالب اس قسم کی تنقید پر بہت جھنجھلائے اور اپنی انانیت پر قایم رہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ جاہل[1]

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل،

لیکن یہ نکتہ چینی غالب کے حق میں مفید ثابت ہوئی، جدت طرازی اور بیدل کی پیروی میں وہ کچھ عرصہ دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتے رہے مگر اُن کے ذوقِ سلیم نے زیادہ بھٹکنے نہ دیا اور بالآخر وہ جلد ہی "صراطِ مستقیم" پر آگئے، چنانچہ خود لکھتے ہیں :۔ "میں ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل، شوکت اور اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یکقلم

[1] بعد میں "سخنورانِ کامل" کر دیا تھا۔ (اسمٰعیل)

چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوانِ حال میں رہنے دئے۔" غالب، بیدل کے چکر سے نکلنے کے باوجود بیدل کی رمزیت کو نہ چھوڑ سکے، انھوں نے ایسی لغو مزنگافیوں اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا، یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوبِ بیان کا لازمی نتیجہ تھا ـــــ لیکن غالب نے قصیدہ کی ٹکنیک میں جو جدت پیدا کی اور اُس کے طرز کو بدلا وہ وہی قصیدے ہیں جو بہادر شاہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں، ان میں انھوں نے قصیدہ کے روایتی آہنگ اور اُس کی فرہنگ سے انحراف کرکے آسان اور عام فہم انداز اختیار کیا ہے۔ یہ قصیدہ اگرچہ ایشیائی قصیدہ گوئی کے تمام رسمی محاسن سے خالی ہے، لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تشبیب نے اُردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور خود نقادانِ فن اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ صاحب شعر الہند نے لکھا ہے: "غالب نے بعض قصاید ایسے لکھے ہیں جو اُردو شاعری کا سرمایۂ ناز ہیں۔" مولانا نظم طباطبائی شارح دیوانِ غالب اس قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ قصیدہ خصوصاً اُس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنف مرحوم کے کمال کا اور زیور ہے اُردو شاعری کے لئے۔ اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب شاید ہی کہی گئی ہو۔" تشبیب کی ندرت، انداز کی شوخی اور گریز کی بے ساختگی جو یقیناً شبابِ فن کی غماز ہیں، قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، کچھ شعر اس موقع پر پیش کئے جاتے ہیں ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روز بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریبِ عید ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

تشبیب خاصی طویل ہے جس میں چاند کا بادشاہ کے حضور میں باریابی کا ذکر کیا ہے۔ اس موقع پر کلیم الدین احمد کا

ایک اقتباس پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں :۔ " یہاں غالب نے بالکل نیا راستہ نکالا ہے، جو قصیدہ کے رسمی محاسن ہیں اُن کا یہاں نام و نشان نہیں، زبان میں سلاست، روانی، متانت ہے، لیکن وہ شان و شوکت نہیں وہ طمطراق نہیں، وہ بلند آہنگی نہیں جسے قصیدہ کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً سودا کے ایک قصیدہ کی تشبیب اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل تیغِ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

ایک طرف یہ رنگ اور عموماً یہی رنگ پھیلا ہے اور دوسری جانب یہ سادگی ہے کہ ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام، جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یہاں فضا دوسری ہے، نئی ہے، فطری ہے، اور اسی وجہ سے اُس میں ایک تازگی ہے۔ ایک ڈرامائی شان ہے جو مشکل سے کہیں ملتی ہے۔ کہیں لہجہ بول چال کا ہے۔ ؎

بارے دو دن کہاں رہا غائب

الفاظ کی ترتیب، لب و لہجہ کی فطری بے ساختگی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی باتیں کر رہا ہے اور پھر مکالمہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے

" بندہ عاجز ہے گردشِ ایام "

یہ تو چند مثالیں تھیں دوسرے تمام شعروں میں اسی طرح کا تغیر و تبدل، مد و جزر رہتا ہے جس سے کافی لطیف پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے " اسی مکالماتی اور ڈرامائی انداز سے قصیدہ آگے بڑھتا ہے، کچھ شعر اور دیکھئے ؎

میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟
جبکہ چودہ منازلِ فلکی، کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام،
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام

اس کے بعد ایک غزل لکھی ہے، پھر گریز کیا ہے، اگرچہ ممدوح کا ذکر تشبیب سے ظاہر ہو گیا تھا لیکن باقاعدہ گریز یہیں سے شروع ہوتا ہے ؎

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہرِ ذوالجلال والاکرام

اس کے بعد مدح کے اشعار شروع ہوتے ہیں، غالب کے مدحیہ اشعار میں باوجود مبالغہ کے ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے، اُن کا مدح کا طریقہ دوسرے قصیدہ گو شعرا سے مختلف ہے۔ مثلاً سودا وغیرہ نہایت مبالغہ آمیز بلکہ ذلت انگیز طریقہ پر ممدوح کے تمام ساز و سامان یہاں تک کہ باورچی خانہ تک کا ذکر کرتے ہیں اور اُن کو سوال کرنے میں مطلق شرم نہیں آتی، چنانچہ سودا ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

اسداللہ ترے مطبخ کا تجمل جس کا　طبق روئے زمیں سے ہے بڑا خوانِ چنگ
چرخ و کہسار کو مصرف سے ہے دہشت آنکے　آپ کو پاکے مشابہ بہ پیازو ادرک
اسکے مصرف کے جو دیہات ہیں بس اُن میں سے　اپنے مداح کو بھی کر دے مقرر سمنگ

سوداکے یہاں قریب قریب ہر قصیدہ کے اختتام میں " دستِ سوال " دراز کیا گیا ہے اور اس عاجزی او بیچارگی کے ساتھ کہ جو غالب کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا مثلاً ؎

کرے ہے ختم دعائیہ پر اب سخن سودا　ادب سے دور ہے خدمت میں تیری طول کلام
عوض میں اسکے صلے کے کروں میں تجھ سے عرض　قبول ہو جو مرا حرف اے ذوالاکرام
مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جا گہ　کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

لیکن غالب جیسے انانیت پسند اور خود پرست شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ غالب مغل تھے بلکہ مغلوں کے ایک اعلیٰ اور بلند مرتبہ خاندان سے اُن کا سلسلہ ملتا تھا، اُن کے آبا و اجداد ہندوستان آنے سے قبل اور ہندوستان آنے کے بعد بھی ایک زمانے تک بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، اگرچہ خود غالب کی زندگی ایسی امیرانہ شان سے نہ گزر سکی جیسی کہ اُن کے آباؤ اجداد گزار چکے تھے، لیکن اس کے باوجود خاندانی امیرانہ خصوصیات اُن کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ کئی جگہ انھوں نے اپنے عالی نژاد ہونے پر فخر کیا ہے ؎

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم　رہ جرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی　بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک　در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فنِ آبائے ماکشاورزی ست　مرزبان زادۂ سمرقندیم

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
میں کون؟ اور ریختہ! ہاں اس سے مدعا　جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
ما نبودیم بریں مرتبہ راضی غالب　شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اسی بڑائی کے احساس نے اُن کے اندر انانیت کی خصوصیت پیدا کر دی تھی، وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے یہ انانیت قصیدہ میں بھی رنگ لاتی ہے۔ اگرچہ اُن کے آبا کی تلوار غالب کے ہاتھ میں آتے آتے ٹوٹ کر قلم ہو گئی تھی اور سپہ گری کا پیشہ مڑ کر " شاعری " کے فن سے بدل گیا، اور اقتصادی حالات نے " قصیدہ نگاری " پر بھی مجبور کیا، تاہم " مدح " کے علاوہ قصیدوں میں بالکل " مانگنے والے " معلوم نہیں ہوتے۔ غالب کے قصاید کے اختتامیہ اشعار سودا، ذوق وغیرہ کی طرح " کاسۂ سایل " معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے متعلق وہ خود اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں :۔ " کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح لکھنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے " اوپر سودا کے مدحیہ اشعار کی مثالیں پیش کی گئیں ہیں اب دیکھئے کہ غالب مدح کس طرح کرتے ہیں، گو مبالغہ اُس میں موجود ہے لیکن اُن کی نوعیت اور

"انداز" ملاحظہ فرمائیے ؎

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیٔ الہام
اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

دوسرے قصیدہ کی مدح بھی کچھ اسی قسم کی ہے، اشعار کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے اور مثالیں بھی انہی حضرات سے دی گئی ہیں۔ پہلے قصیدہ کے خاتمہ کا بھی ایک دلچسپ، حکیمانہ اور نیا طریقہ پیش کیا ہے جو شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے کچھ شعر ملاحظہ ہوں ؎

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے نہ احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش — لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں، — گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں — خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضع سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز — ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم — اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روانیٔ آغاز — ہو ابد تک رسائیٔ انجام

دوسرے قصیدہ میں بھی مدح کے صرف آٹھ شعر ہیں باقی اشعار میں گھوڑے وغیرہ کی تعریف ہے اس کے بعد خاتمہ ہو جاتا ہے ؎

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

اس شعر کو پھر ملاحظہ کیجئے جس میں انھوں نے اپنے ستائش نہ کر سکنے کی وضاحت، یا "اعترافِ عجز" کیا ہے ؎

فکر اچھی پر ستائش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

غالبؔ نے معنوی حسن کے ساتھ نقوشِ ظاہری کی اختراع میں بھی اپنی توجہات صرف کی ہیں۔ اُن کے ہاں جو تازہ

دشگفتہ تشبیہوں، استعاروں اور ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے اس میں در اصل یہی انفرادی اپج کی کوشش کارفرما ہے۔ اُن کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے تھے اس لئے اُنھیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی نادر اور منفرد تشبیہیں، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اُن کی تشبیہات سے اُن کے تجربہ کی وسعت اور اُن کی باریک بینی کا پتہ چلتا ہے اُن کی ترکیبیں بعض وقت ایسے وسیع خیال کا چند لفظوں میں احاطہ کرلیتی ہیں جو بیان کیا جائے تو کئی سطروں میں ادا نہ ہو۔ کچھ تشبیہیں ملاحظہ ہوں ۔

؎ کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز   دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

بوجہ رنگ کے قمری کو کفِ خاکستر اور بوجہ مشبک ہونے کے کاغذ آتش زدہ کو "دامِ طاؤس" کہا ہے۔

؎ موجِ گل ڈھونڈھ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ   گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

پگڑی جب تک بندھی ہے بصورتِ غنچہ ہے اور جب کھل کر گر گئی تو گویا وہ گل ہوگئی۔

؎ شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز   ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

آئینہ خانہ کی مور سے کتنی عمدہ تشبیہ ہے ۔ کچھ تشبیہیں اور ملاحظہ فرمائیے :۔

؎ تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں   تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

؎ تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں   سلکِ اختر میں مہ نو مژہ گوہر بار

؎ ہاں مہ نو سنیں ہم اُس کا نام،   جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

؎ میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش   غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام

؎ خسروِ انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

؎ سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو   موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

؎ صبح آیا جانبِ مشرق نظر   اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

؎ لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے   رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

؎ نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب   تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

غرض کہ غالبؔ کے قصاید شعری محاسن سے معمور ہیں، اور قصاید نویسی کی جو عام روایت قایم ہوگئی تھی، اُس سے بڑی حد تک الگ اور اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے اِن کے قصاید غزل سے بہت کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔ اُنکے قصاید دوسروں کے قصیدوں کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے بلکہ اُن میں استعاروں اور رمز و ایما کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ دورِ اول کے قصاید میں اشکال، دقت آفرینی اور بے لگام قوتِ متخیلہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن بعد کے دونوں قصیدے مکالماتی اور عام فہم اندازِ بیان اور سلاست کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان صاف اور روزمرہ دلچسپ ہے۔ غالبؔ نے اُردو قصیدہ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور صنفِ قصیدہ نگاری کو ایک نئی راہ دکھائی، اُنھیں نظرانداز کرنا ہمارے لئے غیر ممکن اور اُن کی صرف تاریخی اہمیت کا قایل ہونا ہماری ذوقی بصارت اور تنقیدی بصیرت کے نہ ہونے کی دلیل قرار پائے گی۔

باب الاستفسار

(۱)

کیا حضرت عثمان پر اقربا نوازی کا الزام صحیح ہے؟

(جناب سید جلال الدین عزمی۔ مبارکپور)

حضرت عثمان کی عہد خلافت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے گورنروں کے تقرر میں اقربا نوازی سے کام لیا۔ ان کے خلاف جو شکایات کی گئیں ان کو ٹال دیا گیا اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں دولت و امارت کی خو بو پیدا ہو گئی اور ایک مخالف جماعت نے اس کے خلاف احتجاج کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ شیرازۂ اسلام بکھر گیا اور مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ختم ہو گئی۔

اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ حضرات شیعہ نے بہت زور دیا ہے اور وہ حضرت عثمان کے دور خلافت کو انتہائی دور ناکامی قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(نگار) اس میں شک نہیں کہ بعض مورخین نے جن میں عنصر غالب شیعی حضرات کا ہے۔ حضرت عثمان پر وہی الزام قائم کیا ہے جس کا ذکر آپ نے کیا۔ لیکن یہ اعتراض جس نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ وہ میرے نزدیک درست نہیں۔ معترضین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اعزہ کو گورنری کی خدمت پر محض اس لئے مامور کیا کہ وہ ان کے عزیز تھے اور ان کی عدم اہلیت کو قصداً نظر انداز کر دیا۔ لیکن حضرت عثمان کا کردار ہم کو اس الزام سے بالکل پاک نظر آتا ہے اور یہ اتہام روایتاً و درایتاً دونوں حیثیتوں سے نادرست ہے۔

سب سے پہلے آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت عثمان کی سیرت کیا تھی اور خلیفہ ہونے سے قبل وہ کس اخلاق کے انسان سمجھے جاتے تھے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام لانے سے قبل بھی آپ اپنے بلندیٔ اخلاق کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے اور اسلام لانے کے بعد تو آپ نے جس قدر ایثار و قربانی سے کام لیا اور جتنے مصائب رفاقت رسول کی وجہ سے جھیلے وہ تاریخ کے ایسے مستند واقعات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

رسول اللہ کو آپ سے جو دلی تعلق تھا اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب جناب رقیہ کے بعد جناب ام کلثوم کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔ "اگر میری کوئی اور لڑکی ہوتی تو اسے بھی عثمان سے بیاہ دیتا"

بہرحال وہ شخص جو عشرۂ مبشرہ میں شامل ہو، جس نے اسلام کی خدمت کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دیا ہو اور جس نے کبھی سرمو تعلیم اسلام سے انحراف نہ کیا ہو، جس سے رسول اللہ کو شدید وابستگی ہو اس کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ بڑھاپے میں اس کے اخلاق کی کایا پلٹ گئی اور خلیفہ ہونے کے بعد اس نے قصداً کوئی ایسا قدم اٹھایا جو تعلیم اسلام کے منافی اور خود غرضی پر مبنی تھا۔ بالکل خلاف عقل ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اپنے اعزہ کو گورنری کی خدمت پر مامور کرنا ان کی اجتہادی غلطی تھی (حالانکہ نہیں تھی جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے) لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے قصداً ایسا کیا اور محض اس لئے کہ ان کے اعزہ اس سے فائدہ اٹھائیں ازروئے روایت قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اب آپ واقعات تاریخی کو پورا ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کی تقرری گورنران کے باب میں جانب دارانہ نہ تھی بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے بالکل درست تھی، اس وقت چار صوبے بڑے اہم سمجھے جاتے تھے۔ بصرہ، کوفہ، مصر اور شام۔ شام میں امیر معاویہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے سے گورنر چلے آرہے تھے۔ حضرت عثمان نے ان کا تقرر نہیں کیا تھا۔ کوفہ میں بے شک سعد (فاتح فارس) کی جگہ ولید بن عقبہ کو گورنر بنا یا گیا جو ماں کی طرف سے حضرت عثمان کے رشتہ دار تھے لیکن یہ واقعہ ۲۵ھ کا ہے جو آپ کی خلافت کا دوسرا سال تھا اور تمام مورخ اس امر پر متفق کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت کے ابتدائی چھ سال بڑے اچھے گزرے اور کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے ولید کی گورنری بھی کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ بلکہ ان کے کارناموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس خدمت کے لئے یقیناً بہت موزوں تھے۔

بصرہ میں، ابوموسیٰ اشعری حضرت عمرؓ ہی کے زمانے سے خلیفہ چلے آرہے تھے لیکن جب ۲۹ھ میں ان کے خلاف یہ شکایت ہوئی کہ وہ قریش کی بیجا طرفداری کرتے ہیں تو ان کی جگہ عبداللہ ابن عامر کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ بیشک حضرت عثمان کے عزیز تھے۔ لیکن ان کی رائے کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت عثمان نے ان کا تقرر اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ ان کے عزیز تھے بلکہ محض اس بنا پر کہ وہ اس خدمت لئے بہت موزوں شخص تھے۔

اسی طرح مصر میں عمرو بن عاص کی جگہ عبداللہ ابن سعد کا تقرر بھی حضرت عثمان نے اس لئے نہ کیا تھا کہ وہ ان کے دودھ شریک بھائی بلکہ محض اس لئے کہ وہ بڑے ہوش و گوش کے اولعزم انسان تھے چنانچہ اہل رومہ کی قوت توڑنے اور مملکت اسلامی میں سب سے پہلی مصر پر قوت قائم کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ تاہم ان کی اہم خدمات کے باوجود جب ان کے خلاف شورش پیدا ہوئی تو ان کو علیحدہ کرکے محمد بن سعد گورنر مصر بنا دیا گیا۔

اس جگہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ولید کا تقرر گورنری کوفہ پر ۲۵ھ میں ہوا۔ عبداللہ بن سعد ۲۶ھ میں گورنر مصر بنائے، خلافت عثمانیہ کے دوسرے دور تیسرے سال اور یہ وہ ابتدائی زمانہ چھ سال کا تھا جس کو تمام مورخوں نے ان کے عہد خلافت کا بڑا زمانہ تسلیم کیا ہے۔

پھر اگر حضرت عثمان پر یہ الزام قائم کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بعض اعزہ کو محض رشتہ داری کی بنا پر گورنر بنایا تو حضرت پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی بہت سے عہدوں پر افراد بنی ہاشم کو مامور کیا جو ان کے رشتہ دار تھے۔ بہرحال حضرت پر اقربانوازی کا الزام صحیح نہیں۔ اور اُس عہد کے گورنروں کے کارنامے شاہد ہیں کہ اگر وہ حضرت عثمان کے رشتہ دار نہ ہوتے تو بھی، اہلیت و ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے، اس خدمت کے لئے بہت موزوں تھے۔ تاہم اس سلسلہ میں یہ امر ضرور قابل غور ہے عثمان کے خلاف شورش کیوں پیدا ہوئی۔ اس کے دو سبب بتائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا یہ کہ حضرت عثمان نے وہ پالیسی بدل دی جو عمرؓ نے قائم کی تھی یعنی حضرت عمرؓ نے کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ ممتاز صحابہ مدینہ چھوڑ کر دوسرے صوبوں میں جائیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے باہر جاکر وہ اپنی سادہ زندگی سے بیگانہ ہو جائیں گے اور ان کا رسوخ و اقتدار ممکن ہے کوئی فتنہ برپا کردے اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے لئے ایک ضروری وظیفہ متعین کر دیا تھا اور اس سے زیادہ کسی کو کچھ نہ دیتے تھے۔ لیکن حضرت عثمان نے خلیفہ ہوتے ہی صحابہ سے صرف نقل و حرکت کی پابندی اٹھالی بلکہ بیت المال سے گرانقدر عطیات بھی دینے شروع کئے۔

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بالکل درست ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ پالیسی کہ صحابہ مدینہ چھوڑ کر باہر نہ جائیں۔ کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ اگر اسلام صرف مدینہ یا اس کے قرب و جوار تک محدود رہتا تو اس کا امکان تھا لیکن، وسعت فتوحات کے ساتھ ساتھ صحابہ واکابر عرب کا دور تر علاقوں میں جاکر قیام کرنا، وہاں کی آبادی کی معاشرت سے مانوس ہونا ضروری تھا اور حضرت عمرؓ کی پالیسی الگ تھلگ رہنے کی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے فاروقی عہد کی پالیسی بدلنے میں زیادہ عجلت سے کام لیا۔ کیونکہ انھوں نے نہ صرف یہ کیا کہ اکابر صحابہ کو مدینہ سے باہر دور دراز علاقوں میں رہنے اور پھیل جانے کی اجازت دیدی بلکہ غیر معمولی عطیات دے کر ان کو اس کا موقع بھی دیا کہ وہ صاحب املاک ہوکر امیرانہ زندگی بسر کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد عثمانی میں ایک ارستقراطی جماعت پیدا ہوگئی، جو اسلام کی جمہوری روح کے پیش نظر یقیناً بالکل نئی چیز تھی اور عوام کو اس پر رشک وغبطہ کرنا چاہیئے تھا۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حضرت عثمانؓ کی اس فیاضانہ پالیسی نے HAVE اور HAVE NOT کی دو جماعتیں پیدا کردیں جن میں جلد یا بدیر تصادم ہونا ضروری تھا۔

ہرچند اول اول اس تخالف و تضارب کا کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ نظام حکومت استوار تھا، فارس و روم کی قوتوں کو قریب قریب ختم کیا جاچکا تھا ـــ اسلامی مملکت ایک طرف بلخ و ترکستان تک وسیع ہوگئی تھی اور دوسری طرف ہرات، کابل و غزنی تک سرزمین افریقہ میں بھی رومی قوت کو پامال کرکے مصر پر پورا تسلط قایم ہوچکا تھا، لیکن جس طرح ہر سیلاب کے ساتھ خس و خاشاک کا جمع ہوجانا ضروری ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا سیلاب فتوحات بھی اپنے ساتھ بہت سے خس و خاشاک لے آیا اور یہ یہودیوں آتش پرستوں اور عیسائیوں کی وہ جماعتیں تھیں جن کے اکثر افراد یوں تو بظاہر اسلام قبول کرچکے تھے۔ لیکن اندرونی طور پر وہ بدستور گبر و ترسا ہی تھے پھر اگر حکومت اسلام کوئی آمرانہ مستبد حکومت ہوتی تو ان عناصر کو بہ آسانی فنا کیا جاسکتا تھا لیکن چونکہ اسلام کی جمہوریت میں خلیفہ یا اس کے گورنر کی حیثیت بھی معمولی انسان کی سی تھی اور ہر اس شخص کو جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ پوری آزادی کے ساتھ اخلاق و کردار پر نکتہ چینی کا حق حاصل تھا۔ اس لئے نومسلم یہودیوں اور عیسائیوں نے جو صرف برائے نام مسلمان تھے۔ اس حق آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی نکتہ چینیوں سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی میں تشتت و انتشار پیدا کردیا۔

خیر مدینہ میں تو تخریب کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ ابھی تک وہاں بعض وہ صحابہ بھی موجود تھے جنھوں نے براہ راست ذات نبوی سے اخلاق کی تعلیم پائی تھی ـــــــ مصر، فسطاط، بصرہ و کوفہ میں جو عرب و غیر عرب کی مخلوط آبادی کا مرکز تھے۔ دشمن اسلام عناصر کو پھولنے پھلنے کا موقع زیادہ ملا اور انھوں نے حضرت عثمانؓ پر کھلم کھلا سب و شتم شروع کردیا یہانتک کہ یہ ہنگامہ آخرکار قتل عثمانؓ پر جاکر ختم ہوا۔

اس میں شک نہیں اگر حضرت عثمانؓ۔ عہد فاروقی کی سخت گیر پالیسی پر قائم رہتے یا اس میں تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیلیاں پیدا کرتے تو یہ فتنہ اسقدر جلد رونما نہ ہوتا۔ مگر انھوں نے اپنی فطری فیاضی سے کام لے کر دفعتاً معاشرہ میں بلند و پست، امیر و غریب کا امتیاز پیدا کرکے ملک میں ہیجان پیدا کردیا اور ایک بڑی جماعت ان کی مخالف ہوگئی۔

حضرت عثمانؓ بڑے نیک نیت انسان تھے انھوں نے جو کچھ کیا وہ انتہائی خلوص پر مبنی تھا۔ اور اقربا نوازی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن بربنائے نیک نفسی وہ صحیح اندازہ نہ کرسکے کہ ان کی پالیسی کا عوام پر کیا اثر ہوگا۔ اور یہ تقسیم دولت کا عدم توازن کتنی خطرناک چیز ہے۔

(۲)

فردوسی کا ایک شعر

(جناب علی گوہر۔ اجنبی)

اس سے قبل آپ نے فردوسی کے ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسکے مصرع "نہ اندر نہ آمد، سہ اندر چہار" کا مفہوم کیا ہے ؟

فردوسی کا ایک اور شعر ہے۔

بہ کردار چشم گوزناں دو چشش — ہمہ سحر و شوخی ہمہ رنگ دمش

اس شعر میں چشش سے کیا مراد ہے ؟

(نگار) فردوسی نے چشش، بہ معنی چشم استعمال کیا ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ یہ تبدیلی اس وقت جائز سمجھی جاتی ہو، یا یہ کہ چشم دراصل چش ہی رہا ہو اور مرکب ہو چم (بہ معنی حرکت و خرام) اور ش، نسبتی سے۔ کیونکہ آنکھ اکثر متحرک رہتی ہے۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ مطلق لفظ چم آنکھ کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس صورت میں چشش کا شین (ضمیر غائب) مضاف الیہ ہوگا (یعنی اسکی دونوں آنکھیں)

---

(۳)

بزم و بزمگاہ

(جناب نجابت علی خاں سہارنپور)

یہاں کے ایک کہنہ مشق شاعر کا مصرع ہے۔

کون لے آیا مجھے اس بزمگاہِ حسن میں

حالانکہ بزم میں خود تعیین مکانی پائی جاتی ہے اور اس کے بعد لفظ گاہ کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ اور اسکی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے لیلۃ القدر کو "شب لیلۃ القدر" کہنا۔

کیا آپ کے نزدیک بزمگاہ کہنا درست ہے۔ ؟

(نگار) بالکل درست ہے، کیونکہ فارسی میں نہ صرف بزمگاہ، بلکہ مجلس گاہ اور منزل گاہ بھی مستعمل ہے اور ان سب میں گاہ زائد ہے۔ نظامی کے ایک شعر میں بزمگاہ کا استعمال ملاحظہ ہو۔

جو شاہاں نشستند در بزم شاہ

شد آراستہ حلقۂ بزمگاہ

بات یہ ہے کہ بزم دراصل مرکب ہے بز اور میم نسبتی سے۔ فارسی میں لفظ بز، قاعدہ و آئین کو کہتے ہیں اور میم نسبتی کے الحاق کے

بعد اس کا مفہوم ایک ایسی محفل کا ہوگیا جو قاعدہ و آئین سے آراستہ ہو۔ رہا میم کا حرف نسبت ہونا سو اس کی مثالیں فارسی میں بکثرت ملتی ہیں جیسے نیل سے نیلم۔ بر سے برم (بمعنی حفظ و نگہداشت) بش سے بشم بمعنی شبنم (بش کھیتی کو کہتے ہیں) ۔تار سے تارم بمعنی عمارت بلند (تار سر کو کہتے ہیں) خالم ..... بمعنی مار (سانپ) اس لحاظ سے کہ اس کے جسم پر سیاہ خال ہوتے ہیں۔ رست سے رستم درست بمعنی شجاعت و دلیری) - فارسی میں نسبت کے لئے مَ کی جگہ الف و میم بھی مستعمل ہیں جیسے لگام جو لگ (بمعنی بند و زندان) اور حروف نسبت ام سے مرکب ہے۔چرام (بمعنی چراگاہ) بھی اسی قبیل کا لفظ ہے

فارسی میں جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا نہ صرف بزم گاہ بلکہ مجلس گاہ بھی مستعمل ہے۔ یہاں تک کہ وہ "وقت سحرگاہ" نظم کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ صائب کا مصرع ہے۔ ؎

خواب در وقت سحرگاہ گراں می گزرد

اللہ اکبر ــــــــ یہ کائنات

علم ہیئت یا فلکیات کی قدیم ترین تصنیف بطلیموس (PTOLEMY) کی وہ کتاب ہے جسے حُنین بن اسحاق (۸۱۰ - ۸۷۳) نے یونانی سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اس کتاب کا نام عربی میں المجسطی ہے جس کو انگریزی میں (Almagest) کہتے ہیں۔ حُنین نویں صدی عیسوی کا بہت مشہور عربی نصرانی طبیب تھا۔ جس نے افلاطون۔ ارسطو۔ بقراط اور جالینوس کی متعدد تصانیف کا ترجمہ یونانی سے سریانی اور عربی زبان میں کیا۔

بطلیموس (وفات ۱۶۸ء) ہیئت، تاریخ و جغرافیہ کا بڑا جید عالم تھا اور فلکیات میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور افلاک اس کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ اس نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں ۱۰۲۲ سیاروں کے اوضاع فلکی کی تعیّن کی تھی۔ ہرچند اس کا نظریۂ گردش افلاک اس وقت قابلِ تسلیم نہیں۔ لیکن اب سے تقریباً ۱۸۰۰ سال قبل کسی شخص کا ۱۰۲۲ ستاروں کے متعلق یہ تحقیق کر لینا کہ افلاک یا فضا میں ان کی جائے وقوع کیا ہے کوئی معمولی بات نہ تھی۔

اس کے بعد اس علم نے رفتہ رفتہ کتنی ترقی کی اور قوی دوربینوں کی ایجاد سے فضائے بسیط کے کتنے راز و انکشاف ہوئے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پالومر رصدگاہ میں جو نقشہ یا خریطۂ افلاک اس وقت زیر ترتیب ہے وہ فضا کے اتنے بڑے حصے پر مشتمل ہے جس کو اگر میلوں میں ظاہر کیا جائے تو ہندسہ "۳" کے بعد آپ کو الٹھ صفر بڑھانے پڑیں گے اور اگر روشنی کی رفتار کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جائے (جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے) تو معلوم ہوگا کہ بعض ستاروں کی روشنی ہم تک ۶۰ کروڑ سال میں پہنچی ہے یا پہونچے گی۔

فلکیات کی ریاضی کا تعلق بہ لحاظ وقت و فاصلہ نوری سالوں سے ہے (جس میں روشنی کی رفتار کو اکائی تسلیم کیا گیا ہے) اور گو ہم مشکل ہی سے کسی ایسے فاصلہ یا بُعد کا تصور کر سکتے ہیں جس کی روشنی بھی لاکھوں اور کروڑوں سال میں ہم تک پہنچ سکے لیکن ہیئت جدیدہ کے آلات نے بہت سی سمجھ میں نہ آسکنے والی باتوں کو حقائق میں تبدیل کر دیا ہے اور ہم ان سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہرچند رصدگاہ پالومر کی ایک دوربین جس کا عدسہ (LENS) دو سو انچ قطر کا ہے۔ اتنی قوی دوربین ہے کہ وہ دو ارب نوری سالوں کی فضائے بسیط کا بھی احاطہ کر سکتی ہے۔ باوجود اس کے وہ اتنی چھوٹی ہے کہ آئندہ دس ہزار سال میں بھی نظر آنے والے ستاروں کا نقشہ مرتب کرنے سے قاصر رہے گی۔ تاہم موجودہ آلات کے ذریعہ سے بہت سی ایسی باتیں سامنے آگئی ہیں جو نامعلوم تھیں مثلاً یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارا نظام شمسی، اسی کہکشاں کا ایک حصہ ہے جو ہمیں روز آسمان میں نظر آتی ہے اور جس میں تین ارب ستارے اور بھی شامل ہیں، لیکن زیر ترتیب نقشۂ افلاک سے یہ بات حال ہی میں معلوم ہوئی ہے کہ ہماری کہکشاں کے ماوراء اور کہکشائیں اربوں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں، جن میں صرف ایک ہزار کا نقشہ اب تک مرتب ہو سکا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ کہکشاں کوئی مستقل یونٹ نہیں ہے۔ بلکہ بہت سی کہکشائیں مل کر ایک

اور بڑی کہکشاں بناتی ہیں اور یہ بڑی کہکشائیں بھی کسی دوسری عظیم تر کہکشاں سے وابستہ ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سلسلہ کہیں ختم بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جس طرح فضا میں اور تمام سیارے گردش کر رہے ہیں اسی طرح یہ کہکشائیں بھی مصروف طواف ہیں اور کسی کو خبر نہیں کہ ۰۰۰ اکرور میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہ اس لامحدود کائنات میں کہاں جا رہی ہیں اور کیوں؟ ہر چند جدید آلات رصدگاہ کی رسائی ان ستاروں تک ضرور ہوگئی ہے جن کی روشنی دو ارب سال میں ہم تک پہنچی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت کا گوشہ نقاب بھی اب تک نہیں الٹ سکے۔

ہمارا نظام شمسی قریب ترین کہکشاں کے دائرہ میں بھی بالکل بالائی کنارہ پر واقع ہے۔ جہاں اربوں سیاروں کے جھنڈ میں وہ بھی پانچ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہر وقت مصروف گردش ہے۔

کہکشاں کے سیاروں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ سفید۔ سرخ اور زرد۔ سرخ ستاروں کی سطح کا درجہ حرارت ۳۰۰۰ سنٹی گریڈ ہے اور سفید ستاروں کا درجہ حرارت جو بہت زیادہ گرم نہیں ۲۰ ہزار ہے۔ زرد رنگ کے ستاروں کا درجہ حرارت (جس میں ہمارا سورج بھی شامل ہے) چھ ہزار ہے۔ ان ستاروں کی عمر کا اندازہ ۵۰ کرور سے پانچ ارب سال تک کیا گیا ہے جن میں ہمارا آفتاب بھی چار ارب سال سے وقف التہاب ہے۔

یہ ہے مختصر و ناتمام سا بیان صرف اپنی کہکشاں کا جس کے اربوں ستاروں کے جھنڈ میں ہمارا حقیر نظام شمسی بھی شامل ہے۔ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کہکشاں کے ماورا اور کتنی کہکشائیں پائی جاتی ہیں۔

کائنات کی اس محیر العقول وسعت کو دیکھ کر (جس کے احاطے سے تصور انسانی ہمیشہ عاجز رہے گا) قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سب کچھ از خود ظہور میں آگیا ہے یا اس کا کوئی خالق بھی ہونا چاہئے۔ اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچکر وجود خداوندی کے تصور کے حدود شروع ہو جاتے ہیں اور ایک مفکر اپنی عجز و نارسائی کا اعتراف ان الفاظ میں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بیدل آں گوہر نایاب سراغ | بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینہ ہوش | گل تواں گفت وے چیدن نیست
نسخہ ہا در بغل و فہم محال | جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

فارسی کے بعض لغوی و معنوی نکات

شہید = اصطلاحاً اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں جان دے۔ لیکن فارسی زبان میں مطلق مقتول کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ راہ خدا میں جان دینے کی کوئی قید نہیں۔ عرفی کہتا ہے:-

گر مردِ ہمتی ز مروت نشاں مخواہ
صد جا شہید شو، دیت از دشمناں مخواہ

عشوہ :- یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور عین کے فتحہ، کسرہ اور (زبر، زیر، پیش) تینوں حرکات کے ساتھ اس کا تلفظ ہوتا ہے مفہوم ہے کوئی ایسا کام کرنا ہے۔ جس کا علم کسی کو نہ ہو سکے، اس آگ کو بھی عشوہ کہتے ہیں جو دور سے نظر آئے۔
فارسی میں ناز و کرشمہ کے مفہوم میں مستعمل ہے کیونکہ ان کا تعلق بھی اشارۂ چشم و ابرو سے ہے جو دوری سے تعلق رکھتے ہیں

زمین :- لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے زَم اور ین حرف نسبت سے یعنی منسوب بہ زم۔ زم بہ معنی سردی آتا ہے اور چونکہ اجزاء ارضی بھی سرد ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کو زمین کہنے لگے۔

بوالہوس۔ بلہوس = بعض حضرات اسے عربی ترکیب سمجھتے ہیں (بہ معنی ہوس کا باپ) جیسے بوجہل وغیرہ بعض اسے خالص فارسی سمجھتے ہیں اور (بغیر واؤ کے) بلہوس لکھتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بُل اور ہوس کا مرکب قرار دیا جائے گا۔ بُل فارسی میں بہ معنی بسیار مستعمل ہے جیسے بُلغاک شور و غوغائے بسیار کے معنی میں۔

بسمل = یہ لفظ فارسی الاصل نہیں ہے اور عام طور پر ذبیح یا مذبوح کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن ذبح کرنے کے مفہوم میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

قاتل من چشم من بند و درم بسمل مرا
تا ماند حسرت دیدار او در دل مرا

آشنا = شنا (تیرنا) اور شنا کنندہ (تیرنے والا) دونوں مفہوم میں مستعمل ہے اور حرف آ زاید ہے جیسے آرزو اور آہنگ کہ یہ اصل میں رزو اور ہنگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حرف آ فاعلیت کے معنی ظاہر کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہو۔

الماس - فارسی میں ہیرے کو کہتے ہیں اور کنایتاً تلوار، خنجر اور آبگینہ کو بھی۔ فولاد جوہر دار کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ یہ لفظ فارسی الاصل نہیں ہے۔ بلکہ عربی لفظ ماس ہے۔ جس میں الف لام تعریف و تخصیص کا شامل کر دیا گیا ہے۔ ماس عربی میں غصہ کرنے اور زخمی کرنے کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔
فارسی میں چست و چالاک انسان کو بھی الماس کہتے ہیں۔

رُواں = جان، نفس اور روح کے معنی میں مستعمل ہے۔ بعض حضرات غلطی سے اس کا تلفظ رُواں (بہ ضم را) کرتے ہیں۔

عِذار = عربی لفظ ہے جس سے مراد رخسار کی داڑھی ہے۔ لیکن فارسی میں مطلق رخسار کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

حجاب ۔ اصل مفہوم پردہ ہے۔ مجازاً شرم و حیا کے معنی میں بھی مستعمل ہے ۔
گریبان ۔ مفرد لفظ نہیں ہے بلکہ مرکب ہے، گری (بہ معنی گردن) اور بان (بہ معنی محافظ) سے ۔
پشیمان ۔ مرکب ہے پشیم (پراگندگی) اور الف و نون نسبتی سے۔ یا پھر اس لحاظ سے کہ خود لفظ پشیم کے معنی پشیمان کے ہیں۔ الف و نون کو زائد قرار دیا جائے گا۔ جیسے بہار کو بہاراں، روزگار کو روزگاراں اور سحرگاہ کو سحرگاہاں کہنا ۔
نازک و نازنین ۔ دونوں مترادف ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ نازک اشیاء و اشخاص دونوں کے لئے مستعمل ہے اور نازنین صرف اشخاص کے لیئے ۔ نازنین مرکب ہے ناز اور ین کلمۂ نسبت سے جس میں نون زائد ہے ۔
سرشار ۔ لبریز کا مترادف ہے۔ یہ مرکب ہے سر اور شار سے جو شاریدن (ریختن) سے ماخوذ ہے۔ جیسے جامِ سرشار اس پیالہ کو کہیں گے جو کناروں سے چھلک پڑے۔ چونکہ اس میں کثرت کا مفہوم پنہاں ہے۔ اس لئے ہر کثیر شے پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ جیسے دولتِ سرشار (بہ معنی دولت بسیار) بہت زیادہ شراب پی جانے والے کو بھی سرشار اسی لئے کہتے ہیں کہ شراب اس کے لبوں سے ٹپکنے لگتی ہے ۔
کاغذ ۔ بہ معنی قرطاس۔ یہ دراصل کاغذ ہے۔ کاغ (نالہ و فریاد) اور دال نسبتی سے مرکب۔ (قرطاس میں حرکت و جنبش سے آواز پیدا ہوتی ہے)
دال نسبتی کی دوسری مثال لفظ زرد بھی ہے۔ جو رنگ میں زر کے مشابہ ہوتا ہے ۔
بد ۔ فارسی میں یہ لفظ عام طور پر برے کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن بے (بغیر) کے مفہوم میں بھی اس کو استعمال کرتے ہیں جیسے بدراہ (بہ معنی بے راہ) بدزہرہ (بہ معنی بزدل) زہرہ پتہ کو کہتے ہیں اور اس کے معنی طاقت کے بھی ہیں ۔
سار۔ساران، سارہ ۔ سار، سر کا مشبح ہے جیسے سبکسار و سبک سر، نگوں سر اور نگونسار۔ ساران جسم کے بالائی حصے کو کہتے ہیں سار، اس چادر کو کہتے ہیں جسکا ایک سرا کمر سے باندھ لیتے ہیں اور دوسرا سر تک لیجاتے ہیں۔ اسی لباس کو ہندی میں ساری یا ساڑھی کہتی ہیں
سیہ مست ۔ سیاہ یا سیہ کالے رنگ کو کہتے ہیں۔ لیکن بلبسیار کے معنی میں بھی استعمل ہے۔ جیسے سیہ مست اور بد (برے) کے مفہوم میں بھی جیسے سیہ کار ۔
گلگونہ ۔ غازہ و سرخی جو عورتیں اپنے چہرہ پر ملتی ہیں۔ اسے گلغونہ۔ گلغنچہ۔ آلگونہ۔ اور الغونہ بھی کہتے ہیں (آل سرخ کو کہتے ہیں)
سپاسدار ۔ سپاس کے معنی منت و شکر کے بھی ہیں لیکن سپاسدار نگہباں کو کہتے ہیں ۔
زرخیز ۔ عام طور پر حسن خیز اور زرخیز کے معنی حسن پیدا کرنے والے اور زر پیدا کرنے والے سمجھے جاتے ہیں حالانکہ اس کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں حسن یا زر پیدا ہو۔ کیونکہ خیز، خاستن سے مشتق ہے جو متعدی نہیں لازم ہے ۔
لوچاک ول ۔ رحیم، دردمند اور رقیق القلب انسان کو کہتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کم حوصلہ اور کم ظرف کے مفہوم میں بھی مستعمل ہوتا ہے
خزینہ ۔ اصل میں یہ خزیدن (چھپنا) کا مشتق خزیدہ تھا (پوشیدہ کے مفہوم میں)۔ چونکہ مال و زر کو زمین میں دفن کر کے چھپانے کا دستور ہے اس لئے اسے خزیدہ کہنے لگے۔ بعد کو دال نون میں تبدیل ہوگئی۔ اس تبدیلی کی مثالیں فارسی میں اور بھی ملتی ہیں۔ جیسے نمودہ سے نمونہ۔ گزیدہ سے گزینہ ۔
تیغ سیہ تاب ۔ تلوار صیقل کرنے کے بعد اسے لیموں کے پانی سے تر کر دیتے ہیں اور پھر اسے آگ پر رکھ دیتے ہیں اور اس کا رنگ نیلگوں ہو جاتا ہے۔ اسی کو تیغ سیہ تاب کہتے ہیں ۔

دانش فرازی

قصیدہ

بہ حضورِ ابنِ آدم

نفسِ صبح سے روشن ہے چراغِ پرویں
کس قدر اوج پہ ہے طالعِ ذوقِ گلچیں

سازِ ہر ذرہ ہے لبریزِ نوائے عشرت
سوزِ پنہاں سے ہے پیراہنِ گل عطر آگیں

آئینہ دارِ تجلی ہے فضائے صد رنگ
بزمِ گیتی بھی بصد جلوہ ہے فردوس بریں

لالہ و گل ہیں کہ آیاتِ لطافت کا نزول
نفسِ بادِ صبا ہے یہ کہ جبریلِ امیں

سبزہ سبزہ وہ طراوت کہ دمِ نظارہ
عقل سوچے نہ بجز لفظِ نشاط و تحسیں

جوہرِ آئینۂ فکر ہے طاؤسِ بہار
تپشِ شوق کا سامان ہے ہر نقشِ حسیں

وجہ آرائشِ کونین ہے کس کی ہستی
باعثِ رونقِ آفاق ہے کس کا آئیں

پیکرِ خاک مگر مظہرِ انوارِ ابد
جس کی ہستی سے ہے وابستہ چہ دنیا و چہ دیں

جس کے توسن کے لئے کاہکشاں گردِ سفر
جس کی منزل نہ فلک ہے نہ خلاء ہے نہ زمیں

جس سے لرزاں تھے سپہر و جبل و دشت و دمن
میرا ہی سینہ ہے اسی رازِ محبت کا امیں

آنکھ اٹھائے تو پگھل جائے دہیں جوہرِ سنگ
ہاتھ بڑھ جائے تو مٹھی میں ہوں ماہ و پرویں

وادیاں اسکے کفِ پا سے چمن زارِ نشاط
تیشۂ شوق سے کہسار بھی بت خانۂ چیں

موج تو موج کہ طوفان بھی ہے پابند اس کا
عرق آلود ہے اسی شرم سے قلزم کی جبیں

تہِ دریا ہے صدف اور صدف میں گوہر
جان لیتی ہے یہ ہر نوع نگاہِ حق بیں

ورقِ لالہ و گل ہو کہ فلک کی جدول
ہمہ آفاق ہے اس کے ہی لہو سے رنگیں

طے ہو ہر جادۂ صد سالہ بہ اک جنبشِ لب
جراتِ شوق کے آگے کوئی دشوار نہیں

پردۂ گوشِ خدا سازے ٹکراتی ہے
دے کوئی سینکڑوں فرسنگ سے آواز کہیں

دیکھ سکتی ہے سرِ بزم نگاہِ فرہاد
لاکھ پردے میں چھپے جلوۂ حسنِ شیریں

کھل گئی واہمۂ زیست کی ہر ایک گرہ
آج ہے دل کی گذرگاہ پہ قندیلِ یقیں

پر تو سب کچھ ہے مگر رازِ درونِ خانہ
فاش کر دوں تو جھکے شرم سے فرقِ تمکیں

قبلہ گاہِ مہ و انجم بھی عجب ہستی ہے
اپنی فطرت کے حجابات سے آگاہ نہیں

عقل کہتی ہے سرِ چرخ ہی انساں کا مقام
دل یہ کہتا ہے کہ ہے خاک نشیں، خاک نشیں!

نظیر مظفر پوری

مجھے حیات سے ہے اس لئے بھی دلچسپی — یہ ایک دن کا نہیں عمر بھر کا سودا ہے
ہوا ہے ایسا بھی اکثر کہ تیرے جلووں کو — اٹھا کے پردۂ دل بے حجاب دیکھا ہے

انجم صدیقی اعظمی

نہ سرشارِ گماں آئے نہ محرومِ یقیں آئے — تری محفل سے دیوانے بہت اندوہ گیں آئے
کرشمہ سازیٔ سوزِ غمِ پنہاں معاذ اللہ — کہ دل رو دیا کیا اور آنکھ میں آنسو نہیں آئے

طالب جے پوری

جبینِ شوق ہے اور سنگِ در نہیں معلوم — وہ راہرو ہوں جسے رہگزر نہیں معلوم
اداس اداس ہیں راتیں اداس اداس دن — وہ کیا ہوئے مرے شام و سحر نہیں معلوم
مجھے تلاش ہے ان کی انہیں ہے میری تلاش — یہ کیا مقام ہے اے راہبر نہیں معلوم
ہوئی تو ہے تری آہٹ کبھی کبھی محسوس — یہ دل ہے یا ہے تری رہگزر نہیں معلوم

تصور کا عالم بدل گیا طالب
یہ کون دل میں ہوا جلوہ گر نہیں معلوم

شارق میرٹھی

میں کس سے جا کے کہوں اپنے اضطراب کا حال
یہاں کوئی بھی سکوں آشنا نہیں ملتا
خلش جگر کی تڑپ دل کی سوز آنکھوں کا
میں کیا بتاؤں محبت میں کیا نہیں ملتا
چمن میں لالہ و گل ہیں کہ آسماں پہ نجوم
کوئی بھی نقش یہاں دیرپا نہیں ملتا
خود اپنی آبلہ پائی کا ہو نہ کیوں ممنون-؟
وہ راہرو کہ جسے رہنما نہیں ملتا

سید حرمت الاکرام

خفا نہ ہو کہ ہے اک طرزِ گفتگو یہ بھی
چمن کی بات پہ اہلِ چمن کا ذکر آیا

دیارِ جرم و سزا میں ہمارے نام کے ساتھ
ہزار مرتبہ دار و رسن کا ذکر آیا

ہے خسروی کو زمانے سے یہ گلہ حرمت
کہ اس کے ذکر پہ کیوں کوہکن کا ذکر آیا

کیا جانئے دل میں سوچ کے کیا میرِ غمگسار
پہنچانے مجھ کو کوچۂ جاناں تک آئے ہیں

آساں نہ تھا سکوت کا مفہوم جاننا
جانِ زندگی تو شہرِ خموشاں تک آئے ہیں

کچھ وضعِ احتیاط نے چپکے سے کہہ دیا
سو بار ورنہ ہاتھ گریباں تک آئے ہیں

پروانے اپنی آگ میں حرمت نہ جل سکے
مجبور ہو کے شمعِ فروزاں تک آئے ہیں

کاوش حیدرآبادی

پھولوں کا زمانہ بیت گیا تعمیرِ جنوں محکم نہ ہوئی
اس فصل میں بھی وہ آ نہ سکے دل میں جو خلش تھی کم نہ ہوئی

دل ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا احساس بھی بہت کھو بیٹھا
خورشیدِ محبت کی لیکن دھیمی نہ پڑی مدھم نہ ہوئی

دنیا میں بہت طوفاں آئے عبرت نے بہت ڈیرے چھوڑے
کاوش یہ حیاتِ انسانی اس عہد میں بھی برہم نہ ہوئی

اکرم دھولوی

نہ تاب دردِ مہجوری نہ یارائے جگر داری
خبر ہے بیمارِ غم پر ان دنوں ہر سانس ہے بھاری

بڑی مدت کے بعد آرام اہلِ غم نے پایا ہے
کوئی کہہ دے نہ فرمائیں وہ اب تکلیفِ دلداری

کہاں تک اور ہوتی ہم سے شرحِ آرزو اکرم
سمٹ کر آ گئی آنکھوں میں دل کی کیفیت ساری

سعادت نظیر

بزمِ جاناں میں کہیں چھیڑ نہ دے قصۂ غم
اسی باعث دلِ غمخوار سے جی ڈرتا ہے

ہاتھ اٹھا لے نہ کہیں پیرِ ستم کوشی سے
خواہشِ لذتِ آزار سے جی ڈرتا ہے

عشق اور ان کا، کوئی جرم نہیں ہے پھر بھی
کیا قیامت ہے کہ اقرار سے جی ڈرتا ہے

پروفیسر شور (علیگ)

برسات

برسات ہے یا خواب سے بنتی ہے سیہ رات
اٹھتے ہوئے بادل ہیں کہ اڑتے ہیں خرابات

ہے ابرِ سیہ بھی کسی دیوار کا سایہ
بادل کے یہی ٹکڑے ہیں بھٹکتے سے خیالات

بادل کے جزیروں میں بھٹکتا ہے کہیں چاند
بجلی کے جلاتی ہے خلاؤں میں دیئے رات

ترشے ہوئے بت ہیں کہ سبھی ابر کے سائے
سنائے ہیں کہ سنگین خداؤں کی روایات

آئینہ افق کا ہے کہ مریم کی جبیں ہے
بادل ہیں کہ انجیلِ مہ و سال کی آیات

سر پر لیے جاتا ہے کوئی دیو سیہ فام
اصنام اجنتا کی پراسرار کوئی رات

بہتے ہیں خلاؤں میں گہر پاش سفینے
یا دوشِ افق پر ہے کوئی شہرِ طلسمات

کھوئے ہوئے شہپر ہیں سیہ پوش گھٹائیں
یا برسرِ پرواز ہیں شاعر کے خیالات

نجم و مہ و ناہید کی قندیل بجھا کر،
دیتی ہے اندھیروں کو گھٹا برق کی خیرات

ناسورِ مہ و سال چھپاتی ہے شبِ تار
یا چاند کے رخسار پہ ہے چادرِ ظلمات

ہے محو کسی ابر کی آغوش میں مہتاب
یا کھول کے بیٹھا ہے یہودی کوئی تورات

یوں ٹوٹ کے گرتی ہے کسی پیڑ پہ بجلی
جیسے کسی بھوکے کی سزا مرگِ مفاجات

دل سرد ہواؤں میں بھی یوں ڈوب رہا ہے
جیسے کسی واعظ سے سرِ دیر ملاقات

نمناک ہوائیں بھی ہیں سلگے ہوئے پیکاں
بادل بھی ہیں جلتے ہوئے اشکوں کی حکایات

عالم ہے وہ عالم کہ بہ فتوائے بہاراں
آنسو بھی دعا، آہِ سحر بھی ہے مناجات

لہراتی ہے اس طرح شبِ تار میں بجلی
جیسے کسی چلمن سے نکلتا ہو کوئی ہات

برکھا میں فراپد کہیں قہقہے کے آہو
کھولے ہوئے جوڑے کہیں حورانِ سماوات

بازوئے بلوریں پہ کہیں ٹوٹتے موتی،
بھیگی ہوئی زلفوں سے ٹپکتے کہیں قطرات

سرشار گھٹائیں مری جانب نگراں ہیں
شاداب ہوا پوچھ رہی ہے مرے حالات

سپنوں کی یہ نگری، یہ فسانوں کے جزیرے
تھم جائیں تو بادل ہیں یہ برس جائیں تو برسات

غیرت کا تقاضا کہ چھپا دل کا ہر اک زخم
وحشت کا یہ اصرار کہ چل گھر سے مرے سات

جینا بھی قیامت ہے نہ جینا بھی قیامت
اے کاش دبے پاؤں گزر جائیں یہ لمحات

سیمنٹ۔ مستقبل کی تعمیرات کا مظہر

زیل پاک سے عمارتیں بنائیے!

سیمنٹ قومی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو عملی صورت دینے کی ایک اہم کڑی ہے ہمارے گرد و پیش روز بروز اسکول، ہسپتال بنک، ہوٹل، سٹیڈیم، ہوائی اڈے اور دیگر کاروباری اور رہائشی عمارتیں تیزی سے بن رہی ہیں۔ ان کی تعمیرات اور بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے زیل پاک سیمنٹ استعمال کیا جاتا ہے

مضبوط بنیادوں
اور
تعمیر کے لئے

سیلنگ ایجنٹس:-

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

PRESTIGE

ایک غیر محسوس خدمت ...

... جس کا احساس

اکثر نہیں ہوتا

پٹرول یا تیل خریدتے وقت شاذونادر ہی کسی موٹر چلانے والے کو برماشیل کی غیر محسوس خدمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

برماشیل کی یہ خدمت، جو عموماً خریداروں کو محسوس تک نہیں ہوتی "کوالٹی کنٹرول" کہلاتی ہے۔ یعنی مصنوعات کی تمام خصوصیات اور کیفیات کو ان کی معیاری حالت پر قائم رکھنا۔

یہ غیر محسوس خدمت اس بات کی ضامن ہے کہ برماشیل کی تمام مصنوعات بین الاقوامی معیار کے مطابق ہیں۔

برماشیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

BSP—45

Mashhoor Press, Karachi

نومبر ۱۹۶۲ء

سالانہ چندہ
دس روپے
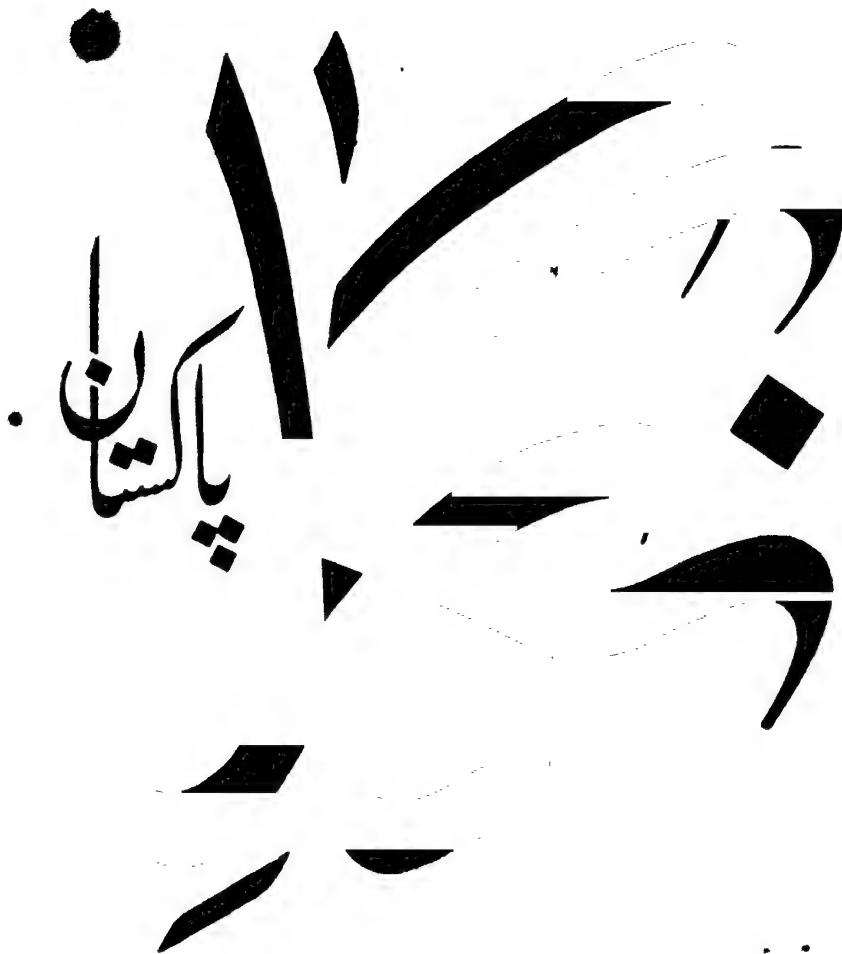
قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

من و یزداں (زیر طبع)

جو اپنی انشاء عالیہ اور پر زور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزہ ادب کی حیثیت رکھتی ہے
اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنے میں

,, انجیل انسانیت ،،

کہہ سکتے ہیں

یہ مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے
جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام بنی نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ
اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی
تحقیق و دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور کتب مقدسہ پر تاریخی و علمی و اخلاقی و نفسیاتی
نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت آٹھ روپے

ٹیلیفون ۔ ۷۹۴۶۵

رجسٹرڈ ایس نمبر ۲۴۷۲

نومبر ۱۹۶۲ء

نگارِ پاکستان

نگراں
مولانا نیاز فتحپوری

مدیر
عارف نیازی

معاون
فرمان فتحپوری

منیجر
قمر نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
پچھتر ۷۵ پیسے

ہندوستان میں نگار کا چندہ بھیجنے کا پتہ ۔ منیجر کتاب کار پبلکشنز، پھلوار، رامپور (یوپی)

دار الاشاعت ۔ ادارہ نگار پاکستان ۔ ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی ریجن بموجب سرکلر نمبر ڈی / ایف ۔ یو پی ۔ بی / ۳۶۶۹-۷۶۸ / ۶۲ محکمہ تعلیم کراچی

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کیساتھ ختم ہوگیا

فہرست

اکتالیسواں سال	فہرست مضامین - نومبر ۱۹۶۲ء	شمارہ ۱۰

ضروری اعلان

پروفیسر فرمان فتحپوری نے جو میرے نہایت مخلص عزیز دوست ہیں ازراہ کرم ادارۂ نگار پاکستان میں شرکت قبول فرمائی ہے اور مجھے امید ہے کہ اب نگار علم و ادب کی بہتر خدمات انجام دے سکے گا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ آئندہ سالنامہ نگار "نیاز نمبر" کے نام سے مرتب کر رہے ہیں جس کے عنوانات و تفصیل آپ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

نیاز

ملاحظات

پاکستان کو فقہاء کی ضرورت ہے علماء کی نہیں

اس دوران میں میرے ایک لائل پوری دوست نے مجھ سے پوچھا کہ Science of Ethics (علم الاخلاقیات) کے مقابل Science of Nomology کے لئے کونسی اصطلاح مناسب ہوگی۔ جہاں اخلاقیات کی رو سے انسان کے عمل ظاہری اور نیت باطنی دونوں کو دیکھا جاتا ہے وہاں نومولوجی۔ صرف انسان کے عمل ظاہر پر حکم لگاتا ہے؟

میں نے ان کو لکھا کہ "اول تو نومولوجی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ صرف عمل ظاہر سے تعلق رکھتی ہے۔ محل نظر ہے۔ کیونکہ اس میں دراصل ادراکات نفسی کے اصول سے بحث کی جاتی ہے اور ظواہر سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اگر میں غلطی پر ہوں اور آپ ہی کا خیال درست ہے تو اس کا ترجمہ "علم الشعائر" مناسب ہوگا"

خیر یہ ذکر تو ضمناً آگیا۔ دراصل مجھے یہ کہنا تھا کہ اس سوال پر غور کرنے کے سلسلہ میں میرا خیال خدا جانے کہاں کہاں پہنچا اور آخر میں وہ ختم ہوا تو "پاکستان و دستور پاکستان" پر۔ !

اس سلسلے میں سب سے پہلے ذہن "Theology" کی طرف منتقل ہوا، جو مرکب ہے یونانی لفظ Theos (خدا) اور Logos (صحیفہ) سے اس کے بعد Theos کے بہت سے دوسرے مرکبات سامنے آئے۔ تھیوسوفی، تھیوجونی، تھیومیتھی وغیرہ اور آخر میں Theocracy پر آکر رک گیا جس کا ترجمہ "حکومت الہی" کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ حکومت کے تصور کے ساتھ آئین و دستور حکمت کی طرف خیال منتقل ہوجانا چاہیئے تھا۔ سو ہوا۔ اور پھر Theology کی طرف لوٹ گیا۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اس کا ترجمہ "علم الفقہ" کس حد تک صحیح ہے ـــــ کیوں نہ اسے "علم الشریعت" کہا جائے جو اسلام کی تمام تشریعی کارگاہ پر حاوی ہے لیکن اس کے بعد ہی فوراً پاکستان کے ارباب علم سیاست کا یہ اعلان سامنے آگیا کہ "یہاں کا آئین قرآن و حدیث پر مبنی ہوگا" اور تادیر سوچا کیا کہ جب خلفاء راشدین کے عہد میں بھی زندگی کے تمام مسائل محض قرآن و حدیث کے اسناد و روایات سے طے نہ ہو سکے اور مجبوراً اجتہاد سے کام لینا پڑا تو اب کہ ترقی علوم و فنون، تہذیب و تمدن نے ہزاروں نئی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں کیونکر صرف نصوص قرآن و حدیث کی مدد سے انھیں سلجھایا جاسکتا ہے اور کس طرح ممکن ہے کہ عہد حاضر کے کسی دستور یا آئین کی بنیاد بغیر فکر اجتہاد کے محض قرآن و حدیث پر قائم ہو سکے، اور یہاں کے ارباب فکر و سیاست نے اپنے اعلان میں قرآن و حدیث کے ساتھ اجتہاد کو کیوں شامل نہ کیا؟

آخر کار خیال کی یہ رفتار مجھے "فقہ اسلامی" و "شریعت" کے موضوع تک لے گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کے علمی و تاریخی مطالعہ کے بعد میرے خیال کو بہت تقویت پہنچی۔

فقہ

اس لفظ کا استعمال قرآن میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کا لغوی مفہوم صرف علم ہے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ بعد کو جب وضع قانون و ترتیب قضایا کا سوال سامنے آیا تو علم و فقہ دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہوگیا یعنی علم محدود ہوگیا صرف "علم روایات" تک اور لفظ فقہ ذاتی رائے یا اجتہاد کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا اور اس طرح روایات و

اجتہاد یا علم و فقہ دونوں سے مل کر عہد خلفاء راشدین میں دستور اسلام کی تشکیل عمل میں آئی ۔ اس کے بعد جب دائرۂ اسلام زیادہ وسیع ہوا اور دوسرے ملک والوں سے اختلاط بڑھا تو تمدن و معاشرت پر بھی اس کا اثر پڑا اور باہمی تعلقات کے سلسلے میں بہت سے ایسے نئے مسائل سامنے آئے جو نہ صرف نئے بلکہ پیچیدہ بھی تھے۔ نہ قرآن میں ان کا ذکر تھا نہ احادیث میں ان کی طرف کوئی اشارہ جہاں تک کہ عہد خلفاء راشدین کا ریکارڈ بھی ان کی رہبری نہ کرسکا۔ ان حالات میں وہ مجبور تھے کہ خود اپنی فراست سے کام لے کر ان کا حل تلاش کریں اور اس طرح فقہ میں رائے قیاس اور اجتہاد کا عام رواج ہوگیا جو بالکل ناگزیر امر تھا ــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ نے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کرلی، اس کے اصول وضع ہونے لگے (جس کا آغاز امام شافعی پہلے ہی کرچکے تھے) اور مملکت اسلام میں اس کے مختلف دبستان قائم ہوگئے ــ حجازی ۔ عراقی ۔ شافعی ۔ مالکی ۔ حنبلی ۔ حنفی وغیرہ یہاں تک کہ شیعی اور معتزلی بھی ۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور دبستان فقہ حجاز کا ہے جس کے بانی "حماد بن ابی سلیمان" نے رائے و اجتہاد ہی کو اصل چیز قرار دیا اور اسی دبستان کے مشہور امام ابوحنیفہؒ تھے۔ جن کا اجتہاد ضرب المثل ہوگیا تھا۔ بعد کو ان کے دو شاگردوں ، یوسف و محمد کی وساطت سے، عہد عباسیہ میں فقہ حنفی حکومت کا قانون قرار پایا ۔

یہ تھا نہایت مختصر بلکہ مختصر سا بیان علم فقہ کی بنیاد و ترقی کا ــــ اب آیئے اک سرسری نظر شریعت کی اصطلاح پر بھی ڈالیں

شرع و شریعت

اس کا لغوی مفہوم ہے "صاف و صحیح راستہ" قرآن پاک میں لفظ شرع و شرعۃ " تین جگہ (سورۂ شوریٰ سورۂ اعراف، سورۂ مایدہ میں) پایا جاتا ہے اور لفظ شریعت صرف ایک جگہ سورۂ جاثیہ میں ہے:

"ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر" جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تم کو شریعت حکومت عطا کی یا یہ کہ تم کو ایسی شاہراہ عمل بتائی جو مقاصد نبوت و قیادت ملت کے لئے ضروری ہے اور اپنی وسعت مفہوم کے لحاظ سے نظام حیات کے داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے

ممکن ہے کہ اول اول (حسب بیان طبری) اس کا تعلق صرف قانون توارث (الحقوق الفرایض) تعزیری حدود اور تصریح اوامر و نواہی تک محدود رہا ہو۔ لیکن بعد کو تفسیر و حدیث، اخلاق و آداب، فقہ و اصول فقہ، عبادات و معاملات سب اس میں شامل ہوگئے اور شریعت ایک ایسی اصطلاح ہوگئی جو تعمیر اسلام کے پورے ڈھانچے کے تصور پر حاوی تھی ۔

اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ فرق یہ تھا کہ خلفاء راشدین کے عہد میں صرف احادیث نبوی کو سامنے رکھا جاتا تھا اور بعد میں عہد خلفاء راشدین و تابعین کے اجتہادی اقوال و کردار کو بھی ۔

علم و فقہ کی اس معنوی تفریق کا ثبوت ہمیں اس زمانے کے تاریخی لٹریچر سے بہ آسانی مل سکتا ہے ۔

ابن سعد نے لفظ علم کا استعمال ہمیشہ روایت کے مفہوم میں کیا ہے۔ اور نوویؔ نے بھی "فقہ والروایت" کی تقسیم اسی اختلاف مفہوم کو سامنے رکھ کر کی تھی۔ اسی طرح مجاہد نے قرآن کی آیت " من یوتی الحکمۃ " کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن۔ علم اور فقہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں بھی فقہ کی بنیاد صرف روایات پر نہیں بلکہ اجتہاد پر قائم ہوئی تھی ۔

چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر آگے چل کر اہل علم اور اہل فقہ کی دو جماعتیں علیحدہ علیحدہ قائم ہوگئیں ۔ اہل علم سے مراد وہ وہ لوگ تھے جو صرف روایات پر عبور رکھتے تھے اور اہل فقہ سے وہ نفوس مراد تھے جو موقع و محل کے پیش نظر ذاتی اجتہاد سے کام لیتے تھے ۔

جب عطا ابن ابی رباح سے ان کے ایک فیصلہ کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ فیصلہ علم کی بنیاد پر کیا گیا ہے یا فقہ کی بنیاد پر تو انھوں نے کہہ دیا کہ "علم کی بنیاد پر" ــــ خلافت حضرت عمر میں قاضی مصر کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس کی کوئی نظیر روایات

میں نہ پائی جاتی تھی، اس نے حضرت عمرؓ سے استصواب کیا تو آپ نے حکم دیا کہ خود اپنی فراست اور اپنے اجتہاد سے کام لو"۔

اسی طرح امیر معاویہ نے ایک ایسے مسئلے میں جس کے باب میں قرآن و احادیث دونوں ساکت تھے۔ زید بن ثابت سے فتوے طلب کیا تو انہوں نے محض اپنی ذاتی رائے سے کام لیا۔

ہارون الرشید نے اپنے گورنر ہرثمہ کو جو ہدایات کی تھیں ان میں سب سے زیادہ اہم ہدایت یہ تھی کہ "اولی العلم بکتاب اللہ" سے کام نہ چلے تو "اولی الفقہ فی الدین" سے استصواب کرو۔ یہ اور اس قسم کے متعدد تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد خلفاء راشدین ہی میں فقہا و علماء دونوں کی حیثیت ایک دوسرے سے جدا ہو گئی تھی اور بعد کو تابعین و تبع تابعین کے زمانے میں تو علم و فقہ کے ادارے ہی علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئے ان کے بعض ارکان ایسے تھے جو صرف قرآن و حدیث کا روایتی علم رکھتے تھے (اور انہیں علماء کہا جاتا تھا، جیسے عبداللہ ابن عمرؓ "جید المحدیث" کہلاتے تھے جید الفقہہ نہیں بعض ایسے تھے جو صرف "تفقہ فی الدین" یا اجتہاد کی اہلیت رکھتے تھے۔ اور بعض ایسے "ذو ریاستین" بھی تھے جو علم و فقہ دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے مثلاً مثلاً ابن عباس، زید بن ثابت، سعد بن المسیب کہ وہ فقہ و روایت دونوں کے ماہر تھے اور اسی لئے انہیں "اعلم العلماء" اور "افقہ الفقہاء" کہا جاتا تھا۔ تابعین کے زمانے میں ایک بزرگ ابو ثور ایسے گزرے ہیں جو اپنے علم و تفقہ کے لحاظ سے "احد ائمۃ الدنیا فقہاً و علماً" سمجھے جاتے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض کتاب الٰہی کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ حکمت و فراست سے کام لینا بھی ضروری ہے، گویا اسلام نے اول ہی اول اس حقیقت کو نہایت صاف و روشن الفاظ میں بتا دیا تھا کہ مسلمان اگر ترقی کر سکتا ہے تو صرف اسی صورت سے کہ وہ عقل و فراست یا اجتہاد سے کام لے اور تاریخ شاہد ہے کہ قرون اولیٰ کے اکابر نے ہمیشہ اسی حقیقت کو سامنے رکھا۔

شریعت اسلام کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ عبادات و معاملات۔ بعض مفسروں نے اس میں عقوبات کو بھی شامل کر دیا ہے۔ سو عبادات کا مسئلہ تو بالکل صاف ہے اور اس میں کسی تغیر و تبدل یا فکری اجتہاد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ، حلال و حرام وغیرہ کے مسائل و ضوابط جو اس سے قبل متعین ہو چکے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت سے ہمیشہ گوارا کئے جا سکتے ہیں لیکن معاملات کا حصہ البتہ بہت وسیع و پیچیدہ ہے اور انہیں ہم بغیر فکر اجتہاد کے نہیں سلجھا سکتے۔ چنانچہ معاملات کے باب میں خلفاء راشدین، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں بھی ہمیشہ عقل و فراست، فکر و اجتہاد سے کام لیا اور آئندہ بھی ہم ہمیشہ اس پر مجبور رہیں گے علی الخصوص اس صورت میں کہ بہ نسبت قرون اولیٰ کے اس وقت ہمارے مسائل حیات بہت زیادہ وسیع و پیچیدہ ہو گئے ہیں اور کوئی فقہی یا روایتی ریکارڈ ایسا ہمارے سامنے نہیں جس کی مدد سے ہم ان کو سمجھ سکیں یا سلجھا سکیں۔ پہلے انسان بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور معاملات کے حدود بھی اتنے وسیع نہ تھے، لیکن اب کہ دنیا میں انفرادی انسان ختم ہو گیا ہے تمام جامعہ بشری ایک ہیئت اجتماعی میں تبدیل ہو گئی ہے اور ساری دنیا کا غم اپنے سر لئے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے ہماری زندگی ایک ایسا معمہ ہو کر رہ گئی ہے جس کا حل کرنا حد درجہ دشوار ہے۔

پہلے لین دین کی صورت بہت صاف و سادہ تھی، تجارتی نظام میں بھی کوئی پیچیدگی نہ تھی: معاملہ صرف "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" تک محدود رہتا تھا، لیکن اب مالیات و اقتصادیات، تجارت و صنعت کے سلسلہ میں بنکنگ، بیمہ، درآمد برآمد، تبادلۂ زر وغیرہ کے سیکڑوں نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن سے گریز ممکن نہیں اور قدیم فقہ، قدیم روایتی لٹریچر یا قدیم شرعی نظائر ان کے سمجھنے یا حل کرنے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

پھر اگر یہ خیال صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ اسلام بڑا جاندار، بڑا لچکدار مذہب ہے اور اس کا خطاب کسی مخصوص جماعت و قوم سے نہیں بلکہ جملہ نوع انسانی سے ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم تمام ان اصول و روایات تمدن کو قبول کریں جو اس وقت انسانی ترقی کی بنیاد ہیں اور ان کے موافق ماحول پیدا کرنے کے لئے روایات نہیں بلکہ درایات سے کام لیں جن کو قرآنی زبان میں لفظ حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی یہ کھوئی ہوئی چیز (الحکمۃ ضالۃ المومنین) کہاں اور کیونکر دستیاب ہو سکتی ہے سو اس کے متعلق یقین کے ساتھ ہم صرف ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ جنس گراں بمایہ علماء روایت نہیں بلکہ علماء درایت کے پاس ملے گی جن کو فقہاء کہتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے اس وقت کوئی ایسی جماعت یہاں موجود نہیں تو پاکستان کو اسے پیدا کرنا پڑے گا۔

نگارِ پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۳ء نیاز نمبر ہوگا

جس میں

تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب شریک ہو رہے ہیں اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری، ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا جائے گا۔ گویہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت و فن کا ایک ایسا مرقع ہوگا جو
اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز
کی حیثیت رکھے گا۔ اور علم و ادب
کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

"نگار کا سالنامہ" ہندی شاعری نمبر

جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ درج ہے۔ ہندی کے تمام اصناف شاعری ان کے موضوعات اور مباحث کے ساتھ ہی اردو شاعری سے تقابل اور تبصرہ پر سیر حاصل مقالات ہیں۔ ہندی کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو اردو میں صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔

قیمت چار روپیہ
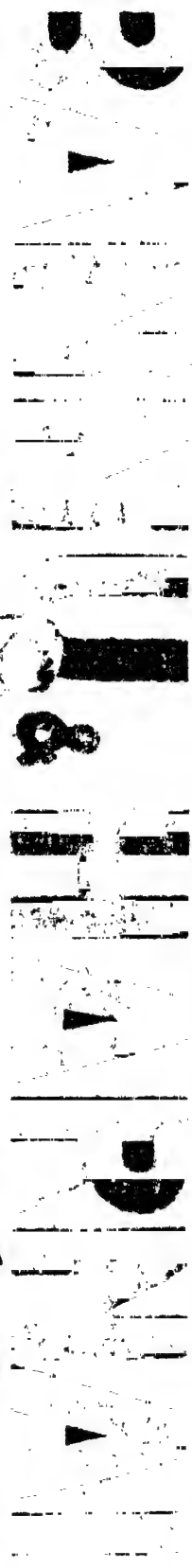
BANNU & HARNAI
موسم سرما کو خوشگوار بنایئے
بنوں اور ہرنائی
کے گرم اور آرام دہ اونی کپڑے
استعمال کیجئے
جو سستے اور پائیدار ہیں
اوورکوٹنگ
بلینڈر کلاتھ
ویلور
قالین
ٹویڈ
کمبل
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
TIONAL 427 B

اردو غزل کے مقطعوں میں شاعر کی شخصیت

سید احتشام احمد ندوی۔ ایم اے

اردو غزل کے مقطعے اس نوعیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں شاعر کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے مقطع میں شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ حقائق بیان کرجاتا ہے جو غزل کے کسی شعر میں نہیں ملتے۔ مسدس اور مرثیہ میں شاعر اپنی فنی عظمت کا مظاہرہ ٹیپ میں کرتا ہے۔ لیکن ہمارے نقادوں کی نظر اس جانب نہیں گئی کہ اردو کے صف اول کے غزل گو شعرا بالکل یہی اہتمام اپنی غزلوں کے مقطعوں میں کرتے ہیں اور مقطع کے ذریعہ سے پوری غزل میں جان ڈال دیتے ہیں۔

شاعر جتنا بڑا ہوگا اس کی شخصیت اس کے مقطعوں میں اتنی ہی زیادہ نمایاں ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شعرا اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غزل کے مقطعے زیادہ ستھرے، حقیقت سے پُر اور معنی خیز ہوں اور اس انداز کے ہوں کہ ان کے مطالعہ سے ان کا پورا رنگِ شاعری اور ان کی شخصیت سامنے آجائے۔ مقطع کی خوبی کو شاید اس لئے بھی شعرا پسند کرتے ہوں کہ یہ غزل کا آخری شعر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقطع زوردار نہیں ہے اور اچھا اثر پیدا کرنے سے قاصر ہے تو پوری غزل خواہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن آخری شعر کی خرابی سے غزل کا اثر ذہن پر خراب پڑتا ہے

اردو غزل کے مقطعے شاعر کے خیالات، جذبات، بنیادی احساسات اور اس کی شخصیت کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے غزل گو شاعر کا کلام نہ پڑھیں بلکہ صرف اس کے مقطعے دیکھ لیں تو مجھے یقین ہے کہ اجمالی طور پر اس کی شخصیت کے بنیادی نقوش سے آپ پوری طرح واقف ہوجائیں گے۔ اس سلسلہ میں خاص طور سے میں پہلے اردو غزل کے دو عظیم شاعروں کی مثال پیش کرتا ہوں۔ یعنی مومنؔ اور غالبؔ۔ ان دونوں شاعروں نے اپنی شخصیت کا پوری طرح مقطعوں میں اظہار کیا ہے۔ اور ان کی شخصیت کے خدوخال پوری طرح ان میں نمایاں ہیں۔

سب سے پہلے غالبؔ کو لیجیے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے تغزل کی خصوصیت ان کے مقطعوں میں تلاش کی جاسکتی ہے تصوف فلسفہ، دلکش فارسی طرز کی بندشیں، چست ترکیبیں، نازک خیالیاں، مضمون آفرینیاں، بلند آفاقی خیالات، زندگی اور اس کی حقیقتوں کا بیان یہ تمام خوبیاں غالبؔ کے مقطعوں میں موجود ہیں۔ ان کی شراب نوشی، زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ اور جو بھی ان کے خیالات ہیں ان سب کو ان کے مقطعوں میں پوری طرح تلاش کیا جاسکتا ہے

غالبؔ ابتدا میں مشکل اشعار کہتے تھے اور بیدلؔ کے رنگ میں چنانچہ اس دور کے مقطعے بھی اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں

بس کہ ہوں غالبؔ! اسیری میں بھی آتش زیر پا　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

اور آگے چلئے غالب کے فلسفیانہ اشعار پر نظر ڈالئے، دیکھئے کہ ان کے مقطعوں میں کس قدر یہ اثر نمایاں ہے:۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہ اور اس انداز کے مختلف خیالات جنھیں غالب کا مابہ الامتیاز سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کو مندرجہ ذیل مقطعوں میں پوری طرح دیکھا جا سکتا ہے:۔

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسدؔ　　پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اگر ان مقطعوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ غالب کے تغزل کی روح ثابت ہوں گے اور غالب ان اشعار میں ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اکثر مقطعے آج ضرب الامثال بن چکے ہیں۔ معاشرہ میں انھیں خوشی و غم اور مختلف مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے عام گفتگوؤں اور مضمونوں کی رونق بننے کی ان مقطعوں میں بڑی صلاحیت ہے کیوں کہ یہ فنکار کے فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

غالب کے یہ مقطعے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی اور وسعت کے ساتھ روشنی ڈالتے، ان کے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں اور ان کے رنگ شاعری کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں، تغزل، نزاکت خیال، حقائق حیات، مے نوشی، فلسفہ حسن و عشق سبھی کچھ ان مقطعوں میں موجود ہے۔

مومنؔ کے مقطعے بھی غالب کی طرح ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ اور ان کے خیالات، نظریات، اور رنگ شاعری کے

ترجمان ہیں۔ مومن کے مقطعوں میں وہ ذہنی کش مکش موجود ہے۔ جو شاید خود ان کی زندگی میں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے دینی و سیاسی نظریات بھی پوری طرح ان کے مقطعوں میں نمایاں ہیں۔ سید احمدؒ کی تحریک سے وابستگی کا پتہ بھی ان کے مقطعوں سے چلتا ہے اور ان میں ان کی رنگین طبیعت بھی آشکارا ہے۔ ان کی طبیعت میں جو غیرت اور خود داری تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری پر فخر، اس کا عکس بھی ان کے مقطعوں میں نمایاں ہے۔ مثلاً

مومن آکشش محبت میں کہ ہے سب جائز ۔۔۔ حسرت حرمت صہبا و مزامیر نہ کیجے

کیا ہی بت خانے کو فرماتے ہو ظلمت کدہ ۔۔۔ حضرت مومن جہاں جاتے ہو چھپ کر رات کو

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی کتنے بیقرار ۔۔۔ ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

مومن ایماں قبول دل سے مجھے ۔۔۔ وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں ۔۔۔ خیر ہے مومن تمہیں کیا ہو گیا

مومن از بس ہیں بے شمار گناہ ۔۔۔ غم روزگار حساب نے مارا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن ۔۔۔ صنم آخر خدا نہیں ہوتا

غنچہ ہائے آرزو مومن کے بھی کھلنے کو ہیں ۔۔۔ خیر مقدم گلشن ایماں میں آئی ہے بہار

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے ۔۔۔ جلد مومن سے پہنچے اس مہدی دوراں تلک

مومن تو زمانہ پشیمان است ۔۔۔ ہیں مسلّم عاشقی کے فن میں ہم

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن ۔۔۔ آخر اس بزم میں کوئی تو سخن داں ہوگا۔

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر ۔۔۔ مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

مومن کے ان مقطعوں پر غور کرنے سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو بڑی وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں اور ان کے نظریات پوری طرح ان مقطعوں میں جھلکتے ہیں۔

مومن و غالب ہی نہیں بلکہ تمام اہم شعراء کے مقطعے کم و بیش انھیں خصوصیات کے حامل ہیں۔

حسرت موہانی کے مقطعوں میں بھی ان کی شخصیت اور ان کے پاکیزہ و بلند تصور عشق کی تصویر ملتی ہے اور اس شوخی، رنگینی اور نزاکت خیالی کا بھی پتہ چلتا ہے جو حسرت کا مخصوص مزاج تغزل تھا۔

حسرت بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند ۔۔۔ مجھ کو تو مفت لوگوں نے بدنام کر دیا

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں ۔۔۔ مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

یہ جو اک درد محبت کی خلش ہے حسرت ۔۔۔ مقصد دل ہے یہی جان تمنا ہے یہی

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت ۔۔۔ ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت ۔۔۔ اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

تونے کی حسرت عیاں تہذیب رسم عاشقی ۔۔۔ اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

ظفر کے مقطعے بھی ان کے یاس کی تصویر کشی کرتے ہیں اور ان کے رنگ شاعری کا مظہر ہیں۔ چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

مدفن معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ۔۔۔ ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا — جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

گردش ایام کے ہاتھوں سے اب کیا اے ظفر — ساتھ تیرے کب میسر ہے مے نوشی مجھے

منزل عشق بہت دور ہے اللہ اللہ — ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفر بیٹھ گئے

دل گیا صبر گیا، درد رہا، رنج رہا — ہم نشیں اپنے ظفر چند گئے چند رہے

ہم اسی کی بات کے قائل ہیں اے ظفر — بھلا کہا جسے منہ سے اُسے بُرا نہ کہا

ظفر نہ تو میں ان کا حبیب ہوں ظفر نہ تو میں انکا رقیب ہوں — جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

اب میر صاحب کے چند مقطعے پیش کرتا ہوں، جو ان کی شخصیت، ان کے رنگ تغزل اور ساتھ ہی ساتھ ان کے یاس کے ترجمان ہیں

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

تھا تو وہ رشک حور بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اب کچھ مقطعے جگر کے ملاحظہ ہوں جو ان کے مخصوص تغزل کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

قید ہستی سے کب نجات جگر — موت آئی اگر حیات گئی

میں اس مقام عشق سے گذر رہا ہوں اے جگر — ظلمتیں بھی جہاں تجلیاں لئے ہوئے

زندگی جس سے عبارت ہے جگر — وہ کسی کی اک نگاہ ناز ہے

کچھ مقطعے شاد عظیم آبادی کے پیش کرتا ہوں جس میں ان کے رنگ کی جھلک بھی ہے اور وہ ایک خاص کیفیت بھی جو تصوف اور حقائق کی ترجمانی سے ہم کو ان کے یہاں نظر آتی ہے۔

کجا میں اور کجا اے شاد دنیا — کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

ملے یار کہیں شاد کو تو یہ چاہتا ہے کہ درد دل — وہ کہا کرے یہ سنا کرے یہ کہا کرے وہ سنا کرے

کدورت سے دل اپنا پاک کر اے شاد پیری میں — کہ جس کو منہ دکھاتا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

فانی کے مقطعوں میں ان کا مخصوص رنگ اور یاس و نا امیدی غالب ہے ان کے مقطعے ہی دیکھ کر ان کے امام یاسیات ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی — ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن — غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی — دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

غم نصیبوں میں ہے فانیؔ غم دنیا ہو کہ عشق	دل کی تقدیر ہے تدبیر بدل جاتی ہے
زیست تھی فانیؔ نقد بفرصت تمہید شوق	عمر بھر ہم پرتو نور لبشر دیکھا کئے
میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات	جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے
جب دیکھئے جی سیا ہے فانیؔ	اللہ رے اس کی سخت جانی
فانیؔ کی زندگی کیا تھی یا رب	موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

یہ مقطعے فانیؔ کی زندگی وشاعری دونوں کے بہترین ترجمان ہیں اور زندگی کرجن مایوس نگاہوں سے وہ دیکھتے ہیں ان کے یہ آئینہ دار ہیں

میرا مقصد ہر شاعر کے مقطعے الگ الگ پیش کرنا نہ تھا بلکہ کچھ شعراء کے یہاں سے ایسی مثالیں دینی میرا اصل منشا تھا جو اپنے مقطعوں میں پوری طرح اظہار شخصیت کرتے ہیں۔ اردو کے تمام ہی غزل گو شعراء تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس خصوصیت کے حامل ہیں۔ سطور بالا میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، حسرتؔ، جگرؔ، فانیؔ، شادؔ وغیرہ قدیم وجدید شعراء کے مقطعے آپ کے سامنے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جو بات میں نے پیش کی ہے یہ اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جب ہم کسی غزل گو شاعر کا کلام پڑھیں اور جہاں دوسری خصوصیات پر نظر ڈالیں۔ وہاں ہم کو یہ بھی دیکھنا لازم ہے کہ اس کی فنی عظمت کہاں تک اس کے مقطعوں میں نمایاں ہے۔ غور و فکر سے بحقیقت ہم پالیں گے کہ اردو غزل کے مقطعوں میں خاص طور سے یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں رچ بس جائیں اور ضرب الامثال بن سکیں۔

رضی مشہدی اور داراشکوہ

رضی مشہدی دربار داراشکوہ کا شاعر تھا۔ اس کا ایک بہت مشہور شعر ہے :۔

تاک راسر سبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرۂ تامے تواند شد چرا گوہر شود

داراشکوہ نے یہ شعر سن کر اس کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ داراشکوہ نے جو قادری تخلص کرتا تھا، خود بھی اس شعر کے جواب میں یہ شعر کہا۔

سلطنت سہل ست اوا آشنائے فقر کن ٭ قطرۂ تامے تواند شد چرا گوہر شد

لیکن نوبہ بہار کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ داراشکوہ نے پہلے مصرع میں ردوبدل کر کے پورے شعر کو مہمل بنا دیا، حالانکہ داراشکوہ بڑا اچھا شعری ذوق رکھتا تھا۔

داراشکوہ کے دو شعر سنئے :۔

ہر خم و پیچے کہ شد از تاب زلف یار شد	دام شد، تسبیح شد، زنجیر شد، زنار شد
گر مصور صورت آں جان جاں خواہد کشید	حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

امیر خسرو (بسلسلہ ماہ ستمبر)

ڈاکٹر تارا چند ——— مترجم ——— نظیر حسین

امیر خسرو یہاں کی موسیقی کے متعلق لکھتے ہیں کہ: ہند کا سنگیت سارے جہاں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، دنیا بھر کے لوگوں نے اسے یہاں سے سیکھا ہے لیکن
ہنر ایسا ہے کہ تیس چالیس سال ریاضت کرنے پر بھی اس کی سبک آواز کو ادا کرنا مشکل ہے، اس سنگیت میں
ایسی کشش ہے کہ ہرن سن کر بیہوش ہوجاتا ہے، بے تیر و کمان کے سنگیت کا طنطنہ اس کے دل میں پیوست ہوجاتا
ہے اور بیچارہ جان دے دیتا ہے، فرق دیکھیئے عرب کا اونٹ حدی خوان کی آواز سنتا ہے تو اور تیز تیز چلتا ہے، لیکن
ہرن ہندی گانے سے ایسے حواس کھوتا ہے کہ مرنے کی نوبت آجاتی ہے۔

ہندوستان کے علم و فن سے مذہب کی طرف آتے ہیں، کہتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ ہندو ہماری طرح دیندار
نہیں ہیں پھر بھی ہمارے اکثر مسئلوں کا اقرار کرتے ہیں جن اصولوں پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں :۔ وحدت ۔ ہستی ۔
قدامت ۔ عدم سے ایجاد کی قدرت ۔ رزق دینے والے کا وجود جو ہنرور اور بے ہنر کو رزق دیتا ہے، ہر بے جان کو جان
دیتا ہے اور واپس لیتا ہے، وہ خالق ہے اور اس کی حکمت اور علم ازلی اور ابدی ہے وہ اپنے کاموں پر اختیار رکھتا
ہے اور عملوں کے کرنے نہ کرنے کا مجاز ہے۔

ہندو مذہب کا اور فرقوں سے موازنہ یوں کرتے ہیں ۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، ہندو
ان سے کہیں بہتر اور نیک تر ہیں، دوسرے وہ ہیں جو وجود کی ہستی کے قایل نہیں لیکن برہمن اس کی ہستی کا یقین رکھتے
ہیں تیسرے دوئی میں یقین رکھنے والے ہیں، لیکن ہندوؤں کو اس قسم کے نظریوں سے کوئی تعلق نہیں، پھر ایک فرقہ جسم
حقیقی سمجھتا ہے مگر برہمن ان کا ساتھ نہیں دیتے، آخری فرقہ سات الٰہوں کو انتا ہے لیکن ہندو توحید کا قایل ہے اور سات
کا انکار کرتا ہے، عنصری فرقہ چار خداؤں کا گمان رکھتا ہے، مگر ہندو کہتا ہے ایک حق ہے اور اس پر قایم ہے، مشبہوں کا فرقہ
تشبیہ کی طرف مایل ہے، ہندو تنزیہ کی طرف ۔ ایک فرقہ نور اور تاریکی کی تفریق کا قائل ہے لیکن ہندوؤں کو ان سے کوئی لگاؤ
نہیں، برہمن اعتراف کرتا ہے کہ اس کا معبود ایسا ہے کہ اس کا مثل ممکن نہیں، اگرچہ ہندو پتھروں اور جانوروں، سورج
اور درختوں کو پوجتے ہیں تو وہ ان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور دیو یا دیوصورت مان کر پرستش کرتے ہیں، لیکن ان کی پرستش
بزرگوں کی تقلید ہے، جسے وہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے، اخیر میں اس شعر پر بحث ختم کر دیتے ہیں:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے — من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

پھر اپنے ذاتی مذہب کے بارہ میں صاف صاف بتا دیتے ہیں :-

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے آرے میکنم با خلق عالم کار نیست

یہاں تک تو میں نے خسرو کے کلام کے اس حصہ پر توجہ دلانے کی کوشش کی جس کا براہ راست ہند اور ہند کی

تہذیب کے ساتھ تعلق ہے، اس مقالہ کے دوسرے جزو میں کچھ اور موضوعوں پر بحث کی ہے۔ خسرو کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجھے ڈر ہے اگر میں اس پر کچھ لکھوں تو مضمون اتنا بڑھ جائے گا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے گا اتنا کہہ دینا کافی ہے، خسرو کے یہاں شعریت کی تمام خوبیاں درجۂ کمال پر ملتی ہیں، خسرو صنائع و بدائع کے استاد اور نئی صنعتوں کے موجد ہیں، تشبیہ اور استعارہ میں مشکل سے کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا ہے، انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور اسے اس خوبصورتی کے ساتھ نبھایا کہ باید و شاید۔ رزم کے بیان میں انتہائی جوش و خروش ہے۔ بزم کی تصویروں میں دلوں کو موہ لینے والے روپ رنگ، حمد و نعت اور پند و نصیحت کو نظم میں ایسا باندھا ہے جیسے لڑیوں میں آبدار موتی پرو دیئے ہوں عشق و محبت کی داستانیں، برہ اور ملن کی کہانیاں درد بھرے لطف کے ساتھ سناتے ہیں اور دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں

خسرو کی شاعری ہندوستانی

فضا میں پروان چڑھی اس میں ہندوستانی رنگ چوکھا آیا لیکن اس وقت موقع نہیں کہ اس طرف زیادہ دھیان دیا جائے میں اس صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ خسرو کے کلام میں حکمت۔ سیاست اور تصوف کے کیسے کیسے بے بہا رتن ہیں، اس زمانہ کے ہندوستانیوں کا اخلاق کن بنیادی قدروں پر قائم تھا، سیاست کے کون سے اصول تھے جن پر حکومت کا دار و مدار تھا کس قسم کے عالمگیر نظریئے تھے جو زندگی کو معمول کی سطح سے اونچا اٹھاتے تھے اور انسانی ذہنیت کو جلا دیتے تھے، کون سے اعتقاد تھے جو جیون کی ناؤ کو لہروں کے تھپیڑوں اور ہواؤں کے جھونکوں کے باوجود کنارے کی طرف لے جاتے تھے۔

مثنوی شیریں، خسرو میں شب عروس کے ہیجان انگیز بیان کے بعد جب پڑھتے ہی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور زبان لڑکھڑا جاتی ہے، دفعتاً کلام کا رخ بدلتا ہے اور حکمت و دانش کی مجلس آراستہ ہوتی ہے، عشق اور کامرانی، نغمہ و شراب کی گرما گرمی سے طبیعت بھرتی ہے اور علم و دانش کا چرچا ہونے لگتا ہے، ندیموں میں ایک صاحب بزرگ امید نام ہیں جن سے خسرو سوال کرتا ہے اور وہ جواب دیتے ہیں، اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس کا خاکہ کھینچ دیتے ہیں، جو حد درجہ دلچسپ ہے، سوال و جواب سننے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سب کے لئے میرے پاس وقت نہیں، چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال تو وہی پرانا مسئلہ ہے جو انسانی تاریخ کی ابتداء سے آج تک ہمارے دماغوں کو پریشان کر رہا ہے یعنی دنیا جہان کی پیدائش کا مسئلہ، خسرو نے اس زمانہ کے فلسفہ کی روشنی میں جواب دیا ہے، جواب یہ ہے کہ حقیقت اولیٰ سے عقل اول ظہور میں آئی اور اس سے دو حیثیاں واجب اور ممکن، د جب سے ترتیب وار اور دس عقلیں ظاہر ہوئیں جن سے دسویں عقل فعال ہے، اور ہستی امکانی سے نو آسمان جو زحل۔ کیوان۔ برجیس۔ مریخ۔ خورشید۔ زہرہ۔ سیاروں اور چاند کی سیر کے میدان ہیں۔ ارسطو کے وقت سے عالم کی پیدائش کا یہی نظریہ تھا جسے یورپ کے سولھویں صدی کے ستارہ شناسوں نے پلٹا اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی، اس طرز پر چار عنصروں کا سوال حل کیا ہے، لیکن پوچھیئے یہ عنصر کس اصلی مادہ سے نکلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عقل اس کے سمجھنے سے معذور ہے، پھر پانچوں عنصر کا ذکر کرتے ہیں یعنی مٹی۔ ہوا۔ پانی۔ آگ اور ایتھر اور ان کی صفتیں بتاتے ہیں ان میں آگ اور ہوا کا مرتبہ باپ کا اور مٹی کا ماں کا ہے ان سے موالید ثلاثہ ظہور میں آتے ہیں جن کے نام معدن۔ نبات اور حیوان ہیں اور ان کی بہترین اولاد آدمی ہے، آدمی سے کیا مراد ہے؟ جواب دیتے ہیں:-

غرض گر شہوتست و خورد و آشام | خراں راہم تواں کرد آدمی نام
اگر در سیم و زر کس تیز چنگ است | ستورے داں کہ زیر بار لنگ است
گرش گنج و در باشد جہانی | چو در بینی بود محتاج نانی
چو ایں سرمایہ نبود با خرد جفت | نشاید بے خرد را آدمی گفت
پس آنکس مردم آمد ز آفرینش | کہ ہستش بر خرد قانون بینش

یعنی اگر آدمیت سے مراد محض کھانا پینا اور اولاد پیدا کرنا ہے تو گدھے کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں، اگر کوئی سونے چاندی میں تیز ہے تو وہ اس جانور کی مثال ہے جو ٹانگ سے لنگڑا ہے۔ اگر روپیہ پیسہ ہو، دنیا ہو تو اس کے اندر آدمی روٹی کا محتاج ہے چونکہ سرمایہ کا عقل سے جوڑ نہیں اس لئے بے عقل کو آدمی کہنا زیب نہیں دیتا اس کو اس عالم میں آدمی کا مرتبہ دے سکتے ہیں جس کی زندگی کے مقصد عقل کے قانونوں سے بندھے ہیں۔

اس مضمون کو سنسکرت کا شاعر اس طرح باندھتا ہے:۔

येषां न विद्या न तपो न दानम्
ज्ञानं न शीलं न गुणो न धर्मः।
ते मृत्युलोके भुवि भारभूता
मनुष्यरूपेण मृगाश्चरन्ति॥

یعنی جن کے پاس نہ ودیا ہے نہ تپ (ریاضت) اور نہ دان، نہ گیان ہے نہ شیل نہ گن ہے نہ دھرم وہ لوگ اس دنیا میں زمین کا بوجھ ہیں، آدمی کے روپ میں چلتے پھرتے جانور ہیں۔

عقل کیا چیز ہے؟ اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو چیز انسان کو عاقبت یعنی آیندہ کی طرف مائل کرے اور اپنے ولی نعمت کی یاد دلائے، کچھ اور سوالات کے بعد سوال ہوتا ہے کہ خیال کی کیا حقیقت ہے؟ جواب یہ ہے کہ روح چھپا ہوا راز ہے اسے کوئی جانتا نہیں لیکن دماغ معنی کا آئینہ ہے جس میں ذہنی اور خیالی طاقت ہے یہ آئینہ بالکل صاف اور بے رنگ ہے اور اس میں روح کے فیض سے عکس پیدا ہوتے ہیں، موجود اور غیر موجود چیزیں اس پر تصویریں بناتی ہیں جیسے موم پر نقش اور زمین، آسمان، سورج اور ستارے موتیوں کی طرح اس جہانی سندر کو بھر دیتے ہیں لیکن یہ سب اصلی معنی کی تصویریں ہیں جو آئینہ میں منعکس ہیں۔

بادشاہ کا بزرگ امید سے آخری سوال ہے حکومت کے متعلق بادشاہوں کا کیا دستور ہونا چاہیے؟۔ یہیں سے خسرو کے سیاسی نظریوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو خسرو و شیریں تک محدود نہیں اکثر مثنویوں میں پھیلا ہوا ہے۔

خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں لیکن اپنے ہموطنوں کے مذہب اور تمدن کا بلا تفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب، سنسکرت اور ہندی زبانوں اور ہندو رسموں اور رواجوں کا بیان محض رواداری سے نہیں طرفدار کے نقطۂ نظر سے کیا ہے، مثال کے طور پر منگولوں کا بیان دیکھیے، ان کے چہرے سڑے کیڑوں جیسے ہیں جن میں جھریاں اور سلوٹیں پڑی

ہیں، ناکیں اتنی چوڑی ہیں کہ چہرے کے ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہیں، قبر کی طرح گندی اور بھٹی کی طرح پانی سے بھری ہیں، منھ پھٹے ہیں اور ان سے رال بہتی ہے، ناک کے بال ہونٹوں تک لٹکتے ہیں اور مونچھیں نہایت لمبی لمبی ہیں، داڑھی ٹھوڑھی پر پھیلی ہے کیونکہ ان کے برفانی چہروں پر سبزہ نہیں اُگ سکتا، سفید سینہ اتنا جوؤں سے بھرا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اوجڑ زمین پر کالے تل پھیلا دئے ہیں، پیٹھ کی کھال کمخت جیسی سخت اور گدی کا چمڑا جوتے کے قابل ہے، آدھا بدن کھال کے لباس سے چھل گیا ہے اور آدھا سر جوؤں کے ڈر سے گھوٹ دیا ہے، ان کی خوراک قے سے بدتر اور ان کے بدن چوڑی ہڈی کے کفنوں کی مانند ہیں۔ غرض منگول صورت اور سیرت سے نہایت مکروہ سے ہیں، منگولوں کی جیسی درگت کی ہے اس حد تک تو نہیں لیکن حکومت کے جتنے دشمن تھے ان سب کے لئے لعن اور تشنیع کے کلمے استعمال کئے ہیں، جراٗت کے راجہ کو رائے بد، سمانہ کے سیتل دیو کو اہرمن۔ ورنگل کے راجہ کو ابلیس۔ ویرپانڈیا کو رائے گمراہ اور گبرین، اسی طرح قلیع خواجہ کو ملعون کافر کہا ہے۔ بعض موقعوں پر لکھا ہے کہ دنیا ہندوؤں سے خالی ہوگئی۔ ظاہر ہے یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ سب ہندوؤں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس جگہ کہنا صرف یہ ہے کہ ہندو راجے مہاراجے مطیع اور فرماں بردار ہوگئے اور دہلی کے بادشاہ کو باج اور خراج دینے لگے جہاں لفظ ہندو سے مذہب کی طرف اشارہ ہے وہاں وہی رواداری اور حقیقت نگاری ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس سلسلہ میں قرآن السعدین کی ایک مشہور غزل کے چند شعر دلچسپی سے خالی نہیں :-

اے دہلی اے بتانِ سادہ،	پگ بستہ و چہرہ کج نہادہ
فرماں بزند از انکہ ہستند،	از غایت ناز خسرو مرادہ
خورشید پرست شد مسلماں	زیں ہندوگاں شوخ و سادہ

ہندو رسموں کی بھی رعایت منظور تھی چنانچہ ستی کے بارہ میں کہتے ہیں :-

چوں زنِ ہندی کسی در عاشقی دیوانہ نیست	سوختن بر شمع مُردہ کار ہر پروانہ نیست
گرچہ در اسلام روانیست چنیں،	لیک چو بس کار بزرگست بہ بیں
گرچہ شریعت بود ایں نوع روا	جاں بدہند اہل سعادت سوا

خسرو کے سیاسی خیالات کے اور پہلو بھی غور طلب ہیں، حکومت کے متعلق ان کا نظریہ ہندوستانی اور ایرانی عقیدوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں راجہ کا درجہ بہت اونچا مانا جاتا ہے، راجہ سے اگر کوئی اوپر ہے تو ایشور۔ کالیداس نے رگھو خاندان کا سورج دیوتا سے رشتہ ملایا ہے اور تعریف میں ایسے بلند آہنگ اور پُرشکوہ لفظ استعمال کئے ہیں کہ ذہن پر عجیب اثر پیدا کرتے ہیں :-

(सोऽहं) आजन्म शुद्धानम् आफलोदय कर्मणाम् ।
आसमुद्र क्षितीशानाम् आनाक रथ वर्त्मनाम् ॥
यथा विधि हुताग्नीनाम् यथा कामार्चितार्थिनाम् ।
यथापराध दण्डानम् यथा काल प्रबोधिनाम् ॥

त्यागाय संभृतार्थानाम् सत्याय मितभाषिणाम् ।
यशसे विजिगीषूणाम् प्रजायै गृहमेधिनाम् ॥

یعنی یہ خاندان نسب سے صحیح اور پاکدامن اور اپنے کاموں میں ہمیشہ کامیاب ہے، سمندر کے کناروں تک زمین کا حاکم ہے اور آسمان کے افق تک اس کی سواری کا میدان پھیلا ہے، عبادت میں شرع کا پابند، خیرات میں آرزوؤں کا پورا کرنے والا، مجرموں کو سزا دینے اور وقت کی پابندی میں سختی سے کاربند ہے، دولت اس غرض سے جمع کرتا ہے کہ احتیاج مندوں میں تقسیم کر دے۔ کم گو اس لئے ہے کہ سچائی ہاتھ سے نہ جائے، ملکوں کو شہرت کی خاطر فتح کرتا ہے اور اولاد کے لئے خانہ داری کے فرض ادا کرتا ہے۔ کالیداس کے ساتھ ساتھ خسرو کے شاعرانہ تمجید کے شعروں پر کان لگایئے، علاؤالدین کو جن لفظوں سے مخاطب کرتے ہیں، ان میں وہی تان ہے جو سنسکرت میں سنائی دی ہے، سنسکرت اور فارسی کے آہنگ میں لفظ مدوزہ نے جو شان پیدا کر دی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ فرماتے ہیں:-

شہا گنج بخشا کرم گسترا | معاصی شناسا سخن داورا
مرا عمر کز سقف بالا گزشت | ہمہ پیش شاہاں دالا گزشت
زشاہان کسے اولم یاد کرد | معزالدنیا بود شہ کیقباد
ازاں بس کہ در شہ ستائی شدم | تونگر ز گنج علائی شدم

اور کیفِ تعریف یوں کرتے ہیں:-

کہ ہست از عون وعدل و بذل و احساں شہ عالم | جہاں بنیم اماں محکم طرب بے حد خوشی بے حد
سرافراز و سرانداز و جہانگیر و مخالف کش | ظفریاب و نگہبانش و جہاں بخش و کرم گستر

اس دھن میں تمام بادشاہوں کو سراہتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ بلبن اور علاؤالدین جیسے رعب اور دبدبہ والے بادشاہوں کے لئے بھی وہی زور دار لفظ ہیں اور کیقباد جیسے عیش پسند اور جلال الدین جیسے نرم دل سلطانوں کے لئے بھی وہی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ کی ذات اور حکومت کی قوت کو ایک سمجھا جاتا تھا، جو قوت کا حامل ہو وہ ہی خدا کا سایہ، دین کا پشت و پناہ، قطب دنیا، جہاں کشا، رعایا کا نگہبان اور ملک کا محافظ تھا، چونکہ تعریف کا موضوع بادشاہت ہے نہ کہ بادشاہ اس لئے سب کے ایک ہی طرح گن گاتے ہیں۔ یہی وصف ہندوستان کے مہاراج ادھیراجوں میں اور یہی ایران کے کسریٰ اور نوشیرواں میں ملتے ہیں۔

خسرو کے وقتوں میں خلافت پر زوال آچکا تھا ہلاکو نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا اور عباسی خاندان کا خاتمہ کر دیا تھا، اس صدی میں خسرو تھے یہ کہنا مشکل تھا کہ خلیفہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سلطانوں کا مرتبہ شاہنشاہیت کی حد تک اونچا ہو گیا اور ہندوستانی تصوروں کے نزدیک آگیا، خسرو کے کلام میں خلافت کا کہیں نام نہیں ملتا۔ لیکن جہاں بادشاہوں کی ستایش میں قصیدے کہے ہیں وہیں نصیحتوں کے بھی دفتر کھول دئے ہیں، سب سے زیادہ زور عدل پر ہے۔ فرماتے ہیں:-

نخست از مملکت برپائے خواہی | بنا بر عدل دارد بادشاہی

تاجوراں را بہر اندیشۂ نیست بہ از داد گری پیشۂ
تا توانی بدین و داد گرائے کہ بود ملک زیں دو پایہ بپای

بادشاہ سے کہتے ہیں عدل ہی تمھارا حرزِ جاں ہے اور یوں نصیحت کرتے ہیں:۔

عدل سرمایۂ تاج و تخت ترا چرخ بازیچۂ طفل بخت ترا
شحنۂ عدل ست از رعایت خویش گرگ را دادہ آشتی با میش

اور آگاہی بھی یوں دیتے ہیں:۔

ورچہ کس نیست دشمنِ تن تو غفلت تو بس ست دشمنِ تو
در پیہ صد پاسباں بوند از پس پاس تو بہ ز تو ندارد کس
بر چنیں پایہ کاستواری تست پاسباں تو ہوشیاری تست

خسرو کے نزدیک بادشاہ کے اوصاف میں یادِ خدا، خوش خلقی، نیکی، راستی، فروتنی، قناعت، مظلوموں کی دادرسی، مفلس نوازی وغیرہ شامل ہیں، غرض یہ کہ بادشاہ جس کا نام ہے اسے انسان کامل ہونا چاہئے۔

خسرو کے کلام کا خزانہ بے پایاں ہے علم اور معرفت کے جواہرات سے مالا مال ہے۔ ایک مقالہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ اس ساری دولت کو سمیٹ سکے، چند آبدار موتیوں کو رول کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔

اب اس صحبت کو ختم کرتا ہوں لیکن بڑی کمی رہ جائے گی اگر ایک اور جواہر پارہ کی طرف دھیان نہ دوں۔ خسرو اور تصوف کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا واسطہ ہے کہ اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے تو مضمون ادھورا رہ جاتا ہے، لیکن تصوف بڑا موضوع وسیع ہے اور اس کے لئے ایک علٰحدہ مقالہ کی ضرورت ہے یہاں ایک مختصر خاکہ پر ہی قناعت کرتا ہوں۔

تصوف کے متعلق تین جدا جدا مسلک نظر آتے ہیں، ایک مسلک کے پیرو وہ لوگ ہیں جو شریعت کو طریقت سے برتر مانتے ہیں اور تصوف کو گمراہ کرنے والا طریقہ اور مذہب کے لئے خطرناک راستہ سمجھتے ہیں، دوسرے مسلک کا عقیدہ ہے کہ معرفت ہی مذہب کی اصل ہے، شریعت فقط ظاہری رنگ روپ۔ تیسرا گروہ شریعت اور طریقت میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں دیکھتا اس کے نزدیک شریعت وہ حدیں قایم کرتی ہے جن کے اندر رہ کر انسان کو زندگی بسر کرنا چاہئے، البتہ طریقت کے ذریعہ حق باطل پر فتح پاتا ہے، ضمیر نفس پر غالب ہوتی ہے، آدمی اپنے کو پہچانتا ہے اور اس مقام پر پہونچتا ہے جو اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے۔

خسرو اسی تیسرے مسلک کے حامی تھے وہ شریعت کے سختی سے پابند تھے مگر ان کا ذہن تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، نظام الدین اولیاء کی تعلیم ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی تھی، وہ اپنے مرشد کو غوث عالم، نظامِ ملت دین، قطب ہفت آسمان و ہفت زمین، رہبر پیشیں ہیں، نائب مصطفٰے وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں:۔

ملک وحدت بنام ایشان ست بندہ خسرو غلام ایشان ست

سالک کا راستہ یہیں سے شروع ہوتا ہے یہی تصوف کی پہلی منزل ہے، مرید کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے کو پیر کے سپرد کر دے اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس کے حکم کی پیروی کرے۔

صوفی فلسفہ میں خدا اور پیغمبر کے تصور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خسرو نے ان کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں وہ اس فلسفہ کی نمایندگی کرتے ہیں، خدا کی صفتوں کے بیان میں انھوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

واجب اول، نورالعین، وراالورا، ہستیِ مطلق، اول و آخر، فکر اور ادراک سے پرے، علت و معلول سے دور، فطرت ہستی کو بے سبب اور بے اسباب بنانے والا، تصور اور خیال چون وچرا کی گزر سے آگے، مکان اور زمان کا خالق وغیرہ وغیرہ۔

کہتے ہیں :-

کرد خسرو وحدت او را سجود　　ثانی او ممتنع اندر وجود،
بی ہمہ جا و ہمہ جا درون،　　در ہمہ جا و ز ہمہ جا برون

یہی ہندو ویدانت کا تصور ہے، برہم سروویاپی اور انترامی ہے، صوفیوں نے محمدؐ کو ذات کا مظہر اول مانا ہے، خسرو اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں :-

اللہ و محمدؐ ست پیوستہ بہم　　یعنی کہ میان شان نگنجد دگرے
نور تو نہ گنجید چو در یک عالم　　بہر تو خدا کرد دو عالم پیدا

یہ خیال ہندوؤں میں بھی ہے وہ اوتار کو ایشور کا مظہر مانتے ہیں، اوتار کو خدا کا نزول سمجھتے ہیں بھگوت گیتا میں کہا ہے :-

यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत ।
अभ्युत्थानम् अधर्मस्य तदात्मानम् सृजाम्यहम् ॥
परित्राणाय साधूनाम् विनाशाय च दुष्कृताम् ।
धर्म संस्थापनार्थाय सम्भवामि युगे युगे ॥

یعنی اے ارجن، جب جب مذہب پر زوال آتا ہے، لا مذہبی زور پکڑتی ہے تب میں آپ کو ظاہر کرتا ہوں، نیک لوگوں کی حفاظت کے لئے، بدکاروں کی ہلاکت کے لئے اور مذہب کی تقویت کے لئے میرا ظہور ہوتا ہے۔

خسرو بتلاتے ہیں کہ نورِ محمدی کا جب ظہور ہوا تب عدم کی تاریک رات ختم ہوئی، اس نور کی روشنی نے ہستی کی رہنمائی کی پھر ایک کے بعد ایک آدمؑ، خضرؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ، عیسیٰؑ رسول آئے اور آخر وہی نور مصطفےٰ کے روپ میں نمودار ہوا۔

خسرو کی نگاہ میں مرشد کا درجہ نہایت بلند ہے، اسے نسخہ دیباچہ پیغمبری کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔ منو نے لکھا ہے :-

आचार्यो ब्रह्म लोकेशः ।
गुरु शुश्रूषया त्वेवं ब्रह्मलोकं समश्नुते ॥

یعنی مرشد عالمِ جاودانی کا بادشاہ ہے، گرو کی خدمت ہی سے عالم جاودانی کی رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

آدمی کا رتبہ خدا کے نائب اور خلیفہ کا ہے وہ خدا کے خزانہ کی کنجی ہے لیکن وہ اس بلند مرتبہ پر اس وقت فائز ہو سکتا ہے جب ہمت کے ساتھ قدم بڑھائے۔

ہیچ کسی رہ سوئے بالا نیافت — تا قدم از ہمت والا نیافت

اس راستہ میں چار منزلیں آتی ہیں، یعنی ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت جو انھیں طے کرلیتا ہے وہ اس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں اس کی روح سب دنیوی الائشوں سے پاک اور نور ابدی سے معمور ہو جاتی ہے۔ ان منزلوں کو ہندو فلسفہ میں چار نام دئے ہیں یعنی جاگرت، سوپن، سوشپتی اور تریا۔ پہلی صورت انسان کا وہ شعور ہے جو اسے دنیا کے علایق میں پھنسا دیتا ہے۔ دوسری عالم رویا کے مانند ہے، جس میں آدمی سپنوں کی دنیا میں گھرا رہتا ہے، تیسری منزل اس گہری نیند کی ہے جہاں شعور خاطرات کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے، چوتھی منزل پر نور علیٰ نور کا سماں بندھ جاتا ہے اور یہی صوفی کی تمام کوشش اور عمل کا سرانجام ہے۔ خسرو کہتے ہیں:-

نے کلیم نے بلبلم نے شمع نہ پروانہ ام — عاشق حسن خودم بر حسن خود دیوانہ ام

خسرو کا کلام ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے اور اس میں ایک ملی جلی تہذیب کے نقش نمایاں ہیں اگرچہ سو سال گزرنے پر بھی خسرو کا پیغام ہمارے لئے وہ مشعلِ ہدایت ہے جو منزلِ مقصود کی طرف ہماری رہبری کر سکتا ہے۔

شاہ نصیر لکھنؤ میں

انصار اللہ نظر

جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی مدظلہ کا مرتب کردہ تذکرہ دستور الفصاحت دیکھ کر بعض باتیں وضاحت طلب معلوم ہوئیں۔ اور کچھ خیالات ذہن میں پیدا ہوئے۔ وہی قلمبند کر رہا ہوں۔

دیباچہ کے صفحہ ۹۲ پر مدائح الشعرا کا ایک اقتباس نقل ہوا ہے اس میں یہ جملہ بھی ہے۔ "در سنہ یکہزار و دو صد و شصت ہجری نبوی(ص) بہ ریاض روضہ رضوان انتقال فرمود و حضرت ظل اللہ جہاں پناہ میرزا محمد سلیم بہادر بر تخت جہاں افروزی متمکن گشتند"۔ حاشیہ پر مولانا عرشی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے "اکبر شاہ ثانی کا سال وفات ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) ہے کتاب میں ۱۲۶۰ھ مصنف یا کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے"۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نام میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ میرزا سلیم فرزند اکبر شاہ کا انتقال باپ کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ ان کے تخت نشین ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکبر شاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی بادشاہ ہوئے۔ امام بخش صہبائی نے تاریخ کہی۔ تاریخ جلوس آں شہ والا قدر آمد بلب

خورد "چراغ دہلی" ۱۲۵۳ھ اور بیت سکہ بھی قرار پایا

سراج الدین ابوظفر شہ بہادر شاہ
بسیم و زر زدہ ست سکہ بہ فضل الہ

تعجب یہ ہے کہ مولانا عرشی صاحب نے خود (ص؟) یہ عبارت تحریر فرمائی ہے۔ "دہلی میں میرزا احمد سلیم بہادر، بہادر شاہ ثانی کے لقب سے اور لکھنؤ میں ثریا جاہ امجد علی شاہ کے لقب سے برسر حکومت تھے (دیباچہ دستور ص ۶۹) میرا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی میرزا سلیم کی جگہ میرزا ابوظفر نام ہونا چاہئے۔"

اسی دیباچہ کے صفحہ ۸۵ پر ایک جملہ یہ ہے۔ "خود انھیں نے ریاض الفصحا میں محمد حیات جتناب کے ذیل میں لکھا ہے: در ایامی کہ فقیر ...... الخ" یہ اقتباس مطبوعہ ریاض الفصحا میں کہیں نہیں ہے البتہ عقد ثریا کے صفحہ ۱۳ پر ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ سہو کتابت ہو۔ بنیادی طور پر جو بات خصوصاً غور طلب معلوم ہوئی وہ شاہ نصیر کے سفر کا حال ہے۔ تحقیق کا کام جس قدر دشوار ہے ظاہر ہے۔ اور مجھ جیسے شخص کے لئے تو یہ اور بھی دشوار ہے۔ حضرت عرشی مدظلہ کی شخصیت اس میدان میں ممتاز اور مسلم ہے۔ میں نے ان سطور کو محض اس لئے اشاعت کے لئے بھیجنا مناسب جانا کہ اگر میرے خیالات صحیح ہوں تو بہتر ہے ورنہ کم از کم میری اصلاح ضرور ہو جائے گی۔

شاہ نصیر الدین نصیر دہلی کے نامور استادوں میں تھے۔ حکیم مومن اور شیخ ذوق جیسے استادوں نے بھی انھیں کے دامن تربیت سے فیض پایا تھا۔ آخری تاجدار دہلی میرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی نے بھی ابتداءً انھیں سے مشورہ سخن کیا تھا۔ شاہ صاحب نے لکھنؤ کا سفر کئے اور سفر آخرت بھی وطن سے دور ہی کیا۔ اس موقع پر ہم ان کے لکھنؤ کے مختلف سفروں کا ذکر کریں گے۔

حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی نے شعرائے اردو کا ایک قابل قدر تذکرہ "دستور الفصاحت" کے نام سے مرتب کیا تھا جسے مخدومی امتیاز علی خاں صاحب عرشی مدظلہ نے اس کو نہایت محنت اور خلوص کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ موصوف کی تحقیق کے مطابق یہ

تذکرہ سنہ ۱۲۱۳ھ میں لکھا گیا، پھر سنہ ۱۲۲۹-۳۰ھ میں مصنف نے اس پر نظرِ ثانی اور اضافے بھی کئے۔ سنہ ۱۲۴۹ھ میں شیخ رمضان علی لکھنوی نے اس کو صاف کرنے کا اقرار کیا تو مصنف نے پھر اس پر نظر کی اور کچھ مزید اضافے کر دیے۔ اس تذکرہ میں وہ لکھتا ہے۔

"شاعر دلآویز تقریر شاہ نصیر متخلص بہ نصیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احوال آں آنچہ مسموع شدہ بہ قلم آمدہ است و دروغ برگردنِ راویان ....
گویند کہ در سال گذشتہ بنا بر تلاش پسر خودش کہ گریختہ بود بہ لکھنؤ آمدہ در مشاعرہ ہائے میرزا قمر الدین احمد خاں بہادر حاضری شد و شعر خوانی می کرد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دکسے پسند نکرد واللہ اعلم" [دستور: ۱۱۲]

اس موقع پر مرزا قمر الدین کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ یکتا کے قدیمی کرم فرما ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ۔

"بر راقم کمال مہربانی و نوازش می فرمایند و از قدیم مالوف بودہ بلکہ خاصی از مدت نمک پروردہ و دست گرفتۂ خاندان اوست" [دستور: ۱۲]

وہ مرزا صاحب کا نام بھی لیتا ہے تو نہایت احترام کے ساتھ اور متعدد القاب و آداب کے ساتھ [دستور: ۲]

سعادت یار خاں رنگینؔ شاہ نصیر کے دوست تھے اور مرزا قمر الدین عرف مرزا حاجی سے بھی رنگینؔ کے شگفتہ تعلقات تھے جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ "مجالسِ رنگین" کی تالیف میں ان کا مشورہ بھی شامل تھا۔ خود رنگینؔ لکھتے ہیں۔

"در لکھنؤ بندہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و مرزا حاجی بیگ صاحب و میر گدائی صاحب وغیرہ باہم نشستہ بودیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میر انشاء اللہ خاں فرمودند کہ ضرور باید نوشت و نام ایں نسخہ "مجالس رنگین" باید نوشت" [مجالس رنگین: ۲]

مجالس رنگینؔ میں ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے جس سے شاہ نصیرؔ کے پہلے سفرِ لکھنؤ کے زمانہ کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

"مرزا سبحان قلی بیگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمودند کہ مطلع اوشاں (شاہ نصیر) می خوانم بہ بینید چہ قباحت اگر بنوانند بر آرند ۔ ۔ ۔ ۔ "

چیرائی چادرِ مہتاب شب میکش نے جیحوں پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

ناچار شدہ گفتم کہ ایں طلع بہ از مطلع آفتاب است لیکن مرا دریں تامل است کہ چادرِ مہتاب را میکش بر جیحوں چگونہ در دید اگر بجائے "میکش" لفظ "بادل" می بود البتہ بہتر بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شخصے ایں سخن بہ میاں نصیر صاحب رسانید او شاں شنیدہ از بندہ آزردہ خاطر شدند بار ے بہ ہزار خرابی در چند مدت تصفیہ نمودم" [مجلس یازدہم]

مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ "خاں صاحب شاہ صاحب کے پاس گئے" [آب حیات: ۳۱۱] غالباً مولانا کی مراد یہ ہو کہ جب شاہ نصیرؔ لکھنؤ گئے تو رنگینؔ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ "مجالس رنگینؔ" کی تالیف ۷ رجب سنہ ۱۲۱۵ھ کو ہوئی۔ یقین ہے اس سے بہت پہلے یہ قضیہ چکایا جا چکا ہو گا۔ اب یکتا کے بیان پر غور کریں تو شاہ نصیرؔ کے اس پہلے سفر کا زمانہ سنہ ۱۲۱۲ھ (دستور الفصاحت کی تالیف سنہ ۱۲۱۳ھ سے ایک سال قبل) قرار پاتا ہے۔ اس وقت شاہ صاحب اپنے لڑکے کی تلاش میں آئے تھے، پہلا سفر تھا، اہل لکھنؤ ان سے واقف نہ تھے، خود بھی عجلت میں رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں باوجودیکہ شاہ صاحب مرزا حاجی کے مشاعروں میں شریک ہوئے یکتا ان سے ملاقات نہ کر سکا ہو گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انھیں صحبتوں میں مذکورہ قضیہ زیر بحث رہا ہو اور شاہ نصیرؔ صاحب کے اس مطلع نے شہرت پائی ہو۔ چنانچہ یکتا نے اسی ایک مطلع کو درج تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ

۱۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی (تالیف سنہ ۱۲۰۰ھ تا سنہ ۱۲۰۹ھ) میں نصیرؔ کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مطلع سنہ ۱۲۰۹ھ سے بھی پہلے کا ہے۔

کوئی اور شعر شاید اسے یاد نہ تھا خود کہتا ہے۔

"شعری کہ راقم را یاد است ایں است"

اس پہلے سفر کے موقع پر ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو شاہ نصیر کا انداز پسند نہ آیا ہو جس کا ذکر صاف لفظوں میں یکتا نے کر دیا ہے۔

(۲)

مصحفی نے "تذکرہ ہندی" میں بھی شاہ نصیر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہاں ان کے لکھنؤ پہنچنے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ البتہ ریاض الفصحا میں انھوں نے شاہ صاحب کے دوبارہ لکھنؤ پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں سفر ریاض الفصحا کے زمانہ تکمیل سے پہلے ہوئے جو ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ میں مکمل ہوئی۔ دوسرے سفر کے بعد شاہ صاحب نے لکھنؤ میں اپنی استادی کا سکہ قائم کر دیا تھا چنانچہ کئی نومشق ان کے شاگرد ہو گئے تھے۔

"نصرت پنڈت کشمیری نصرت تخلص .... درایامی کہ لالہ موتی لال مشاعرہ شروع کردہ۔ اکثری از نوجوانان ہندی گو بہ حلقۂ شاگردی میاں نصیر کہ بار دگر از شاہجہاں آباد بہ لکھنؤ آمدہ بودند و نیز استادی ایشاں را برخود مسلم داشت، عمرش بہ چہل خواہد بود" [ریاض ۳۲۴]

"طالب پنڈت کشمیری کہ طالب تخلص می کند .... درایامی کہ میاں نصیر بار دوم از شاہجہاں آباد بہ لکھنؤ گذر کردند بہ حلقۂ تلامذۂ ایشاں درآمد عمرش تخمیناً سی و پنج سالہ خواہد بود" [ریاض ۱۸۹]

شاہ صاحب کے اس دوسرے سفر کے زمانے کا تعین مولوی عبدالقادر رامپوری کے بیان سے ہو جاتا ہے

"ایں زمان آخر عہد نواب سعادت علی خاں بود .... روزے در محفل مشاعرہ کہ دراں ایام بہ خانۂ مرزا جعفر می بود رفتم۔ مرزا محمد حسن متخلص بہ قتیل و مصحفی و میر نصیر دہلوی ہماں زمرہ سرکردہ بہ شمار می آمدند و شیخ امام بخش ناسخ ما دراں ایام روز افزونی دریں کار بودہ"

اس کے متعلق محترمی عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"آب حیات کی روایت کے مطابق نصیر نے لکھنؤ کے دو سفر کئے تھے۔ آخری سفر کے وقت لکھنؤ میں ناسخ کا دور دورہ تھا چونکہ مولوی عبدالقادر بھی ۱۲۲۹ھ میں نصیر کے قیام لکھنؤ اور ناسخ کی شہرت کا تذکرہ کرتے ہیں اس لئے میری نظر میں ان کا یہ دوسرا سفر قرار پاتا ہے [دیباچہ دستور: ۲۵]

اس موقع پر چند باتوں کا عرض کر دینا مناسب ہے۔ اوّل یہ کہ عرشی صاحب مدظلہ نے یکتا اور مولوی عبدالقادر رامپوری دونوں کے بیانات کو ایک ہی زمانہ یعنی ۱۲۲۹ھ قرار دے لیا ہے، حالانکہ دونوں نے بالکل الگ الگ سفروں کا تذکرہ کیا ہے۔ یکتا پہلے سفر کی بات کرتا ہے اور مولوی عبدالقادر دوسرے سفر کی، چنانچہ دونوں کے بیانات میں واضح فرق ملتا ہے۔ دوم یہ کہ مولوی عبدالقادر کا قول ہے کہ اس وقت شیخ ناسخ کو "روز افزونی" تھی۔ حالانکہ یکتا ان کا ذکر تک کرنا ضروری نہیں سمجھتا ناسخ کے متعلق ریاض الفصحا میں بھی مصحفی نے صرف یہ لکھا ہے۔

"بہ مقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی می کند و در ملاشہائے معنی تازہ می نماید" [۳۳۴]

صاف ظاہر ہے کہ دستور الفصاحت کی تالیف (۱۲۲۳ھ) تک ان کا ذکر کرنا صاحب تذکرہ کے لئے کچھ ضروری نہ تھا

مولوی عبدالقادر نے شاہ نصیر کو "زمرہ سرگردہ" میں شمار کیا ہے لیکن یکتا نے یہ کہہ کر کہ

"غزلہائے طرحی کہ می گفت ہرگز آں پایہ نہ داشتند وکسی پسند نہ کرد واللہ اعلم"

صاف ظاہر کر دیا ہے کہ شاہ صاحب ابھی لکھنؤ میں "نام آور" نہ ہو سکے تھے۔ یکتا نے ایک جملہ یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"گویند کہ دریں فن بہ سبب قوت طبیعت ومقبول شدن کلام در حضرت سلطانی دام شرفہ کسی را بہ خاطر نمی آرد ودعویٰ ملک اشعرا دارد"۔

آب حیات کی روایات کے مطابق شاہ نصیر حضرت شاہ عالم کے دربار سے وابستہ تھے [ص۲] اور اسی زمانہ سے وہ ملک الشعرائی کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ اور شاہ عالم کا زمانہ صرف ۱۲۲۱ھ تک کا ہے اس لحاظ سے بھی اس عبارت کو اس سے پہلے کی ہونا چاہئے اس سلسلہ میں منیر کے واقعات پر نگاہ کریں تو بات اور صاف ہو جاتی ہے۔ ریاض الفصحا میں ان کے متعلق تحریر ہے۔

"منیر خلف الرشید میاں نصیر جوان خوش فکر است ہمراہ پدر خود بہ لکھنؤ آمدہ وباز بہ دہلی رفتہ عمرش تخمیناً بست سالہ خواہد بود" [۳۱۹]

منیر کی عمر کے تخمینہ کرنے میں مصحفی سے غلطی ہوئی ہے۔ ۱۲۲۱ھ سے پہلے ذوق نے شاہ نصیر کا تلمذ اختیار کیا تھا [مجموعہ نغز ۱۸۵] اور اس وقت آب حیات کی روایت کے مطابق منیر کی طبیعت میں جوانی کے زور بھرے ہوئے تھے اور وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے [۵۴۶] اگر مصحفی کے تخمینہ کو صحیح مانیں تو ۱۲۲۱ھ میں منیر کی عمر گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور اب اس عمر میں وہ ممکن نہیں جو آزاد نے بیان کیا۔ آزاد کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر ذوق کے ہم سن یا ان سے بڑے تھے۔ اور ذوق کی پیدائش ۱۲۰۴ھ کی تھی، ۱۲۱۲ھ میں منیر کی عمر آٹھ سال یا اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔ اس وقت وہ لکھنؤ بھاگ آئے اور یکتا نے ان کے لئے "پسر" کا لفظ استعمال کیا۔ ۱۲۲۹ھ میں ان کی عمر پچیس سال سے زائد ہوئی اس وقت وہ بقول مصحفی اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور اس وقت وہ "جوان" تھے۔ اس کے علاوہ یکتا کا ۱۲۰۹ھ سے بھی پہلے کا مطلع نقل کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا زمانہ تحریر بہت زیادہ بعد کا نہیں ہے۔

(۳)

آب حیات کی اصل عبارت اس سلسلہ میں یہ ہے جس کا ذکر مخدومی عرشی صاحب نے بھی کیا ہے۔ [دیباچہ دستور: ۲۵]

"شاہ صاحب دو دفعہ لکھنؤ بھی گئے .... پہلی دفعہ جب گئے ہیں تو سید انشا اور مصحفی اور جرأت وغیرہ سب موجود تھے اور بعض غزلیں جو ان معرکوں سے منسوب اور مشہور ہیں وہ مصحفی کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ دوسری دفعہ جو گئے تو رنگ پلٹا ہوا تھا۔ شیخ ناسخ کے زمانے نے عہد قدیم کو فسخ کر دیا تھا اور خواجہ آتش کے کمال نے دماغوں کو گرما رکھا تھا" [۴۹۹]

ص۲۔ آزاد کا بیان یہ ہے۔ "شاہ عالم کے زمانے میں شاعری جوہر دکھانے لگی تھی اور خاندانی عظمت نے ذاتی کمال کی سفارش سے دربار تک پہنچا دیا تھا......" [۴۹۷] اس کے علاوہ شاہ عالم کے عہد کے شعراء کے ساتھ ہی بیشتر ان کا ذکر کیا ہے مثلاً ملاحظہ فرمائیں آب حیات صفحہ ۵۰۳ وغیرہ۔

مولوی عبدالقادر رامپوری کے بیان کے مطابق ۱۲۲۹ھ میں ناسخ "زمرہ سرکردہ" میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کو صرف "روز افزونی" تھی۔ جب کہ آزاد کے قول کے مطابق شاہ نصیر کے آخری سفر کے وقت بساط الٹ چکی تھی۔ پھر اگر آزاد کا یہ بیان صحیح ہے تو پھر ہمیں شاہ نصیر کے ایک تیسرے سفر کو بھی ماننا پڑے گا۔ آزاد کے بیان میں اس نوعیت کے فرق کی گنجائش ہے۔ کیونکہ جس وقت وہ تذکرہ لکھ رہے تھے ان کو کوئی اتنی بات کا بتلانے والا بھی دلّی اور لکھنؤ میں نہیں تھا کہ شاہ صاحب کس کس سنہ میں کہاں کہاں گئے تھے اور کس کس مشاعرہ میں اور کس کے مقابلہ میں کون کون سی غزل ہوئی تھی " [آب حیات ۴۹۹]۔ اس سلسلہ میں آزاد کا ماخذ غالباً سرسید کی آثار الصنادید ہو جس میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"شاہ محمد نصیر .... دربار لکھنؤ میں تشریف لے گئے اور سامنے مرزا قتیل کے مصحفی اور انشاء اللہ خاں کے ساتھ بساط مشاعرہ آراستہ کیا" [تذکرہ اہل دہلی: ۱۶۶]

تذکرۂ گلستان سخن میں منشی فیض پارسا کے سلسلۂ حالات میں شاہ نصیر کے تیسرے سفر لکھنؤ کی طرف اشارہ ملتا ہے

"مدرسۂ غازی الدین خاں میں جو شہر شاہجہاں آباد کے دروازے اجمیری کے باہر واقع ہے اسی بزرگ نہاد کی تکلیف سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی .... مشاہیر شعرائے شیریں سخن شاہ نصیر غفر اللہ لہٗ اور مومن خاں مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق مغفور از ان کملائے قادر سخن کے تلامیذ اور موزوں طبعان شعر جمع ہو کر .. مستمعان سخن فہم کے پردہ گوش کو رشک گلستان کرتے تھے ...... شاہ نصیر اسی ایام میں سفر لکھنؤ سے معاودت کر کے وارد شاہجہاں آباد ہوئے تھے اور دو غزلیں تازہ زمین کہ شعرائے لکھنؤ کی تکلیف سے کہی تھیں اس مشاعرہ میں بہ طریق تکرار کے پڑھیں ...... خیر الدین یاس نے دوسری زمین میں ایک شعر خوب کہا تھا۔

مرہم سنگ جراحت نے بھرے اپنے گھاؤ — کب سے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

آخر الامر شیخ ابراہیم ذوق نے ایک قصیدہ اسی زمین میں حضرت ظل سبحانی سایۂ رحمت ربانی محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہٗ کی مدح میں لکھا اور وہ دن وہ تھے کہ حضرت بادشاہ ہنوز مسند ولی عہدی پر متمکن تھے" [۶۱ تا ۶۴]

بہادر شاہ کی ولی عہدی کا زمانہ ۱۲۵۳ھ سے پہلے کا ہے۔ مدرسہ غازی الدین خاں ۱۲۲۲ھ میں بہ مقام اجمیری گیٹ تعمیر ہوا تھا اور ۱۲۴۱ھ میں گورنمنٹ نے اس عمارت میں علوم مشرقی کا دار العلوم قائم کیا تھا جو ۱۲۵۹ھ تک یہیں رہا اس کے بعد کشمیری دروازے کے قریب ریذیڈنسی کی عمارت میں منتقل ہو گیا [واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۵۶۲، ۵۷۱ وغیرہ]

منشی فیض پارسا آزاد کے والد مولوی باقر کے شاگرد تھے اور خود آزاد نے ان سے ابتدائی حساب سیکھا تھا [دیوان ذوق ۱۳۸] پارسا کا تقرر مدرسۂ غازی الدین خاں میں سرکار انگریزی کا عمل ہونے کے بعد ہوا تھا جیسا کہ آزاد کے بیان سے ظاہر ہے۔

"منشی فیض پارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا لکھنؤ سے آ کر مشاعرہ قائم کیا ..... انہی دنوں دلی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا۔ انھوں نے اسے مدرسہ کے سلسلے میں لے لیا اور انشائے اردو کی ترقی کا جزو اعظم قرار دے کر صاحب پرنسپل سے مدد لی۔ مدرسہ اجمیری دروازے کے باہر تھا" [دیوان ذوق ۱۳۸]

اس طرح اس مشاعرہ کے اجراء کا زمانہ ۱۲۴۱ھ کا یا اس کے قریب کا ہونا چاہیے، چونکہ معرکۂ مذکورہ پر ہی مشاعرہ ختم ہو گیا۔ اس لیے اس کا زمانہ بھی وہی سمجھا جانا چاہیے جو مدرسہ کے اجراء کا ہے یعنی ۱۲۴۱ھ ـــــ اس مشاعرہ میں حکیم یاس

کی شرکت صاحب کے اس قول کے لئے تائید مزید ہے کہ مومن اور ذوق وغیرہ اپنے تلامذہ کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ کیونکہ یا تو کچھ عرصہ ذوق کے شاگرد رہے اور باقی مدت مومن سے استفادہ کرتے رہے۔ مومن کی پیدائش ۱۲۱۵ھ کی ہے ۱۲۴۱ھ میں ان کی عمر چھبیس سال ہوئی، اس عمر میں ان کا شاگردوں کو اصلاح دینا ہر طرح قرین قیاس ہے۔ لیکن اگر ہم ۱۲۲۹ھ میں شاہ نصیر کا آخری سفر لکھنؤ مان لیں تو اس کے چند سال بعد بھی مومن کی استادانہ حیثیت کا تسلیم کیا جانا مشکل ہے۔ اور یہ بات کہ شاہ نصیر ۱۲۲۹ھ سے ۱۲۴۱ھ تک لکھنؤ ہی میں رہے محتاج ثبوت ہے اس کے خلاف شہادت موجود ہے۔

"نصیر ...... در شاہجہاں آباد علم استاذی می افراز و شریف آں شہر بہ حلقہ شاگردیش در آمدند۔ چوں در لکھنؤ گذر انگندہ و با فصحائے ایں دیار ملاقات کرد و در مشاعرہ با غزل طرحی گفتہ خواندہ مرتبہ سخن بلند او را معلوم شد" [ریاض الفصحا: ۲۳۷]

۱۲۳۲ھ میں ناسخ کا پہلا دیوان شائع ہو کر منظر عام پر آگیا تھا۔ ان کی شاعری شباب پر تھی ۱۲۴۰ھ میں ان کا درجہ وہ تھا جو آزاد نے بیان کیا۔ یعنی۔

"سنگ لٹا ہوا تھا۔ شیخ ناسخ کے زمانے نے مہلقدیم کو مسخ کر دیا تھا" [آب حیات: ۳۹۹]

یہی تیسرا سفر ہے جسے آب حیات کی رو سے شاہ نصیر کا آخری سفر لکھنؤ قرار دینا چاہئے۔ پہلے سفر کی کیفیت بھی بیان ہو چکی اس وقت مقصد لڑکے کی تلاش تھی، عجلت میں رہے ہوں گے غالباً اسی لئے سرسید نے ان کے اس پہلے سفر کو شمار نہیں کیا اور آخری دو سفروں کا ذکر کیا، یہی آزاد نے بھی کیا ہے۔

اورنگ زیب اور عاقل خاں

جب اورنگ زیب کی نہایت محبوب رفیقۂ حیات۔ زین آبادی کا انتقال ہوا تو وہ بہت ملول و غمگین رہنے لگا اہل دربار نے بہت کوشش کی کہ اس کا غم غلط ہو لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

اس وقت امرائے دربار میں عاقل خاں بھی شامل تھا۔ یہ وہی عاقل خاں ہے جس سے زیب النسا کے غلط واقعہ عشق و محبت کو منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کو حد درجہ ملول دیکھ کر ایک شعر کہا: ۔

غم عالم فراوانی ست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

اورنگ زیب یہ شعر سن کر بہت متاثر ہوا اور اسی وقت سے عاقل خاں کا عروج شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ لاہور کا گورنر بنا دیا گیا۔

شہزادی کلثوم کی اردو شاعری

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

شہزادی کلثوم ۱۹۰۸ء میں جے پور میں پیدا ہوئیں ۱۹۳۶ء میں سری نگر میں سپرد خاک ہوئیں۔ یہ
سرسری مطالعہ ان کی کتاب "شہر جنوں" سے متعلق ہے۔

شہزادی کلثوم نے "شہر جنوں" میں صرف ایک گہری سانس لی ہے، کم سنی کی موت، سسکتی چاہت کی موت ہے، وہ قصہ خون جگر نہ لکھ سکیں۔ اُن کی یہ تخلیق، صرف ایک تبسم رنگیں ہے کسی نامکمل مجسمہ کو دیکھتے ہوئے ذہن، ادراک کی مدد سے تکمیل کا احساس دلا دیتا ہے شہزادی کلثوم کے اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے شعور خلش اور اضطراب سے آگاہ بھی کرتا ہے اور طلسم کا نصف خاکہ بھی مرتب کر دیتا ہے۔ یہ "الاپ" ہے استھائی نہیں ہے لیکن "الاپ" سے ہیجانات (IMPULSES) استھائی کے پھیلاؤ کو محسوس کرا دیتے ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیں اور نظمیں چند راہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راہیں اور یہ اشارے شہزادی کلثوم کی جذبی اور داخلی اقدار اور تمناؤں کا حاصل نہیں ہیں۔ مجھے یہ اشارے پسند آئے اور یہ راہیں روشن نظر آئیں، جمالیاتی مسرت (AESTHETIC PLEASURE) کے لیے شہزادی کلثوم کے یہ لمحاتی تجربے قابل غور ہیں۔

مایوسیوں نے حسرت و ارماں مٹا دیئے
کیسا یہ گھر بھرا ہوا ویران ہو گیا

میرا حال تباہ سن لیجیے   یہ حکایت نہیں حقیقت ہے

اب تک ہے میرے دل میں وہی حشر آرزو
بھولی نہیں ہوں آپ کی پہلی نظر کو میں

سر اٹھاتا ابھی نہ سجدے سے
سامنے ان کا آستانہ تھا

اے غم عشق مانگنے والے!   اک دل درد آشنا بھی مانگ!
ابتدا جس کی موت ہے اے دل!   اس محبت کی انتہا بھی مانگ!

مرنا نہ میرا مرنا، جینا نہ میرا جینا
پھر کیوں گنا رہا ہے کوئی میری خطائیں؟

اب حکم ہو تو ختم کروں اس سفر کو میں
طے کر چکی ہوں عرصۂ شام و سحر کو میں
دست خزاں میں دیکھ کے گلہائے تر کو میں
کر دوں نہ چاک دامن باد سحر کو میں
پردہ میں کائنات کے دھوکہ نہ دیجئے
پہچانتی ہوں خوب فریب نظر کو میں

شہزادی کلثوم زندگی کے جلتے ہوئے لمحات سے دور چلی گئیں لیکن ان کے کلام میں ان کا سایہ موجود ہے، پر اسرار کرب کی آسودگی کی کوشش میں انفرادیت کا نقش جم جاتا ہے۔ اس ادھورے چاندنی پرچھائیں کو دیکھ لینا مشکل نہیں ہے۔ کلاسیکی تجربوں کے تصادم میں شدت احساس اور جذباتی فکر کا مطالعہ خلاقانہ توانائی اور اقدار کے نکات کا مطالعہ ہے، روایت نئے تجربوں کی رومانیت کی زمین بھی ہے۔ نئے ذہنی عوامل اور محرکات، روایت اور کلاسکیت کے عطر کے بغیر لازوال اشاروں کو جنم نہیں دے سکتے۔ روایت ایک پھیلے ہوئے اور گہرے نظام فکر کا نام ہے۔

اردو کی روایتی شاعری میں جو کائناتی روح ہے، جو فکری اور جذباتی میلانات اور محرکات ہیں اور اس شاعری سے جو اندرونی زنجیری ہوئی ہے، ان تمام باتوں کو نظرانداز کر کے اسے "گل و بلبل" کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جدید حقیقت نگاری کے تصور نے فریب نظر، ابلاغ تخیل اور جذبات کی گہرائی اور گیرائی کو جس طرح نظر انداز کیا ہے۔ اس کی مثال آرٹ کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی "حقیقت نگاری" آرٹ کے رموز و علائم کو سمجھ نہ سکی اور بھاگتے لمحوں کے تیز دھاروں سے داخلی اقدار کو بھی تراشنے لگی سبات بہت معمولی ہوئی اور وہ یہ کہ منطقی اور استدلالی فکر کے مطابق "زمانہ" کی تراش خراش ہوئی اور جذباتی فکر کے دام سے زمانہ نکل گیا۔ اردو کی کلاسیکی شاعری مختلف انداز فکر (ATTITUDES) کا آئینہ خانہ ہے۔ طرز احساس کا مطالعہ نہیں ہوا ہے ورنہ جمالیات کی وسعت کا اندازہ ضرور ہو جاتا۔ ذوق، وجدان اور جذباتی فکر نے ان گنت فضاؤں کی تشکیل کی ہے تہہ در تہہ داخلیت نے ذہنی زندگی اور شعور و احساس کی اندرونی تاریخ مرتب کی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ نے حقیقتوں کی جذباتی بازآفرینی کی ہے۔ ان تینوں شاعروں نے صدیوں کی روایتوں میں تین علیحدہ روشن میناروں کو نصب کیا ہے۔ ان کے علاوہ چند اور اہم نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان تمام کلاسیکی شعراء نے جن رموز و علائم اور جن اشاروں کی تخلیق کی ہے، ان میں ابدیت اور ہمیشگی ہے، دروں بینی، شخصیتوں کی حرکتیں، ذہنی کیفیات اور واردات، تخیل، وجدان اور جذبات کے گہوارے اردو شاعری کی شریعت میں ان ہی تمام باتوں کا ذکر ہوگا۔ اس شریعت کو داخلی طور پر جذب کئے بغیر کوئی جدید شاعر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا، کلاسیکی اسالیب اور کلاسیکی علامیت اندرونی جذبے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اظہار کی قدر The Value of expression کا تصور ان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شہزادی کلثوم اس شریعت کے آداب سے واقف ہیں، کلاسیکی روایتوں کی روشنی حاصل کرنا چاہتی ہیں، تجربوں کو تخیلی اور وجدانی رنگ میں نمایاں کرتے ہوئے "حقیقت" سے زیادہ "شعریت" کا خیال رکھتی ہیں۔ غالب اور اقبال کی فکر اور وجدان نے انہیں زیادہ متاثر کیا ہے۔ کم سن ذہن کو خصوصاً اقبال کے جذباتی اور ذہنی نظام سے جو روشنی ملی ہے اسے "حکیمانہ نکات" اور "انقلاب اندر شعور" کے پس منظر میں دیکھنا یقیناً ظلم ہوگا۔ ہاں یہ ضرور دیکھئے کہ اس کم سن اور معصوم نظر کو جو بصیرت ملی ہے اس سے کتنے نازک لطیف اور گہرے اشارے پیدا ہوئے ہیں اور رومانی رجحان

ROMANTIC ATTITUDE کس طرح ابھرا ہے۔ شہزادی کلثوم کا رومانی اور جمالیاتی رجحان ابہام* کے پیکر نہیں تراشتا، نئی اجنبی تشبیہوں کی تخلیق بھی نہیں کرتا، اسے فلسفہ اور منطق سے بھی دلچسپی نہیں ہے، اس عمر میں یہ سب کچھ ممکن بھی نہ تھا، اس رجحان میں روایت اور جدت کا احساس ہے۔ تہذیبی اور تمدنی اقدار اور تصورات سے دلچسپی ہے تخیلی ہیئت کو کچے اور پختہ تجربوں اور جذبوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ اس رجحان میں ایک روح مضطرب اور بے چین نظر آتی ہے، خلش و تپش، شوق و آرزو، تلاش و جستجو، حیرت اور بے خودی، امید اور اعتماد، حوصلہ اور ضبط۔ ایک دائرے میں اُن کے چھوٹے چھوٹے کئی دائرے ملتے ہیں:-

کعبہ نہیں، کلیسا نہیں، دیر بھی نہیں
پھر کیا سمجھ رہی ہوں، تری رہگذر کو میں؟
تعبیر اس کی حشر ہے کس کو خیال تھا؟
اتنا اہم نہ سمجھی تھی خوابِ سفر کو میں!
ٹھہری ہے لامکاں سے گزر کر مری نگاہ!
اب تو بتا کہ کیا کہوں حدِ نظر کو میں!

خار و گل ہی میں الجھ کر رہ گئی میری نظر
کب یہ ہم آہنگیِ سود و زیاں سمجھی تھی میں!
اب جو دیکھا تو مری ہستی ہی پردہ دار ہے
تابشِ تنویر ہی کو درمیاں سمجھی تھی میں!
حاصلِ کون و مکاں ہے ربط و ضبطِ حسن و عشق
یہ حساب دوستاں در دل کہاں سمجھی تھی میں؟
جو سمجھ کے پا شکستہ مجھے کارواں نے چھوڑا
تو لپٹ لپٹ کے روئی میں غبارِ کارواں سے
ترے حسن کی حقیقت مرے عشق میں ہے مضمر
مرا دل بھی کم نہیں ہے تری بزمِ لامکاں سے

اے عقل دور باش کہ ہے منزلِ شہود
آئینۂ خیال کو حیراں کئے ہوئے
ملتی ہے آج عہدِ گلستاں کی یادگار!
پھر شاخِ گل ہے برق کو مہماں کئے ہوئے

ہر قطرہ ہے تلاطمِ دریا کی یادگار
ہر ذرّہ ہے نمودِ بیاباں لیے ہوئے
اللہ رے دعائے لبِ زخم کا اثر
وہ خود ہی آ رہے ہیں نمکداں لیے ہوئے

محو تھی تیری یاد میں کلثوم — موت کب آ گئی خدا جانے!

شہزادی کلثوم کی شاعری کی عمر ان کی اپنی عمر سے اتنی کم ہے کہ صورت و معنی کے ارتقاء کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوتا غالباً اس شاعری کی عمر صرف پانچ چھ سال ہے ۔ یہ صرف ایک اشارہ ہے ۔ ایک ادا اور ایک بیکہہ ہے ۔ یہ پہلا زینہ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ یہ صرف ایک تبسّم اور ایک گہرا نقش ہے ۔ کلثوم ریاست جموں و کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں اور شاید اس وقت تک آخری بھی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں ادبی ماحول اور ادبی محفلوں اور مشاعروں سے استفادہ کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا ، "خاتونِ مشرق" اور "عصمت" کی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کی جلدوں میں ان کی نظم و نثر کا کچھ حصّہ شایع ہوا ہے اور بس ۔ ایک پردہ نشین ، تنہائی پسند اور دکھی خاتون کا یہ کلام کیا اہمیت رکھتا ہے اسے محقق اور ناقد اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔ کلثوم ایک المیہ کردار کا نام ہے گھریلو زندگی میں بھی اور ادبی زندگی میں بھی ۔ کشمیر کی ایک پردہ نشین عورت نے شاعری اور نثر نگاری کو المیات (TRAGEDY) سے گریز کا ایک ذریعہ بنایا ہے ۔ یہ "گریز" خود ایک مکمل اشارہ ہے ۔ ٹریجڈی کا حسن اور المیہ کا جمال اسی گریز سے ظاہر ہوا ہے ۔ عملِ پیہم جدوجہد ، کشمکش ، اعتماد اور حوصلے کی باتیں اسی المیہ شعور (TRAGIC CONSCIOUSNESS) سے آئی ہیں ۔ المیہ شعور جب آرٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کی پہچان وہاں اچھی طرح ہوتی ہے جہاں وہ اہم اخلاقی نکات اور کردار کے جوہر کی دریافت کرتا ہے ۔ شہزادی کلثوم کی شاعری میں اس پہلو کی پہچان مشکل نہیں ہے بلکہ ہلکے تصادم میں بھی المیات کے جمالیاتی جوہر کی چمک نمایاں ہے ۔ آرٹ کے سہارے کے بعد المیہ شعور المیات کے خوف (TRAGIC FEAR) سے بہت دور ہو جاتا ہے ۔ شہزادی کلثوم کی شاعری میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ۔ جہاں تصادم ، عملِ پیہم اور اعتماد اور حوصلے سے دلچسپی لیتے ہوئے شاعرہ اس خوف سے بے خبر ہو گئی ہے ۔ شہزادی کلثوم نے اس گریز سے اپنے ذہن کو آرٹ کے علاوہ مذہب سے بھی گہرے طور پر وابستہ کر دیا تھا ، نثری تخلیقات میں اس گریز کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ مجھے فن کار کے گریز کا یہ عمل جتنا رومانی اور ادبی نظر آتا ہے ۔ اتنا "حقیقت نگاری" اور "عکاسی" کا عمل ادبی اور رومانی نظر نہیں آتا ، مذہب کی گہری روحانیت بھی شہزادی کلثوم کے المیہ کا نفسیاتی سہارا ہے ۔ نثری ادب میں بھی بنیادی خیالات وہی ہیں جو شاعری میں ملتے ہیں ، آرٹ کی رومانیت نے مذہب کے بعض اہم کرداروں کو مکمل رومانوی کردار بنا دیا ہے حضرت عبداللہ بن حسنؓ سے کلثوم کی والہانہ عقیدت میں اس رجحان کو دیکھا جا سکتا ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے ۔ اس رجحان میں جو اضطراب اور خلش ، جو چبھن اور درد ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے ۔ غزلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے شاعرہ کے میلانِ فکر کا پتہ چلتا ہے ۔ ایک صاف ، پاکیزہ ، سنجیدہ ، پُرخلوص اور شریف کردار کی لمسی کیفیت کا علم ہوتا ہے ۔ کلام کی پاکیزگی احساس و فکر کو فریب میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ ہم اس سے ایک بالیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ شاعری کا سہارا کلثوم کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا ماحول کی گھٹن کم ہو گئی اور ادبی اقدار نے ان کے تجربوں کو پھیلا دیا ، تصوّریت ، فکر اور احساس اور ہیجانات نے سنہرے جال بن دیئے ۔ اس طلسمی فضا میں کلثوم نے تلخ تجربوں کو بھی ارتفاعی صورت دینے کی کوشش کی ہے :-

فقط نگاہ کا پردہ ہے ورنہ حُسنِ یار کب آشکار نہیں تھا جو آشکار کرے
کہو نظر سے بدل دے نظامِ دردِ دل نہ میری طرح زمانے کو بے قرار کرے

بے کسوں کی آہ بھی وہ آہِ پُر تاثیر ہے آپ تو کیا، آبدیدہ آپ کی تصویر ہے
ہوشیار اے دامنِ عقل و خرد اب ہوشیار! آج پھر دستِ جنوں میرا گریباں گیر ہے
جس کے دم سے تھی مرے دل کی امنگوں میں بہار اب وہی خونِ جگر دیدۂ خوں بار میں ہے

کعبہ سے روٹھ کے بت آئے صنم خانے میں اب کہاں روٹھ کے جائیں گے صنم خانے سے؟
مے کدے سے ترے میخوار کدھر کو آئیں تو نے کعبہ سے پکارا کہ صنم خانے سے؟

سوئے دل جو نگاہ ہوتی ہے... بخدا بے پناہ ہوتی ہے.....

لب و لہجہ کتنا صاف اور شگفتہ ہے، الفاظ کا آہنگ اور صوتی پیکر بھی کلاسیکی مزاج لیے ہوئے ہے۔ تجربوں کا اظہار بڑی بیباکی سے ہوا ہے، اس قسم کے اشعار ہماری ذہنی اور جذباتی ہمدردی فوراً حاصل کر لیتے ہیں۔ "محبت" "احساسِ زوال" "اپنا ماضی و حال" "صدائے دل" "شہنشاہیہ مجاہد" کچھ نوحے اور کچھ سلام اچھی نظمیں ہیں۔ ابتدائی کوشش کی خامیاں موجود ہیں لیکن کلثوم کے فن کی خوبیاں ان خامیوں پر غور کرنے نہیں دیتیں۔ وادیٔ کشمیر کی پہلی شاعرہ کا اس طرح "استقبال" کرتے ہوئے مجھے مسرت بھی ہے اور میری آنکھیں پُرنم بھی ہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری کی ۲ دو نئی کتابیں شائع ہوگئیں

مشکلات غالب

جس میں مولانا نیاز فتحپوری نے غالب کے اردو کلام کے ہر شعر کی نہایت مختصر، جامع، واضح اور آسان تشریح کردی ہے غالب کے سارے پیچیدہ اشعار کی باریکیوں اور نزاکتوں کو اس خوبی و سادگی سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

یہ کتاب غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عموماً اور طلبار کے لئے خصوصاً نہایت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت دو روپے پچاس پیسے

عرضِ نغمہ

ٹیگور مشرق کے ان بلند مرتبہ شاعروں میں ہے جس کے رُوح پرور نغموں نے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے اس عظیم فنکار کے مجموعۂ نظم "گیت انجلی" کو "عرضِ نغمہ" کے نام سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ ٹیگور کی رُوحِ شاعری سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ اس میں وہی سادگی و پُرکاری اور رُوح خیزی و دلکشی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے، جو لوگ ٹیگور کی فنی دسترس شاعرانہ لطافت اور حیات پرور نغمات کی سحر آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کے آرزومند ہیں اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ ٹیگور کی شخصیت اور فن سے بہرہ مند ہونے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ موجود نہیں۔

قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

اطہر پرویز

اِسکولُ کی فیس

(پلاٹ ہنگری کے ادیب فرسٹر سکارنستی کے مزاحیہ ڈرامہ سے ماخوذ)

ڈرامے میں کام کرنے والے :-

۱- جھن جھن
۲- ایک لڑکا
۳- جغرافیہ کا استاد
۴- ہیڈ ماسٹر
۵ سائنس کا استاد
۶- حساب کا استاد
۷ بڑے بابو
۸ چپراسی

(ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے باہر برآمدے کی میز پر بڑے بابو کام کر رہے ہیں۔ ایک چپراسی دہیں بیٹھا اونگھ رہا ہے جغرافیہ کا استاد برآمدے میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے ایک لڑکا ہے)

لڑکا - ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب! آپ نے بتایا تھا کہ زمین چپٹی ہے۔

جغرافیہ کا استاد - ہاں بتایا تو تھا۔ ایک سوال کو بار بار پوچھا کرو اسے یاد کر لے "زمین چپٹی ہے۔ زمین چپٹی ہے" زبانی یاد کر کے کل سنانا۔ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ جب کوئی نکتے کی بات بتاؤں تو اسے زبانی یاد کر لیا کرو

لڑکا - وہی تو یاد کر رہا تھا کہ ابا نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا "ابے کیا یاد کر رہا ہے؟ کہیں زمین بھی چپٹی ہوتی ہے۔ وہ تو گول ہے۔ کس نالائق نے تجھے بتایا ہے"؟"

جغرافیہ کا استاد پھر تو نے کیا کہا۔

لڑکا میں نے کہا ماسٹر صاحب نے بتایا ہے۔

جغرافیہ کا استاد - خیر کوئی بات نہیں۔ اپنے باپ سے کہنا کہ ماسٹر صاحب کو ساٹھ روپیہ تنخواہ ملتی ہے اور ساٹھ روپے میں یہی پڑھاؤں گا کہ زمین چپٹی ہے۔ مجھے کالج کے پروفیسروں کی طرح تنخواہ ملے تو میں بھی پڑھاؤں گا کہ زمین گول ہے۔

ایک آواز - کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ -

جغرافیہ کا استاد - جی اندر تشریف لائیے - کیا نام ہے آپ کا؟ -

جھن جھن والا - مجھے جھن جھن والا کہتے ہیں۔ کیا ہیڈ ماسٹر صاحب اندر تشریف رکھتے ہیں؟ -

جغرافیہ کا استاد - جی ہاں سامنے والے کمرے ہیں -

جھن جھن والا - ہیڈ ماسٹر صاحب! آداب عرض ہے -

ہیڈ ماسٹر - کمرے میں آنے سے پہلے آپ بڑے بابو سے ملئے۔ ہمارے اسکول کا قاعدہ ہے کہ جو کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ وہ پہلے اپنا نام بابو کو دیتا ہے۔ اور بابو چپراسی کو۔ پھر میں بلاتا ہوں۔ بڑے بابو ان سے قاعدے کی پابندی کراؤ۔

بڑے بابو - (بڑبڑاتے ہوئے) بات سمجھتے نہیں۔ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں - (جھن جھن والا سے) نام لکھیئے۔ اگر لوگ اسی طرح سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں چلے جائیں گے تو پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں؟

چپراسی - بڑے بابو! آپ کے پاس تو پھر بھی کام ہے

پھر ہم چپراسی کیا کہیں گے ؟ ۔

جھن جھن والا ۔ (اخبار کا کونا پھاڑ کر لکھتا ہے) لیجئے بابو صاحب میرا پرچہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دیجئے ۔

بڑے بابو ۔ چپراسی ! ہیڈ ماسٹر صاحب کو یہ پرچہ دیدو (چپراسی کاغذ لے کر اندر جاتا ہے)

ہیڈ ماسٹر ۔ بڑے بابو کو بلاؤ

چپراسی ۔ بڑے بابو ! آپ کو صاحب بلاتے ہیں (اندر جاتا ہے)

ہیڈ ماسٹر بڑے بابو ! یہ کون آدمی ہے ؟

بڑے بابو ۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ میں پوچھتا ہوں آم اور تم بتاتے ہو املی ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسکول کا وقت ختم ہو گیا ہے ۔ اور میں والدین سے اسکول کے دوران میں ملتا ہوں ۔ یہ والدین سے ملنے کا کون سا وقت ہے ۔ تم نے بورڈ پر سے نوٹس اتار دیا کیا ؟

بڑے بابو ۔ نوٹس تو لگا ہوا ہے ۔ لیکن یہ آدمی کسی کا والدین معلوم نہیں ہوتا ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ تو کیا یہ طالب علم ہے ؟

بڑے بابو ۔ نہیں صاحب اس کے داڑھی ہے ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ (چڑ کر) نہ والدین ہے اور نہ طالب علم تو پھر کیا ہے ؟

بڑے بابو ۔ بس یہ کہ اس کا نام جھن جھن والا ہے ۔ یوں سمجھئے کہ کوئی آدمی ہے ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ آدمی تو سب ہوتے ہیں ۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھ سے ملنے کے لئے کوئی جانور آئے گا ؟

بڑے بابو ۔ جی ۔ جی نہیں ۔ میرا مطلب ہے کہ جانور ہرگز نہیں آئے گا ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ عجیب معاملہ ہے ۔ خیر جاؤ اسے بھیجو ۔

بڑے بابو (باہر جا کر جھن جھن والا سے) آپ اندر جا سکتے ہیں

جھن جھن والا ۔ (اندر جا کر) ہیڈ ماسٹر صاحب ! آداب عرض ہے

ہیڈ ماسٹر ۔ فرمائیے کیا کام ہے ؟

جھن جھن والا ۔ میرا نام جھن جھن والا ہے ۔ آپ مجھے پہچانتے ہیں

ہیڈ ماسٹر ۔ ہیں ، ہیں ، نہیں پہچانتا ۔

جھن جھن والا ۔ اصل میں میری شکل خاصی بدل گئی ہے ۔ آپ ۸ سال پہلے کے رجسٹر دیکھئے آپ کو وہاں میرا نام ملے گا آپ خود سوچئے کہ اس اسکول پر میرا کتنا حق ہے ؟

ہیڈ ماسٹر اسکول کے رجسٹر ! تمہارا مطلب ؟

جھن جھن والا ۔ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ! آپ اجازت دیں تو عرض کروں ۔ خادم کو جھن جھن والا کہتے ہیں ۔ آپ مجھے بھول گئے ۔ میں نے یہاں چھ سال تعلیم پائی ہے ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ بے شک ۔ بے شک ۔ لیکن یہ بتایئے میں کیا کروں

جھن جھن والا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو میرا نام بھی یاد نہیں (کچھ سوچتا ہے) ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو کیوں یاد ہونے لگا ۔ آپ کو مجھ سے کیا دلچسپی (لہجہ بدل کر غصے سے) جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ! میں آج سے اٹھارہ سال پہلے اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور ہر مہینے فیس دیتا تھا ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ (بغیر کسی جذبے کے) تم اسکول میں پڑھتے تھے اچھا تو اب کیا چاہتے ہو ۔ کیا تم کو سرٹیفکیٹ چاہئے ؟

جھن جھن والا ۔ سرٹیفکیٹ تو میں واپس لایا ہوں (کاغذ نکالتا ہے) یہ لیجئے ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تو ایک اور کام کے لئے آیا ہوں ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ اچھا تو کام بتاؤ ۔

جھن جھن والا ۔ (اپنا گلا صاف کرتے ہوئے) میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اسکول میں جو فیس جمع کی ہے ۔ وہ سب کی سب واپس کی جائے ۔ آنہ پائی سے ۔

ہیڈ ماسٹر ۔ ہوں ۔ فیس واپس کی جائے ! تمہارا مطلب !!

جھن جھن والا ۔ جی میری فیس مجھے واپس کی جائے ۔ اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ میں دولت مند ہوتا تو

کہتا کہ اسے اپنے پاس رکھیے۔ مگر میں قلاش انسان ہوں۔ مجھے روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔

ہیڈماسٹر۔ میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

جھن جھن والا۔ اپنے مطلب کی بات تو خوب سمجھتے ہیں اور اتنی سیدھی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ میں جب یہاں پڑھتا تھا تو آپ فیس کے نام سے ہر مہینہ مجھ سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ اب مجھے پوری فیس واپس چاہئے۔ اب آئی سمجھ میں بات۔

ہیڈماسٹر۔ لیکن تم اسے واپس۔ کیوں

جھن جھن والا۔ (بات کاٹ کر) اس لئے کہ میں نے آپ کو جو فیس دی تھی اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ میں نے یہاں تعلیم پائی ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں نے یہاں کچھ نہیں سیکھا ہے اپنا سرٹیفکیٹ واپس لیجئے اور مجھے میری رقم واپس کیجئے تاکہ ہمارا آپ کا حساب صاف ہو۔

ہیڈماسٹر۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں پہلی بار کسی شخص سے ایسی بات سن رہا ہوں۔ کیا احمقانہ بات کر رہے ہو۔

جھن جھن والا۔ (ہنستے ہوئے) یہ احمقانہ بات ہے۔ کتنا نادر خیال ہے اور آپ کو احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نادر خیال میرے دل میں خود نہیں آیا۔ اور آتا بھی کیسے۔ آپ نے مجھے ایسی تعلیم ہی نہیں دی۔ آپ کی تعلیم کا میرے اوپر یہ اثر ہے کہ میں نرا گاؤدی ہوں بالکل گدھا سا احمق۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ تو میری قسمت تھی کہ ایک پرانا دوست مل گیا۔ اور اس نے مجھے سمجھا دیا۔

ہیڈماسٹر۔ سمجھا دیا

جھن جھن والا۔ جی۔ میں برسوں ہی ایک دفتر میں ملازم ہوا تھا اور آج وہاں سے مجھے نکال دیا گیا یہ کہہ کر کہ میں بالکل بے وقوف ہوں اور دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اور دیکھ لیا۔ اس سے پہلے بھی جہاں کہیں کام ملا۔ دو چار روز میں یہی نوبت آئی۔ چنانچہ جب میں اپنے دفتر سے سر جھکائے آرہا تھا تو میری ملاقات اپنے ایک دوست سے ہوئی۔ میں نے کہا۔ "کہو یار کیا حال ہے؟" وہ بولا "اپنے تو ٹھاٹ ہیں! اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ مجھے ایک دلال کے یہاں جانا ہے تاکہ سٹے میں جو کچھ جیتا ہے اس کے پیسے وصول کر لوں" میں نے کہا۔ "سٹہ کسے کہتے ہیں؟"

ہیڈماسٹر۔ تو آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ سٹہ کسے کہتے ہیں!"

جھن جھن والا۔ ذرا سنئے تو۔ یہی تو میرا مسئلہ ہے۔ اس نے کہا میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تم کو سمجھا سکوں اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو کیا خاک روپیہ کماؤ گے۔ تم نے اسکول میں جو فیس دی۔ ہے وہ بالکل بے کار گئی۔ اس سے تم کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جاؤ۔ اپنی فیس واپس لے لو۔ پھر وہ چل دیا

ہیڈماسٹر۔ اور آپ یہاں آگئے۔

جھن جھن والا۔ جی میں کھڑا سوچتا رہا کہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ جہاں جاتا ہوں نالائق کہہ کر نکال دیا جاتا ہوں۔ چنانچہ میں سیدھا یہاں دوڑا آیا ہوں آپ میری فیس مجھے ابھی لوٹا دیں کیوں کہ خاصی بڑی رقم ہوگی اور میں ایمان سے کہتا ہوں کہ مجھے یہاں دھیلے برابر فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کو یقین نہ آئے تو خود غور سے دیکھ لیجئے۔

ہیڈماسٹر۔ اُوہ، آج تک کوئی شخص اس اسکول میں یہ درخواست لے کر نہیں آیا — کیا تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔؟

جھن جھن والا۔ اچھا تو آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میں زندگی میں کبھی اتنا سنجیدہ نہیں رہا میں اس معاملہ کو لے کر اوپر تک

ہیڈ ماسٹر۔ (بات کاٹ کر) اوپر تک

جھن جھن والا۔ وہاں شنوائی نہ ہوگی تو میں اور آگے جاؤں گا اور اپنا اور آپ کا کچا چٹھا کہوں گا کہ آپ نے مجھ سے روپے وصول کئے اور لکھایا پڑھایا کچھ نہیں۔ ورنہ میں بھی کسی دفتر میں بیٹھ کر قوم کی خدمت کرتا۔

ہیڈ ماسٹر پڑھایا نہیں۔ اس کا ثبوت؟

جھن جھن والا۔ جناب ثبوت کسے ہے میں آپ کے سامنے ساڑھے پانچ فٹ کا آدمی خود کھڑا ہوں کیا آپ مجھ کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی تعلیم حاصل کی ہے؟

ہیڈ ماسٹر۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے

جھن جھن والا۔ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میری صرف تعلیم ہی ناقص ہے کہ آج آپ کے سامنے ہونق کی طرح کھڑا ہوں۔

ہیڈ ماسٹر۔ مگر تمہیں احساس کیسے ہوا کہ تم بالکل جاہل ہو اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔

جھن جھن والا۔ ہر شخص مجھے یہی سمجھتا ہے۔ اگر کام ملتا ہے تو وہاں سے بھی مجھے نالائق کہہ کر نکال دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھتا ہوں کہ میری طرح کے انسان ہیں لیکن خوب تقریریں کرتے ہیں اور میں کسی کام کا نہیں۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو پھر امتحان لے کر دیکھئے۔

ہیڈ ماسٹر (جھنجلا کر) عجیب مصیبت ہے۔ کیا تم واقعی امتحان دینا چاہتے ہو؟

جھن جھن والا۔ جی ہاں۔ یہ میرا حق ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ عجیب معاملہ ہے۔ مجھے اپنے استادوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ اچھا تم باہر بیٹھو۔ میں اپنے استادوں سے مشورہ کر لوں۔

جھن جھن والا۔ اچھا تو میں باہر دفتر میں بیٹھتا ہوں۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہو جلدی کیجئے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ چپراسی ذرا بڑے بابو کو بھیجنا (بڑے بابو آتے ہیں)

ہیڈ ماسٹر۔ بڑے بابو تمام ماسٹروں کو اطلاع بھیجو کہ وہ فوراً میرے کمرے میں آجائیں۔ بے حد ضروری میٹنگ ہے

بڑے بابو۔ ابھی اسی وقت اطلاع بھیجتا ہوں۔ (باہر جاتا ہے)

ہیڈ ماسٹر (اپنے آپ سے) عجیب مصیبت ہے۔ اب لیجئے ان کی فیس واپس کیجئے۔ اور پھر جتنے نالائق گذرے ہیں سب کی فیسیں واپس کرنی پڑیں گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ دیکھئے ہمارے استاد کیا کہتے ہیں!

بڑے بابو۔ حضور تمام استاد آگئے۔

ہیڈ ماسٹر۔ انھیں فوراً بھیجو۔

تمام استاد۔ آداب عرض ہے

ہیڈ ماسٹر۔ حضرات میں نے آپ کو ایک غیر معمولی صورت حال کی وجہ سے بلایا ہے۔ آپ لوگ تشریف رکھئے میں میٹنگ شروع کرتا ہوں۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب وغریب واقعہ ہے۔ بے حد انوکھا ہے اور انوکھا ہی کیا مضحکہ خیز بھی ہے۔ اس اسکول کا اٹھارہ سال پہلے کا ایک طالب علم میرے پاس ابھی آیا تھا اس نے میرے سامنے ایک عجیب وغریب سوال پیش کیا۔

حساب کا استاد۔ کوئی حساب کا سوال ہے تو میں مدد کر سکتا ہوں پچیس سال سے لڑکوں کو حساب پڑھاتا ہوں۔

تاریخ کا استاد۔ اگر کوئی تاریخ کا مسئلہ ہے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

ہیڈ ماسٹر آپ کو تو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ نہ حساب کا سوال ہے نہ تاریخ کا۔ ہماری آپ کی زندگی کا سوال ہے

جھن جھن والا کہتا ہے اور کہا گیا ہے بلکہ وہ اپنی تمام فیس واپس لینا چاہتا ہے جو اس نے چھ سال میں جمع کی ہے۔

جغرافیہ کا استاد۔ میں اس مسئلے کی جغرافیائی صورت حال کو سمجھنا چاہتا ہوں۔

ہیڈ ماسٹر۔ جغرافیائی صورت حال کو بعد میں سمجھئے گا۔ اس وقت تو معاملہ یہ ہے کہ جھن جھن والا کی ملازمت چھوٹ گئی ہے۔ وہ نالائق اور بے وقوف ہے اب آپ لوگ بتائیے کہ کیا کیا جائے۔

حساب کا استاد۔ مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔؟

ہیڈ ماسٹر۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اسکول میں کچھ نہیں سیکھا میں جاہل مطلق ہوں۔

جغرافیہ کا استاد۔ آپ۔ ہرگز نہیں۔

ہیڈ ماسٹر۔ میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں جھن جھن والا کی بات کو دہرا رہا ہوں۔

سائنس کا استاد۔ حضرات! میں اس مسئلہ کے بارے میں سائنسی نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالتا ہوں۔ یہ سائنس کا معمولی اصول ہے کہ نظام عالم میں مجموعی قوت یکساں رہتی ہے۔ یعنی اس کے مطابق یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ ایک مخصوص طالب علم ایک مخصوص مدت میں علم حاصل کرتا ہے اور اس کے اتنی ہی مدت میں ضائع کر دے گا جتنی مدت میں اس کے استاد یہ علم اس کے سر میں ٹھونس چکے ہیں۔

حساب کا استاد۔ آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

سائنس کا استاد۔ مثلاً اب سے اٹھارہ سال پہلے ایک مخصوص فرد نے ایک مخصوص علم چھ سال کے مخصوص عرصے میں حاصل کیا اور پھر اسی مخصوص عرصہ میں یہ مخصوص علم ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد یہ مخصوص فرد بارہ سال سے جاہل پھر رہا ہے۔ اس کو انگریزی میں کہتے ہیں [illegible] Diminishing value —

جغرافیہ کا استاد۔ لیکن جہاں اس پر اور سماجی اثرات پڑے ہوں گے میرا خیال ہے کہ جغرافیائی حالات نے بھی اس پر اپنا اثر ڈالا ہو گا۔

تاریخ کا استاد۔ جناب میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں اس واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے آپ کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ آخر وقت بھی تو اہم Dimension ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ آپ بلا وجہ بحث میں لگ گئے۔ یہاں معاملہ ایک کوڑھ مغز سے ہے۔ اس وقت اپنا علم اپنے پاس رکھئے۔

جغرافیہ کا استاد۔ وہ آدمی ہے کہاں۔ وہی تو نہیں جو باہر کھڑا ہے

ہیڈ ماسٹر۔ جی ہاں وہی ہے۔ باہر انتظار کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس نے اسکول میں کچھ نہیں سیکھا

حساب کا استاد۔ در بارہ امتحان! حضرات! میری رائے ہے کہ دوبارہ امتحان لینے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہاں اگر فیل ہو جائے تو پھر فیس جائیں گے۔ اس لئے اسے فیل نہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہمارا سابقہ ایک ایسے آدمی سے ہے جو اپنے آپ کو نالائق سمجھتا ہے اور یہاں اس کی نالائقی اس کے لئے مفید ثابت ہو گی۔ اس لئے ہمیں مشکل سوال نہیں پوچھنا چاہئے۔ کیوں سائنس کے ماسٹر صاحب؟

سائنس کا استاد۔ بالکل درست

حساب کا استاد۔ ہم لوگوں کو اتفاق رائے سے کام لینا چاہئے۔

ہیڈ ماسٹر۔ ورنہ تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ وہ اس معاملے

کو افسرانِ بالا تک لے جانے کی دھمکی دے رہا ہے

تاریخ کا استاد۔ تو جانے دیجئے کیا کرے گا۔

ہیڈ ماسٹر۔ آپ نہیں سمجھتے۔ ارے بلاوجہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ ہم خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔

حساب کا استاد۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اسے کسی طرح فیل نہ ہونا چاہئے۔ اس کی کامیابی میں ہی اس کی ناکامی کا راز چھپا ہوا ہے۔

سائنس کا استاد۔ آپ کس قدر غیر سائنسی گفتگو کر رہے ہیں ناکامیابی کامیابی میں اس طرح بدل سکتی ہے

حساب کا استاد۔ جناب میں آپ کو جیومیٹری کے اصولوں کے مطابق سمجھاتا ہوں۔ ناکامیابی برابر ہے جہالت کے اور جہالت برابر ہے فیس کی واپسی کے اور فیس برابر ہے۔ اس کی کامیابی کے۔ اس طرح ناکامیابی [illegible] کامیابی کے سمجھے آپ۔

ہیڈ ماسٹر۔ ہم لوگوں کو اس صورتِ حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔

حساب کا استاد۔ اس کے ہر جواب کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں امتحان کا سلسلہ شروع کر دوں۔

ہیڈ ماسٹر۔ ضرور۔ (بابو جی زور زور سے آواز دیتے ہیں) ذرا مسٹر جھن جھن والا کو اندر بھیجئے

جھن جھن والا۔ (اندر داخل ہوتا ہے) میں اندر آ سکتا ہوں آداب عرض ہے

ہیڈ ماسٹر۔ تشریف لائیے مسٹر جھن جھن والا

جھن جھن والا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آپ لوگوں سے میرا کیس بتا دیا ہوگا۔ یعنی یہ کہ میرا امتحان لیجئے اور فیل ہو جانے پر میری فیس واپس کیجئے

حساب کا استاد۔ درست فرمایا آپ نے۔ میں تمام استادوں کی طرف سے عرض کر رہا ہوں کہ ہم لوگ آپ سے اتفاق کرتے ہیں اور آپ کا امتحان لیں گے

جھن جھن والا۔ زیادہ تکلف اس مت کیجئے اور امتحان لیجئے۔ مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب بھی مجھ سے ایک بھی صحیح جواب پا سکتے ہیں

ہیڈ ماسٹر۔ امتحان شروع ہوتا ہے تاریخ کا۔ ماسٹر صاحب آپ امیدوار سے سوال پوچھ سکتے ہیں۔

تاریخ کا استاد۔ اس سوال کا جواب دیجئے کہ تیس سالہ جنگ کتنے لمبے عرصہ تک چلی۔

جھن جھن والا۔ لمبے عرصے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا

تاریخ کا استاد۔ سوچ کر جواب دو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم دماغ پر زور ڈالو گے تو بتا سکتے ہو۔

جھن جھن والا۔ میں سمجھ گیا۔ صرف تیس گز۔ ٹھہرئیے، مجھے ڈر ہے کہ میرا جواب صحیح ہے۔ مجھے پھر سوچنے دیجئے۔ ہاں ہاں تیس گز۔ مجھے گز کے فٹ بنانے نہیں آتے ورنہ میں فٹ بنا دیتا۔ دیکھئے میں کتنا جاہل ہوں۔ میری فیس واپس کیجئے۔

تاریخ کا استاد۔ آپ بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ ان کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

حساب کا استاد۔ آپ کیا کر سکتے ہیں ماسٹر صاحب۔ خاموش رہئے ان کا جواب بالکل درست ہے۔

جھن جھن والا۔ مجھ سے بات کیجئے۔ امتحان تو میں دے رہا ہوں

سائنس کا استاد۔ ٹھہرئیے میں سائنس کے نقطۂ نگاہ سے ان کے جواب کی تشریح کرتا ہوں۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ امیدوار جس کا امتحان لیا جا رہا ہے ظاہری چیزوں پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اس کا جواب موجودہ تحقیقات کی روشنی میں دیا گیا ہے

جھن جھن والا۔ وہ کیسے۔

جغرافیہ کا استاد۔ دیکھئے میں جغرافیہ کا استاد ہوں اس کو علم جغرافیہ سے ثابت کرتا ہوں۔ یعنی یہ کہ اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ ستارہ شمس یمانی کا فاصلہ کیا ہے تو اس کا جواب گزوں اور میلوں میں نہیں ہوگا بلکہ برسوں میں یعنی دس یا گیارہ روشنی سال

سائنس کا استاد۔ یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ آئن اسٹائن نے اپنے نظریہ اضافت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وقت بھی اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ لمبائی اور چوڑائی یہ بھی ایسے ذرات سے بنا ہے اور اسے ایک جگہ اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور ناپا بھی جا سکتا ہے اس طرح تیس سال برابر ہوتے ہیں تیس گز کے

جھن جھن والا۔ ٹھہریئے ٹھہریئے مجھے ایک موقع اور دیجئے میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ انھیں ایک موقع اور دیجئے۔

حساب کا استاد۔ امتحان قاعدے سے ہونا چاہئے انھیں دوبارہ موقع نہ ملنا چاہئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب! غضب کر رہے ہیں آپ بھی۔ خدا کے واسطے موقع نہ دیجئے۔ ممکن ہے......

جھن جھن والا۔ میرا خیال ہے یہ جنگ پندرہ گز نہیں نہیں ۷ گز کے لمبے عرصہ تک چلی۔

حساب کا استاد۔ بالکل صحیح ــ دیکھئے پہلے آپ نے کہا تھا تیس گز اور اب آپ کہہ رہے ہیں سات گز۔ پہلا جواب بھی صحیح تھا کہ تیس گز چلی اور اب تو اور صحیح ہو گیا

سائنس کا استاد۔ ارے بھائی تیس گز تو چلی لیکن تیس گز تو اس وقت ممکن تھا کہ وہ دن رات لڑتے رہتے وہ دن میں لڑتے تھے اور رات کو سوتے تھے اس لئے جنگ کی مدت آدھی ہو گئی۔ باقی بچے پندرہ تو پندرہ سال میں مسلسل کیا لڑتے ہوں گے کچھ وقت کھانے میں لگا ہوگا اور کچھ چلنے میں۔ اس طرح آدھے سے اور بھی کم ہو گیا اس لئے یہ جواب صحیح ہے

ہیڈ ماسٹر۔ اگر آپ کی رائے ہو تو میں امیدوار کو تاریخ میں ۱۰۰ میں ۸۵ نمبر دیتا ہوں۔

سب استاد۔ ضرور ضرور۔ بالکل صحیح جواب ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ اب سائنس کا سوال پوچھئے۔

سائنس کا استاد۔ مسٹر جھن جھن والا! یہ بتایئے کہ آپ کو دور سے چیز چھوٹی نظر آتی ہے تو یہ فریب نظر ہوتا ہے یا وہ چیز خود چھوٹی ہو جاتی ہے۔

جھن جھن والا۔ تم یہ آسان سوال پوچھ رہے ہو تا کہ میں پاس ہو جاؤں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب! ان کے سوال کا معیار پست ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ یہ ہمارے نصاب کے مطابق ہے اور نصاب کے بارے میں میرا فیصلہ آخری ہے۔

جھن جھن والا۔ اچھا تو سائنس کے ماسٹر صاحب! آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جس وقت چھوٹی نظر آتی ہے اس وقت چھوٹی ہو جاتی ہے۔

سائنس کا استاد۔ بالکل درست۔ دراصل اس سوال کا جواب یعنی فریب میں نہیں بلکہ کشش کے مسئلے میں ہے۔ زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے جب یہ کشش کم ہو جاتی ہے تو وہ چیز بڑی نظر آتی ہے اور جب زیادہ ہو جاتی ہے تو چھوٹی نظر آتی ہے۔

ہیڈ ماسٹر اس لئے امیدوار کو سائنس میں اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا جاتا ہے یعنی ۱۰۰ میں ۸۷

جھن جھن والا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال بہت آسان تھا کوئی مشکل سوال پوچھئے۔

حساب کا استاد۔ سائنس کا امتحان ختم ہو گیا۔ اب جغرافیہ کی باری ہے

جغرافیہ کا استاد۔ جناب میں جغرافیہ کا امتحان لوں گا اور چمن چمن والا صاحب! جغرافیہ آسان نہیں ہے۔ سمجھ لیجئے اچھا بتایئے۔ جب آپ کسی گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ اس وقت گاڑی چلتی ہے یا پیڑ بھی

چمن چمن والا۔ ماسٹر صاحب! آپ بے وقوف بناتے ہیں۔ میں نے بار ہا ریل میں سفر کیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ہم سفر کرتے ہیں تو ہر چیز سفر کرتی ہے پیڑ بھی ہمارے ساتھ چلتے ہیں۔ گاڑی ہی چلئے خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

جغرافیہ کا استاد۔ وہ کیسے؟ پیڑ کہاں چلتے ہیں؟

حساب کا استاد۔ یہ آپ کی بیچ بیچ میں بولنے اور بات کاٹنے کی کیا عادت ہے۔ جیسے آپ ہی تو بڑے افلاطون ہیں۔ پیڑ چلتے ہیں اور ضرور چلتے ہیں۔ اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ زمین گردش کرتی ہے۔

سائنس کا استاد۔ جی یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ زمین گردش کرتی ہے لیکن ....

ہیڈ ماسٹر۔ اچھا تو آپ خاموش رہیے۔ خدا کے واسطے خاموش رہیے۔ وہ اوپر تک جانے کی دھمکی دے رہا ہے اسکے طرح۔ ہاں حساب کے ماسٹر صاحب آپ اپنی بات جاری رکھئے

حساب کا استاد۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زمین گردش کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب زمین گردش کرتی ہے تو جو چیز زمین میں گڑی ہے وہ کیسے ساکت رہے گی۔

جغرافیہ کا استاد۔ کمال ہے بھئی اس عمر میں انھیں سب کچھ اسی طرح یاد ہے جیسا میں نے پڑھایا تھا۔ ہاں تو جغرافیہ میں ۱۰ میں ۱۰

ہیڈ ماسٹر۔ حضرات! ابھی تک امیدوار نے اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی ہے صرف حساب کا امتحان باقی رہ جاتا ہے۔

چمن چمن والا۔ (گھبرا کر) ارے میں تو پاس ہوا جا رہا ہوں۔ خیر اب دیکھا جائے گا۔

حساب کا استاد۔ ہاں تو میں دو سوال پوچھوں گا۔ ایک کے نمبر ۳۰ ہیں اور دوسرے کے ۶۰۔ پہلا آسان ہے اور دوسرا مشکل اس کا خیال رکھئے کہ آپ نے اگر غلط جواب دیا تو صفر ملے گا۔ حساب میں یہی ہوتا ہے۔

چمن چمن والا۔ جی ہاں یہ امید تو ہی۔ میرے لئے تو ہر سوال مشکل ہے۔ تم نے مجھے پڑھایا ہی کیا ہے۔ میں رہی جاہل کا جاہل ہوں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ دو دو پانچ ہوتے ہیں یا اگر ۵ نارنگیوں میں ۵ سنگترے ملا دئے جائیں تو وہ اٹھارہ امرود ہو جائیں گے

حساب کا استاد۔ جناب امیدوار صاحب زیادہ تیزی مت دکھایئے یہ امتحان ہے اور آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں۔ یہ بتایئے کہ ایک آدمی ایک گھنٹہ میں پانچ میل جاتا ہے تو چار آدمی مل کر کتنے میل جائیں گے۔

چمن چمن والا۔ (جلدی سے) چار پنجے بیس۔ اوہ (منہ پیٹتا ہے اسے باپ رے۔ میں نے کیا غضب کیا کہ صحیح جواب دے دیا۔ اب تو یہ مجھے پاس کر دے گا۔ ماسٹر صاحب مجھے سوچنے دیجئے۔ میں سوچ کر جواب دوں گا ٹھہرئے ٹھہرئے

حساب کا استاد۔ یہ امتحان ہے۔ تماشہ نہیں ہے۔ بس ہو چکا جواب دوبارہ موقع نہیں دیا جا سکتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب! یہ جواب غلط ہے اور انھیں صفر دیا جاتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ یہ کیا غضب کر رہے ہیں۔ خدا کے واسطے.....

چمن چمن والا۔ گھبراتے کیوں ہیں۔ میری فیس واپس لایئے۔ میں فیل ہو گیا ماسٹر صاحب میں فیل ہو گیا کیوں؟

حساب کا استاد۔ جی جناب آپ مذاق مت سمجھئے گا۔ آپ واقعی فیل ہو گئے ہیں میرا خیال ہے کہ امیدوار کی درخواست مناسب ہے امیدوار سخت جاہل ہے اور ہمارے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اسے حق ہے کہ اپنی فیس واپس لے لے۔

ہیڈ ماسٹر۔ اچھا یہ آپ کا ہی خیال ہے ماسٹر صاحب۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔

حساب کا استاد۔ یہ ایک معیاری اسکول ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسکول کے اس معیار کو گرنے نہ دیں۔ یہ طالب علم پاس ہونے کا مستحق نہیں۔ (جھن جھن والا کی طرف دیکھ کر) ہاں صاحب آپ کا کتنا روپیہ اسکول کے ذمہ نکلتا ہے۔

جھن جھن والا۔ دیکھئے جناب! میں نے یہاں چھ سال تعلیم پائی ہے۔ پہلے دو سال میں، میں نے یہاں چار روپیہ مہینہ کے حساب سے فیس دی۔ یعنی دو سال میں ۹۶ روپیہ، اگلے سال میں آپ نے ایک تہائی اور بڑھا دیا یعنی ۶۰ روپے سال یعنی ۱۲۰ روپے اور پھر آخری دو برسوں میں آپ نے ۶ روپیہ ۸ آنے کے حساب سے فیس لی اس طرح تین سو بہتر ہوتے ہیں۔ اس میں امتحان کی فیس دس روپے چار آنے سال کے حساب سے ۶ سال کی مبلغ ۶۱ روپیہ آٹھ آنے یعنی ۳۷۲ روپیہ اور ۶۱ روپیہ ۸ آنے برابر ہوئے ۴۳۳ روپے آٹھ آنے کے اس میں کتابوں، کاپیوں اور پنسلوں کے ۲۵۱ روپے ساڑھے بارہ آنے اور شامل کر لیجئے اس طرح کل ملا کر ۶۸۴ روپے ساڑھے بارہ آنے ہوئے

ہیڈ ماسٹر۔ ارے چھ سو چوراسی روپے، ساڑھے بارہ آنے

جھن جھن والا۔ ٹھہریئے ٹھہریئے۔ ان میں جرمانوں کی رقمیں بھی تو جوڑنا ہیں جو آپ لوگ بہانے بنا بنا کر وصول کیا کرتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر۔ جرمانوں کی رقمیں

جھن جھن والا۔ خیر چلئے جرمانوں کو معاف کیا۔ ہاں تو کل ہوئے ۶۸۴ روپے ساڑھے بارہ آنے۔ چلئے چھ پائی بھی چھوڑ دیجئے۔ لایئے ۶۸۴ روپے بارہ آنے داہنے ہاتھ سے

حساب کا استاد۔ (جلدی سے) ٹھہرو ٹھہرو میں پہلے جوڑ لوں

جھن جھن والا۔ جناب جوڑ لیجئے۔ آپ اپنے سے بڑا حساب داں تو کسی کو سمجھتے نہیں

حساب کا استاد۔ ہاں ہاں بالکل صحیح ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے آنہ پائی سے ٹھیک ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ بڑا مشکل سوال تھا جو تم نے ذرا سی دیر میں زبانی حل کر دیا۔

جھن جھن والا۔ (گھبرا کر نہ سمجھتے ہوئے) تمہارا مطلب؟

حساب کا استاد۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سوال میں انھیں ۶۰ میں ۶۰ ملے پہلا سوال آسان تھا لیکن ان سے غلطی ہوئی مگر فیس کے سلسلے میں ان کے دوسرے سوال کا نتیجہ بالکل صحیح ہے۔

جھن جھن والا۔ اچھا تو تم نے یہ سوال پوچھا تھا۔ اوہ میں کیا کروں۔

ہیڈ ماسٹر۔ حضرات! میں نتیجہ پیش کرتا ہوں۔ مسٹر جھن جھن والا نے یہ امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا۔ انھیں حق ہے کہ جو سرٹیفکیٹ انھیں دیا گیا تھا اسے اپنے پاس رکھیں۔ ہم لوگ آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں (اور تم سے زیادہ اپنے آپ کو اس مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں کیونکہ ہم نے تم کو ایسا پڑھایا کہ تم اس امتحان میں کامیاب ہو سکے اب جبکہ تمہارا امتحان لیا جا چکا ہے (ایک دم سے تیور بدل کر چیخ اٹھتا ہے)۔ اب نکلو یہاں سے فوراً، ورنہ ابھی دھکا دے کر نکلوا دوں گا (جلدی جلدی گھنٹی بجاتا ہے) چپراسی۔ بڑے بابو۔

جھن جھن والا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔

ہیڈ ماسٹر۔ ارے نکلتا ہے یا ابھی دھکے دے کر نکالوں۔ بڑے بابو اسے نکالو یہاں سے۔

جغرافیہ کا استاد۔ صاحب یہ نالائق کہیں کا۔ میرے سامنے اپنا عمل دقوع نہیں سمجھتا۔

چپراسی۔ سرکار آپ کہیں تو میں انھیں لے جاؤں۔

ہیڈ ماسٹر۔ اسے اٹھا لیجاؤ اور اسکول کے باہر پھینک دو۔ (چپراسی لے جاتا ہے) چلئے قصہ پاک ہوا

سائنس کا استاد۔ ارے صاحب اپنی کہے جاتا تھا کسی کی سنتا نہیں تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ہم لوگوں کی طرف سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہیڈ ماسٹر۔ صحیح معنوں میں تو ہمیں حساب کے ماسٹر صاحب کا احسان ماننا چاہیئے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اچھا اب آپ لوگ جایئے بڑے بابو۔

(پردہ گرتا ہے)

باب الانتقاد

پروفیسر سجاد باقر رضوی

فیض احمد فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان' کے نام سے ناشرین پبلشرز منہاس اسٹریٹ پیسہ اخبار لاہور نے شائع کیا ہے۔ پوری کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ نظریات سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ متقدمین سے متعلق ہے۔ اور چوتھا حصہ معاصرین سے

میزان کی اہمیت دوگونہ یوں ہے کہ ایک تو وہ ایک فن کار کی تخلیقی تنقید ہے جو محض بندھے ٹکے اصولوں کی تشریح نہیں ہے بلکہ تخلیقی تجربہ کی طرح ایک تجربہ ہے، دوسرے یہ کہ یہ فنکار کے معتقدات ہیں جن سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ذہن خلاق کے تنقیدی مفروضے کس طرح تخلیق پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

دنیا کی تمام اچھی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی چند سوالات کئے گئے ہیں اور ان کا جواب بھی تلاش کیا گیا جو ایک حد تک مجھے خیال انگیز معلوم ہوتے ہیں لہٰذا میں انہیں پھر سے اٹھاتا ہوں اور فیض احمد فیض کے دیئے ہوئے جوابات کا اپنے جوابات سے موازنہ کرتا ہوں۔ میرا پہلا سوال زبان کے مسئلہ سے متعلق ہے یعنی یہ کہ اردو زبان کا پاکستانی طرز زندگی اور ادب میں کیا حصہ ہے اور کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں فیض صاحب کا خیال کچھ تشکیک آمیز نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مضمون "جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا" میں لکھتے ہیں کہ :۔

> ابھی تو یہ طے نہیں ہے کہ ہماری زبان کی صورت کیا ہوگی، ہماری ادبی زبان یعنی اردو ہمارے ملک کے کسی حصے میں بھی روزمرہ بولی کی حیثیت سے رائج نہیں۔ ہمارے بیشتر ادیبوں نے اردو میں نہ کسی بچے کو روٹھتے ہوئے سنا نہ کسی ماں کو لوری دیتے ہوئے، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ روزمرہ زندگی میں دو مرد لڑتے ہیں تو کیا گالی بکتے ہیں اور دو مرد و عورت ملتے ہیں تو پیار کے کیا محاورے استعمال کرتے ہیں ہمارے ادیب کا جہانِ نو جبھی تعمیر ہو سکتا ہے، ہمارے ادیبوں کی موجودہ کتابی زبان عوام کی منہ بولتی ہوئی زبان میں بدل جائے۔ یہ کب اور کیونکر ہوگا یہ ہم نہیں کہہ سکتے ممکن ہے اردو کے معلّیٰ اور مقامی بولیوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہو۔ ممکن ہے اردو ہی ہمارے شہر اور دیہات کی زبان بن جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ادیب کا جہان نو انہیں مقامی بولیوں کے اینٹ گارے سے تعمیر کیا جائے گا۔"

خدا جانے مقامی بولیوں کے اختلاط سے فیض صاحب کا کیا مطلب ہے مگر جہاں تک اردو اور مقامی بولیوں کے تعلق کا سوال ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتی رہیں گی۔ اگر بیشتر ادیب یہ نہیں جانتے کہ بچے

اردو میں کس طرح رو ٹھتے ہیں اور محبت و نفرت کا اظہار اردو میں کس طرح کیا جاتا ہے تو یہ صورت حال مایوس کن نہیں بلکہ ایک طرح سے ادبی صحت کی ضامن ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں کہ ادیب ہمیشہ کسی زبان کی روایات کا پابند ہو۔ آپ کو پیارے صاحب رشید اور علامہ اقبال کا واقعہ تو یاد ہی ہوگا۔ پیارے صاحب خاندان انیس کے چشم و چراغ تھے اور اردو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ علامہ اقبال نے کسی محفل میں کلام سنایا اور پیارے صاحب سے رائے طلب کی سنتے ہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ کیا تم نے یہ سب کچھ اردو میں لکھا ہے؟ ۔ پیارے صاحب کی نظر میں علامہ اقبال کا کلام لکھنؤ کی اردو کی رچی بسی روایت سے علیحدہ تھا اور شاید اسی لئے قابل اعتنا نہ تھا۔ یہاں میں خود پیارے صاحب کا ایک شعر پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی روایتی شاعری کے کتنے پابند تھے : ۔

دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

علامہ اقبال کو جانے دیجئے، فیض صاحب خود اس بات کی مثال ہیں کہ کس طرح ایک روایت کا آدمی دوسری روایت میں نیا خون داخل کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک مثال انگریزی ادب سے بھی دینا چاہتا ہوں۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے چوٹی کے انگریزی ادیب، انگریز نہیں بلکہ اسکاٹ، آئرش، ویلش وغیرہ تھے۔ اور بیسویں صدی کے اوائل کا ایک مشہور انگریزی ناول نگار (CONRAD) پولینڈ کا رہنے والا تھا۔ اس کی دوسری زبان فرانسیسی اور تیسری زبان انگریزی تھی۔ میں ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ادب کا جہان نو اس صورت میں پیدا ہو یا نہ ہو لیکن اس وقت اس کے امکانات زیادہ ہیں اس لئے کہ ادیب کے لئے زبان کے ساتھ ساتھ خیالات و احساسات کی توانائی و قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں تک اردو کے بولنے اور سمجھے جانے کا تعلق ہے مغربی پاکستان کی کثیر آبادی اس زبان کو بولتی ہے اور اس سے زیادہ اسے سمجھتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟ فیض صاحب تہذیب کے دو پہلو بتاتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ قومی تہذیب کے باطنی حصے میں وہ تمام مادی، اخلاقی، جمالیاتی اقدار، عقائد و تجربات کو شامل کرتے ہیں اور ان کے نزدیک قدریں دو طرح نمایاں ہوتی ہیں: ایک ناتراشیدہ صورت میں جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں دوسری تراشی ہوئی ڈھلی ہوئی صورت جو حسن کی تخلیق سے تعلق رکھتی ہے ــــــ تہذیب کی اس تعریف سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو اخلاقی و جمالیاتی اقدار، عقائد اور امنگوں، اور تجربوں کی راہ متعین کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف ممالک کے اقدار و عقائد مختلف ہوتے ہیں اور ان کا تعلق ان کے اپنے اپنے فلسفۂ زندگی اور نظام حیات سے ہوتا ہے پس اگر ہم پاکستان کے باشندوں کے لئے ایک علیحدہ فلسفۂ زندگی اور نظام حیات کا تصور رکھتے ہیں تو ہم اپنے ملک کے عقائد و اقدار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ فیض صاحب پاکستانی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں: ۔

"ہماری تہذیب کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی بسم اللہ کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کے تہذیبی ماٹر کی عمر پانچ ہزار برس سے اوپر ہے۔ چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ موہنجوڈارو اور ہڑپا سے شروع کریں۔ اگر یہ صورت ہمیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ بھی اپنانا ہوگا جو درمیانی ادوار میں ویدک، برہمنی، یونانی اور بدھ معاشروں نے پیدا کیا۔

اس میں یہ الجھن ہے کہ ہمیں اپنے فنی اور تہذیبی تصور اور تخیل میں کافی ترمیم کرنی پڑیگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ برصغیر ہند میں مسلمانوں کے ورود سے شروع کریں اس میں یہ الجھن ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم، وطن یا تہذیب کے نمائندے نہ تھے، ان میں عرب بھی تھے ایرانی بھی، تورانی بھی، افغانی بھی، ہر ایک کی تہذیب الگ اور تاریخ جدا۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اشتراک اور طویل تاریخی اختلاط کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ ضرور ہیں۔ لیکن کوئی ترک عربی تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں، نہ کوئی عرب ایرانی تہذیب و تاریخ کی وراثت قبول کرتا ہے۔ پھر ان سب تہذیبوں کی ابتدا از منۂ قبل اسلام میں ہوتی ہے اور ان کے موجودہ نام لیوا اس قدیم وراثت سے منکر ہیں نہ شرم سار۔ عرب امرا القیس کے معتقد ہیں تو ایرانی تخت جمشید پہ نازاں، مصری تہذیب فراعنہ پہ اتراتے ہیں تو مغول فاتح عالم چنگیز خاں کے مآثر کی تلاش میں سرگرداں۔ ظاہر ہے کہ ہماری تہذیب کا مولد نہ امرا القیس کا نجد ہے نہ جمشید و ضحاک کا ایران، نہ چنگیز و ہلاکو کا ترکستان۔ ہم اپنی تہذیب کا نقطۂ آغاز جو کبھی ٹھرائیں ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ اس تہذیب کا مولد و مسکن اسی سرزمین پر ہے اور ہونا چاہیئے ورنہ ہم اسے قومی یا پاکستانی نہ کہہ سکیں گے۔"

یہ خیال کہ ہماری تہذیب کا مولد و مسکن ہماری سرزمین ہے۔ اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں تاہم عقائد و اقدار کا تعلق کسی نہ کسی فلسفۂ حیات و نظام زندگی سے ضرور ہوتا ہے۔ اور یہی فلسفۂ زندگی و نظام حیات، ہمارے اقدار و عقائد کی شکل متعین کرتا ہے لیکن اس تشکیل و تعین میں جغرافی ماحول اور معاشرتی روایات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب دو اصولوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ پہلا اصول فلسفۂ زندگی اور اس سے پیدا شدہ نظام اقدار و اعتقادات سے متعلق ہے جسے میں تہذیب کا پدری اصول کہتا ہوں۔ دوسرا اصول سرزمین' اس کے تاریخی و جغرافیائی حالات اور مادی وسائل ہیں جنہیں میں تہذیب کا مادری اصول کہتا ہوں ——— ان دونوں اصولوں کی مدد سے ہم برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مسلمان' چاہے وہ ایرانی ہوں یا تورانی، افغانی ہوں یا عرب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ اپنا مذہب، اپنا فلسفۂ حیات، اپنی تاریخ، اپنی زبان، اپنے رسوم اپنے اعتقادات بھی لائے اور اس طرح جب انہوں نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا تو فلسفۂ حیات اور اس کے پیدا شدہ نظام اقدار و اعتقادات نے خود کو یہاں کی سرزمین کے حالات و مادی وسائل میں ظاہر کیا اور یہی یہاں کے مسلمانوں کی تہذیب ٹھری۔ اب اسی بات کو یوں کہیئے کہ ہم اگر ہندوستانی ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں تو وہ صرف تہذیب کے مادری اصول یعنی سرزمین کے رشتے سے، اور اگر ایرانی و تورانی و افغانی و عربی مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں تو تہذیب کے پدری اصول یعنی اعتقادات و نظامِ اقدار کے رشتے سے

اسی طرح ہم اقدار کے مسئلہ کو بھی سمجھ سکتے ہیں یعنی یہ کہ اقدار میں کون سا عنصر قائم اور کون سا تغیر پذیر ہوتا ہے مگر فیض صاحب اس مسئلہ کو یوں نہیں دیکھتے۔ ایک مقام پر وہ انسانی زندگی کے بنیادی تجربات اور بنیادی قدروں کو تسلیم کرتے ہیں مگر فوراً ہی "بنیادی تجربہ" اور "بنیادی قدر" کی اصطلاح کو گمراہ کن بتلاتے ہیں اور بنیادی قدر کو ایک مخصوص دور میں ایکلا کر اس کے محدود اور اضافی معنی مراد لیتے ہیں۔ میں یہاں اُن کے مضمون "شاعر کی قدریں" سے ایک اقتباس

پیش کرتا ہوں :-

"اسی شاعر کی قدریں صحیح ہیں جس کے شاعرانہ جذبات ہمارے دل و دماغ کی تسکین و تزکیہ کا سامان بہم پہنچا سکیں ۔ اور یہ اثر وہی تجربات پیدا کر سکتے ہیں جن میں ہم خود شریک ہو سکیں جن کا صرف شاعر کی زندگی میں ہی نہیں ہماری زندگی میں بھی دخل ہو ۔ ہماری طبیعتیں مختلف ہیں، ہماری ضروریات، ہمارے رہنے سہنے کے طریقے، سب میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود چند تجربات ایسے ہیں جن کا ہم سب کی زندگی میں کچھ نہ کچھ حصہ ہے ۔ اس کے متوازی وہ قدریں ہیں جن کی اہمیت سے گریز ممکن نہیں ۔ عام محاورہ میں انہیں کو انسانی زندگی کے بنیادی تجربات اور بنیادی قدریں کہا جاتا ہے جو شاعر ان کے متعلق زیادہ سچائی اور زیادہ خلوص سے بحث کرے گا اس کی قدریں زیادہ صحیح تصور کی جائینگی اور اس وجہ سے اس کا کلام جمالیاتی اعتبار سے بھی زیادہ قابل وقعت ہوگا ۔

لیکن یہ "بنیادی تجربہ" اور "بنیادی قدر" ذرا گمراہ کن اصطلاحیں ہیں ۔ جب ہم کسی تجربہ یا کسی قدر کو بنیادی کہتے ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی انسانی تجربہ یا کوئی قدر ایسی بھی ہے جو قائم اور جامد ہے اور جس کی صورت ہمیشہ یکساں رہتی ہے ۔ مثال کے طور پر بقائے حیات کی کشمکش، محبت، نفرت، پیار، غصہ، جنس، بھوک اور اسی نوع کے ان گنت مظاہر میں روپ دکھاتی ہے ۔ لیکن انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی صورت بھی پے بہ پے بدلتی رہتی ہے ہر نئے دور کے ساتھ ہتھیار بدلتے ہیں، فوجیں بدلتی ہیں، رن بدلتے ہیں ۔ داؤ پیچ بدلتے ہیں کل کا حریف آج کا ساتھی بنتا ہے اور آج کا ساتھی کل کا دشمن، جب سماجی اور جماعتی تعلقات کا تانا بانا بدلتا ہے تو تجربات اور اقدار کی نسبت بھی اور ہو جاتی ہے اسی لحاظ سے سبھی انسانی تجربات اور اقدار متحرک اور متلون ہوتی ہیں ۔ لیکن اس حرکت اور تلون کے باوجود زندگی میں تسلسل بھی ہے ۔ قبل تاریخ کے وحشی اور آج کل کے مہذب انسان میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اس کے باوجود انسانیت کی صفت دونوں میں موجود ہے ۔ مرد اور عورت کا جسمانی جذباتی تعلق کئی ہزار برس پہلے بھی اہم انسانی تجربہ تھا اور آج بھی ہے ۔ اگرچہ اس کے آداب و اطوار، اس کے سماجی و اخلاقی ضوابط اتنے بدل چکے ہیں کہ اسی جذبے کی موجودہ صورت اور بعض گذشتہ صورتوں میں بہت کم مماثلت ہے ، زندگی، معاش، آزادی اور راحت کے تحفظ یا حصول کی جدوجہد پہلے ادوار میں بھی اہم تھی آج بھی ہے ۔ اگرچہ اس جدوجہد کی عملی و تنظیمی ماہیت بار بار منقلب ہوتی رہی ہے ۔ چنانچہ ہم کسی مخصوص دور میں کسی مخصوص تجربہ یا قدر کو بنیادی کہتے ہیں ۔ تو اس اصطلاح سے ہی محدود اور اضافی معنی مراد لینے چاہئیں ۔"

اس طویل اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدر یا تجربہ میں دو چیزیں کارفرما ہوتی ہیں : (۱) انسان کے

فطری جذبات مثلاً بقائے حیات کی کشمکش کی وہ مختلف صورتیں جو آپ نے مندرجہ بالا اقتباس میں دیکھی ہیں یعنی محبت نفرت، پیار، غصہ، جنس، بھوک وغیرہ (۲) خارجی دنیا اور مادی حالات: ۔ اس میں پہلی چیز قائم اور دوسری تغیر پذیر ہے۔ فیض صاحب جس بات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں وہ خارجی دنیا اور مادی حالات کی تبدیلی ہے۔ میں جس بات کو اہم سمجھتا ہوں وہ پہلی ہے یعنی بقائے حیات کی کشمکش اور اس کشمکش کی مختلف صورتیں محبت، نفرت، جنس، بھوک وغیرہ ۔ اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے ۔ یہ فرق پورے فلسفۂ زندگی کا فرق ہے نسبتوں اور رشتوں کی تبدیلی سے قدروں کے بدلنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم خارجی عوامل اور ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہوئے مادی وسائل کے غلام ہیں ۔ یورپ کا المیہ یہی ہے ۔ وہاں ہر سو پچاس برس کے بعد طرزِ زندگی، فلسفۂ حیات سب کچھ خارجی ماحول کے مطابق بدل جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ صنعت و حرفت کی اعلیٰ ترقیوں کے باوجود ان کی روحیں پیاسی ہیں ۔ میں قدروں اور تہذیب کے جامد ہونے کا قائل نہیں مگر میں اس بات کا قائل ضرور ہوں کہ ہمیں تبدیلی میں سکون اور سکون میں تبدیلی دیکھنی چاہیئے یعنی یہ کہ ہمارے نئے تجربات کی بنیاد تہذیبی اقدار پر ہونی چاہیئے اور اقدار کی بنیاد زندگی کے اعلیٰ تجربوں پر اور صرف اسی طرح ہم ساکن و متحرک اقدار پہ بیک وقت نظر رکھ سکتے ہیں ۔ اور اصل زندگی کا مقصد ساکن متحرک، تہذیب و تجربہ دونوں کا شعور ہے ۔ اس لئے کہ تہذیب نام ہے زندگی کے اعلیٰ تجربات کو گرفت میں لے کر انہیں قائم کر دینے کا اور تخلیق ترقی و حرکت نام ہے زیادہ سے زیادہ تجربے کرنے کا ۔ اسی لئے ہر زندہ تہذیب کی بنیاد اعلیٰ تجربوں پر ہوتی ہے اور ہر اعلیٰ تجربے کی بنیاد تہذیب پہ جو مجموعہ ہے زندگی کے اعلیٰ تجربات کا یہی بات سائنس اور فن میں بھی صحیح ہے اور شعور کی تہذیبی دنیا کے لئے بھی ۔

باب الاستفسار

شاہ نعمت اللہ کی پیش گوئی

(جناب محمد عمران - بھاگلپور)

شاہ نعمت اللہ ولی کی ایک نظم کا ذکر اکثر سننے میں آیا ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس میں شاہ صاحب نے متعدد پیش گوئیاں کی ہیں۔ جو سب صحیح ثابت ہوئیں۔ اس کے جستہ جستہ اشعار نظر سے گذرے ہیں مگر پوری نظم نہیں دیکھی۔ یہ کون بزرگ تھے اور کس زمانے میں ہوئے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ذریعہ نگار مطلع فرمائیے کہ آپ کی رائے ان پیش گوئیوں کے متعلق کیا ہے اور پوری نظم کتنے اشعار کی ہے

(نگار) شاہ نعمت اللہ تیمور کے آخری دور کے شاعر و درویش تھے۔ ان کا نام امیر نورالدین نعمت اللہ تھا۔ ان کے والد کا میر عبداللہ ان کا سلسلۂ نسب پانچویں شیعی امام محمد باقر سے ملتا ہے۔ یہ حلب میں پیدا ہوئے (سنہ ۷۳۱ھ) ۲۲ سال کی عمر میں مکہ گئے۔ سات سال تک یہاں رہے اور یہیں شیخ عبداللہ یافعی کے مرید ہوئے۔ اپنی عمر کے آخری ۲۵ سال مہرانؔ[1] (متصل کرمان) میں بسر کئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا (۲۲ رجب سنہ ۸۳۴ھ) یہ حافظ کے ہمعصر تھے کیونکہ حافظ کا انتقال سنہ ۷۹۱ھ میں ہوا اور ان کا سنہ ۸۳۴ھ میں اور چونکہ انھوں نے ۱۰۰ سال سے زیادہ عمر پائی تھی اس لئے وہ حافظ کے انتقال کے وقت بھی ادھیڑ رہے ہوں گے۔

ریو نے اپنے کیٹلاگ میں ان کے متعدد رسائل تصوف کے علاوہ ایک دیوان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ مغربی اور شمس تبریز کو بھی نہیں پہنچتے۔ حافظ کا کیا ذکر ہے۔

آپ نے جس نظم کا ذکر کیا ہے وہ "مجمع الفصحاء" میں بھی درج ہے۔ لیکن غالباً نا تمام کیونکہ وہ صرف ۲۴ اشعار کی ہے اور براؤن نے جو نقل اس کی خانقاہ نعمت اللہ سے ماہان میں حاصل کی تھی وہ ۵۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے یہ نظم سن لیجئے۔

قدرت کردگار می بینم ‏ ‏ حالت روزگار می بینم

حال امسال صورتے دگر است ‏ ‏ نہ چو پیرار و پار می بینم

از نجوم ایں سخن نمی گویم ‏ ‏ بلکہ از کردگار می بینم

عین و رای چوں گذشت از سال ‏ ‏ بوالعجب کار و باری بینم

در خراسان و مصر و شام و عراق ‏ ‏ فتنہ و کارزار می بینم

---

[1] یہ وہی مہرانؔ ہے جس کا ذکر ایک ایرانی شاعر نے اس طرح کیا ہے ؎

بہشت روئے زمین است خطۂ ماہان ‏ ‏ بشرط آنکہ کسانش دہند سوئے دوزخ

(ماہان روئے زمین کی بہشت ہے بشرطیکہ پہلے یہاں کے لوگوں کو دوزخ میں ڈال دیا جائے)

ظلمت ظلم ظالمان دیار بجد بے شمار می بینم

قصہ بس عجیب می شنوم غصہ در دیار می بینم

جنگ و آشوب و فتنہ بیداد از یمین و یسار می بینم

غارت و قتل و لشکر بسیار درمیان کنار می بینم

بندہ را خواجہ وش ہمی بینم خواجہ را بندہ وار می بینم

سکہ نو زنند بر رخ زر در ہمش کم عیار می بینم

دوستان عزیز ہر قومی گشتہ غمخوار و خوار می بینم

ہر یک از حاکمان ہفت اقلیم دیگری را دوچار می بینم

ماہ را رو سیاہ می بینم مہر را دل فگار می بینم

نصب و عزل تبکچی و عمال یکے، دو بار می بینم

ترک و تاجیک را بہم دیگر خصمی و گیر و دار می بینم

تاجر از دست دزد بے ہمراہ ماندہ در رہگذار می بینم

مکر و تزویر و حیلۂ بسیار از صغار و کبار می بینم

حال ہندو خراب می یابم جور ترک و تتار می بینم

بقعۂ خیر سخت گشتہ خراب جائے جمعی شرار می بینم

اندکی امن اگر بود آن ہم در حد کوہسار می بینم

ہمدمی و قناعت و کنجی حالیا اختیار می بینم

گرچہ می بینم این ہمہ غمہا شادی غمگسار می بینم

غم مخور زانکہ من درین تشویش خرمی وصل یار می بینم

بعد امسال و چند سال دگر عالمی چون نگار می بینم

این جہاں را چو مصر می نگرم عدل او را حصار می بینم

ہفت باشد وزیر سلطانم ہمہ را کامیار می بینم

عاصیاں از امام معصومم خجل و شرمسار می بینم

برکف دست ساقی وحدت بادۂ خوشگوار می بینم

غازی دوستدار دشمن کش ہمدم و یار غار می بینم

تیغ آہن دلان زنگ زدہ کند و بے اعتبار می بینم

زینت شرع و رونق اسلام ہر یکی را دو بار می بینم

گرگ با میش و شیر با آہو در چرا برقرار می بینم

گنج کسری و نقد اسکندر ہمہ بر روئے کار می بینم

ترک عیار مست می نگرم — خصم او در خمار می بینم
نعمت اللہ نشستہ در کنجی — از ہمہ بر کنار می بینم
چون زمستان پنجم بگذشت — ششمش خوش بہار می بینم
نائب مہدی آشکار شود — بلکہ من آشکار می بینم
پادشاہی تمام دانائی — شاہ عالی تبار می بینم
بعد از و خود امام خواہد بود — کہ جہاں را مدار می بینم
میم، حا، میم، دال می خوانم — نام آں نامدار می بینم
صورت و سیرتش چو پیغمبر — علم و حلمش شعار می بینم
ید بیضا کہ باد پایندہ — باز با ذوالفقار می بینم
مہدی وقت و عیسیٰ دوراں — ہر دو را شہسوار می بینم

گلشن شرع را ہمی بویم
گل دین را ببار می بینم

اس نظم میں صرف چوتھا شعر ایسا ہے جس میں عین۔ را۔ دال سے ایک تاریخ متعین کرکے بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد یہ فسادات ہوں گے۔ ان حروف کے اعداد کا مجموعہ حساب ابجد کی رو سے ۲۰۰+۴+۷۰ (۲۷۴ھ) ہوتا ہے جو شاہ نعمت اللہ سے ساڑھے چار سو سال پہلے کا زمانہ تھا اور گذرے ہوئے زمانے کا حال بیان کرنا پیش گوئی نہیں کہلاتی بلکہ اس کا تعلق تاریخ سے ہے

کہا جاتا ہے کہ ایک نسخہ میں "عین۔ را۔ دال" کی جگہ "س۔ را۔ غ" پایا جاتا ہے جس کے عدد ۱۲۶۰ ہوتے ہیں اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ شاہ صاحب کی تمام پیش گوئیوں کا تعلق ۱۲۶۰ھ کے بعد کے زمانہ سے ہے۔ لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فتنہ تاتار وغیرہ سب اس سے بہت پہلے رونما ہو چکے تھے تو یہ پیش گوئی اور زیادہ لغو و بے معنی نظر آتی ہے لیکن شیعی عقائد کی رو سے ظہور مہدی کی بشارت البتہ پیش گوئی ہو سکتی ہے۔ جس کا امامیہ طبقہ منتظر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم شاہ نعمت اللہ سے غلط منسوب کی گئی ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کلیات کے کسی مطبوعہ نسخہ میں یہ نظم شامل نہیں ہے۔ بات دراصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ نعمت اللہ باوجود صوفی مشرب ہونے کے شیعی عقائد رکھتے تھے اور بعد کو جب ان کی اولاد کے رشتے صفوی خاندان میں ہوئے تو ان کے تشیع نے اور زیادہ شدت اختیار کر لی اور اسی وقت کسی ایرانی شاعر نے از خود یا صفوی خاندان کے اشارہ سے یہ نظم لکھ کر شاہ نعمت اللہ سے منسوب کر دی جس کا اصل مقصود فتنہ تاتار وغیرہ کا ذکر کرنا نہ تھا بلکہ صرف ظہور مہدی و مسیح کی پیش گوئی کرنا تھا جو شیعی عقائد کا جزو لازم ہے

---

(۲)
حافظ کا ایک شعر

(سید بدر الحسن پشاور)

حافظ کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست — ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

لفظ "تشریف" اردو میں جس محل پر استعمال کیا جاتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے مثلاً کوئی معزز شخص آ جاتا ہے تو تشریف لانا یا تشریف لے جانا کہتے ہیں۔ لیکن حافظ کے اس شعر میں لفظ تشریف کا استعمال اور اس کا تعلق "بالائے کس" سے سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اس کے معنی محض اعزاز بخشنے کے ہیں تو بھی وہ جسم انسانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(نگار) اردو میں اس کا استعمال بے شک اسی مفہوم میں ہوتا ہے جو آپ نے ظاہر کیا اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ تشریف کے معنی اعزاز بخشنے کے ہیں جس کا تعلق جسم انسانی سے نہیں، لیکن فارسی میں یہ لفظ "پارچۂ خلعت" کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے کیونکہ سلاطین و امرا کی طرف سے جب کبھی کسی کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا تو بہ سلسلۂ انعام و اکرام جو خلعت عطا ہوتا تھا اس میں عبا یا قبا کا شمول بھی ضروری تھا جس کا تعلق جسم انسانی سے ظاہر ہے۔

حافظ کے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "اگر تیری نوازش کرم سے ہم محروم ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، ورنہ یوں تو ہر شخص اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

بالکل اسی مفہوم کو مشہور نعت گو شہیدی نے نہایت مؤثر انداز میں اس طرح ظاہر کیا ہے:-

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

---

(۳)

شبدیز

(میرزا عبدالغفار بیگ گورکاؤں)

فارسی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبدیز گھوڑے کو کہتے ہیں چنانچہ مجازاً قلم کو بھی "شبدیز قلم" لکھتے ہیں لیکن یہ استعمال میری سمجھ میں نہیں آیا اور آپ سے میں اس کی صراحت چاہتا ہوں۔

نگار :- "شبدیز" مرکب لفظ ہے جس کا پہلا جزو شب ہے اور دوسرا دیز۔ شب کے معنی رات کے ہیں اور دیز یا ویس کلمۂ نسبت ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ شب دیز کا وہی مفہوم ہے جو "شب رنگ" کا۔

شبدیز کے معنی گھوڑے کے نہیں ہیں بلکہ دراصل یہ نام تھا "خسرو پرویز" کے ایک گھوڑے کا جس کا رنگ سیاہ یا مشکی تھا بعد کو مجازاً اس کا استعمال بہ لحاظ سیاہ نویسی قلم کے لئے بھی ہونے لگا۔

منظومات

پروفیسر شور علیگ

عرفانِ ذات

میرا طرزِ سخن، میرا اندازِ فن ۔۔۔ نغمۂ باربدؔ، تیشۂ کوہکن
میری تخییل ارض و سما کو محیط ۔۔۔ میرے افکار طغیانِ ساحل شکن
میرا نقشِ قدم منزلوں کا چراغ ۔۔۔ میرا ظرفِ نظر آبروئے سخن
مجھکو ننگِ ہنر کم سوادوں کی داد ۔۔۔ میری گردِ نظر گرمیٔ انجمن
ہیں خدائے سیاست نہ معبودِ جہل ۔۔۔ مجھکو سجدہ کریں کیوں حریفانِ فن
زخمہ خود، ساز خود، اپنی آواز خود ۔۔۔ کوئی حلقہ نہ میری کوئی انجمن
میں وہ اولِ صبح کا زرفشاں آفتاب ۔۔۔ شب کے سینے سے پھوٹی ہے جس کی کرن
مجھکو ہر خاک پر آدمی کی تلاش ۔۔۔ تو اسیرِ حبش تو رہینِ یمن
میری آواز آوازِ کون و مکاں ۔۔۔ تیرا نغمہ فقط نغمۂ انجمن
تجھ کو نالے کا دکھ مجھ کو نغمے کا غم ۔۔۔ تو ہلاکِ قفس، میں ہلاکِ چمن
تو فقط حسرتِ صید کا نغمہ سنج ۔۔۔ میں شہیدِ گل و کشتۂ یاسمن
مجھکو اپنے گریباں کی منتِ رفو ۔۔۔ چاک خود میرے ہاتھوں مرا پیرہن
چند کلیاں تری منتہائے نظر ۔۔۔ میرا دعویٰ کہ میرا چمن ہر چمن
تو کبھی زاغوں میں سہما ہوا ۔۔۔ میں شکستوں میں بھی خندہ زن
میں تہِ دام بھی صد گلستاں بدوش ۔۔۔ تو سرِ دشت بھی آہوئے بے ختن
یہ مرا نقشِ پا، وہ مرا سنگِ میل ۔۔۔ میری راہوں کی منزل نہ گلشن نہ بن
تیری نظروں میں صدیوں کی تاریکیاں ۔۔۔ اور میری نظر میں کرن ہی کرن
ذات تیری نظر جسم، میرا ضمیر ۔۔۔ میں چراغِ خدا تو دلِ اہرمن
میں دیارِ بتاں میں بھی یزداں شناس ۔۔۔ اور کعبے کے اندر بھی تو برہمن
تو کہاں میں کہاں ہوں بھلا یہ تو سوچ ۔۔۔ تو پرستارِ بت، اور میں بت شکن
باوجودِ درود و سجود و سلام ۔۔۔ کچھ نہ بن کم سے کم ایک انسان بن

اپنے ماحول کو سارا عالم نہ جان
آسماں ہر زمیں پہ ہے سایہ فگن!

ضیا شبنمی

آج کیوں اٹھتی ہے رہ رہ کے مرے دل میں کسک سوچتا ہوں کہ تمہیں یاد کروں یا نہ کروں
اِک آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے ہمدم ختم اب عشق کی روداد کروں یا نہ کروں
کیا قیامت ہے مرا عالمِ تنہائی بھی غم کو بارانِ وطن یاد کروں یا نہ کروں

شارق نیازی

نہ وہ دل نہ وہ امنگیں نہ وہ شوق کا زمانہ میں فسانہ آپ ہی ہوں تو سناؤں کیا فسانہ
نہ کبھی بجھی سی صبحیں، یہ اداس اداس راتیں نہ وہ آہِ صبحگاہی نہ وہ نالۂ شبانہ
نہ وہ دلنشیں تبسم نہ وہ دلفریب وعدہ نہ کرشمہ وہ کرشمہ نہ بہانہ وہ بہانہ
کسی دیر آشنا کا وہ حجاب وہ تکلف وہ پیام زیرِ لب کچھ وہ سلام غائبانہ
وہ طلسم آرزو کا وہ فریب رنگ و بو کا!
مرے شوق کی وہ دنیا وہ قفس وہ آشیانہ

آزاد انصاری (مرحوم)

سختیٔ تعزیر اٹھالی جائیگی رحم کی خواہش دبالی جائیگی
کیا خبر تھی پردہ ہائے لطف میں جور کی ہنسیاں ڈالی جائیگی
کون واقف تھا کہ شکلِ آرزو درد کے قالب میں ڈھالی جائیگی
اب دلِ ناکام ہے اور فرطِ یاس اب طبیعت کیا سنبھالی جائیگی
التماسِ شوق سے کیا فائدہ جانتا ہوں بات خالی جائیگی
شکوۂ غم پر کہا تو یہ کہا لذتِ غم بھی اٹھالی جائیگی
نازِ خودداری غلط ثابت ہوا عادتِ تسلیم ڈالی جائیگی

شفیق کوٹی

آنکھوں میں جو میری بس گیا ہے جی اس کے لئے ترس گیا ہے
بچھڑے ہوئے جب کبھی ملے ہیں آنکھوں سے لہو برس گیا ہے

شارق ایم اے

اشک آگئے آنکھ میں لہو کے انجام پر آگیا فسانہ

اک آگ سی لگ گئی چمن میں　　آیا جو بہار کا زمانہ
پھرتی ہے نگاہ میں ابھی تک　　وہ اس کی ادائے کافرانہ
تازہ ہوئے زخم دل کے شارق　　آتے ہی بہار کا زمانہ

سعادت نظیر

اے غمِ عشق! تیری عمر دراز　　ورنہ وہ اور مجھ سے ناز و نیاز
پوچھیے مجھ سے، غیر کیا جانے　　آپ کی راہ کے نشیب و فراز

شفقت کاظمی

آئی کہیں نہ پھر سے صدائے درا مجھے　　کن راستوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے
روکے سے جوشِ اشکِ ندامت نہ رک سکا　　آئی ہے یاد جب کوئی اپنی خطا مجھے
تیری جدائیاں تو گوارا بھی ہو گئیں　　لیکن تیرا خیال ستاتا رہا مجھے
وہ زندگی کا دور جو بے صبر نہ کٹ گیا　　اکثر اسی کی یاد نے تڑپا دیا مجھے
وہ بارگاہِ ناز کہاں اور میں کہاں　　لے جوشِ اضطراب کہاں لے چلا مجھے

جن دوستوں نے بات نہ پوچھی تمام عمر
شفقت رہی انہیں سے امیدِ وفا مجھے

فضا جالندھری

کبھی قافلے کے آگے کبھی قافلے کے پیچھے　　نہ میں کارواں میں شامل نہ جدا ہوں کارواں سے
صرف اس لئے کہ ترکِ تمنا نہ کر سکوں　　وہ مسکرا کے عمرِ تمنا بڑھا گئے
ہر چند ضبطِ عشق میں ہم نے کمی نہ کی　　لیکن وہ دل کا راز نگاہوں سے پا گئے
نہ آسودہ خاطر ہو اے ہم صفیرو　　فضا میں ابھی بجلیاں اور بھی ہیں۔

فراق گورکھپوری

آخر فراق بن ہی گئی جان پر تری　　کمبخت پڑ گئی نہ کسی پر نظر تری
کیا پردہ داریاں ہیں تری اے نگاہِ مست　　تہ پا سکا کوئی بھی نہ اے بے خبر تری
اے وعدہ کر کے بھول نے والے ترے نثار　　جینا پڑے گا کتنے دنوں بات پر تری
جاتے ہوؤں کو دیکھ کر انجان بن سکوں　　پا جاؤں جو کہیں تو چرا لوں نظر تری
ناکامیاں ملی ہیں کچھ اے جلوہ گہِ ناز　　ہم تیرہ بخت آئے تھے امید پر تری
کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی　　اٹھتی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری
یہ سوز و ساز اے غمِ ہستی ترے نثار　　تصویر ہو کے رہ گئی شمعِ سحر تری

صبحِ شبِ فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہ گزر تری

مطبوعات موصولہ

دستِ سبو ۔ ناشرین ۔ بزم ارتقائے ادب کوئٹہ

دستِ سبو کوئٹہ کے پہلے صاحب دیوان اردو شاعر جناب اصغر کا مجموعہ کلام ہے۔ آغاز کتاب میں علامہ عیش فیروز پوری نے بڑے اختصار و جامعیت کے ساتھ چند اشعار میں کلام اصغر کی خصوصیات کا تعارف کرایا ہے بعدہٗ پروفیسر اسلم قریشی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں اردو شاعری کا ارتقائی جائزہ لے کر اصغر کی شاعرانہ قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود مصنف نے "عرض حال" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک طرف ان کے مزاج اور طرزِ سخن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے دوسری طرف کوئٹہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔

اصغر صاحب اگرچہ طرزِ قدیم کے غزل گو شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری محض روایتی نہیں ہے۔ ان کے یہاں فکر و تخیل کی ندرتیں بھی ملتی ہیں۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ غزل کے مخصوص مزاج سے آشنا ہیں اور اسی لئے وہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ، لوچ، نرمی اور لطافت میں کہیں فرق نہیں آنے دیتے۔ اسی کے ساتھ چونکہ انھیں زبان و بیان دونوں پر ندرت حاصل ہے اس لئے ہر قسم کے خیال کو بڑے سادگی و دلکشی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں مولانا حالی نے غزل کی تین شرطیں بتائی ہیں۔ سادہ ہو۔ پر جوش و پیرزور ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ اصغر کی غزلوں میں روایتی اسلوب کے باوجود یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ ممکن ہے شاعر کے افکار و خیالات میں آپ کو کوئی فلسفیانہ ژرف نگاہی نہ ملے لیکن چونکہ ان کے جذبات متعلق بہ محسوسات ہیں اور وہ انھیں بے تکلفی و سادگی سے شعر میں ڈھال دینے پر قادر ہیں۔ اس لئے ان کے اشعار متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

بظاہر ان کے موضوعات شعری کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہیں ہے بلکہ زیادہ تر حسن و عشق کے بیان ہی تک ہے لیکن خود حسن و عشق کی دنیا کس درجہ وسیع اور کتنی دلکش و نظر گیر ہے اس کا اندازہ اصغر کے کلام کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اصغر صاحب زمانے کی رفتار سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔

ان کے یہاں سیاسی و سماجی شعور بھی اکثر جگہ ملتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار دیکھئے ان میں فکر و فن کا جو حسین امتزاج ملتا ہے وہ اصغر صاحب کی شاعرانہ قدر و قیمت متعین کرنے میں شاید آپ کو امداد دے سکے۔

خدا جانے بہار آئے نہ آئے ✦ گلوں پر پھر نکھار آئے نہ آئے

ضرور ان کو سنائیں حال اپنا ✦ بلا سے اعتبار آئے نہ آئے

ترے غم کو چھپایا ہر کسی سے عمر بھر میں نے ✦ نہ ہونے دی کبھی آنکھوں کو بھی دل کی خبر میں نے

نشیمن ہے پرانے حادثوں کی یادگار اب بھی ✦ سر گلشن چمک جاتی ہے برق بے قرار اب بھی

مرا ہی خون ہے زیب چمن پھر بھی چمن والے ✦ سمجھتے ہیں مجھے ناقابل عہد بہار اب بھی

چھوٹے تو ہم قفس سے مگر آشیاں کہاں ✦ راحت ملی کسی کو تہ آسماں کہاں

وہ آغاز محبت کی نگاہیں یاد ہیں اب تک ✦ کبھی دیکھا ادھر اس نے کبھی دیکھا ادھر میں نے

نگاہ کی رفعتیں سلامت خیال کی وسعتیں بہ زک ٭ خزانہ فصل گل میں کیا ہے۔ خزاں کے دامن میں کیا نہیں ہے
یہ شہر مکیں مشتعل نگاہیں یہ گرم آنسو یہ سرد آہیں ٭ نہیں نہیں تم نہ مرجھاؤ مجھے کسی سے گلہ نہیں ہے

(ف۔ ن)

اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقا) مصنف۔ فرمان فتح پوری
ناشر۔ مکتبۂ سنگ میل کراچی

رباعی اصناف شاعری میں بڑی عجیب، دلکش، انوکھی اور نرالی صنف ہے جو فارسی اردو زبانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اتنی چھوٹی مستقل نظم کسی اور زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ باوجود مختصر ہونے کے اپنے اندر کچھ الگ خوبی اور دلکشی رکھتی ہے یوں سمجھئے کہ آرائش حسن میں ٹیکا اور جھومر بلاشبہ بڑی شان رکھتے ہیں لیکن ناک کی کیل اور ماتھے کی بندی کی اپنی الگ ہی بہار ہوتی ہے۔ اس طرح شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی کی عظمت اور اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن رباعی کے چار مصرعوں میں جو محاسن جمع ہو جاتے ہیں ان کا لطف و اثر بھی انفرادی چیز ہے۔

لیکن تصنیف و تالیف کی دنیا کا عجیب واقعہ ہے کہ رباعی کے فکر و فن اور تاریخ و تنقید اور رفتار و ارتقاء پر اب تک کوئی مستقل تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔ الحمد اللہ کہ اس کمی کو فرمان فتح پوری صاحب نے پورا کر دیا۔ ان کی تصنیف اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء) وہ سب کچھ اپنے اندر رکھتی ہے جس کی رباعی کے صنعت و موضوع کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے۔

فرمان فتح پوری صاحب نے فارسی رباعی کے آغاز و ارتقا سے شروع کر کے اردو رباعی کے متعلق تمام معلومات نہایت مبصرانہ و مورخانہ انداز و اسلوب کے ساتھ جمع کر دی ہیں۔ رباعی کی ایجاد۔ رباعی کے نام رباعی کی خصوصیات، رباعی کی تاریخ، رباعی کا ارتقاء۔ رباعی کے شعراء اور ان کے شعراء کے کلام سے مثالیں۔ یہ سب کچھ ایسی مہارت و کمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے اور دعا بھی کہ توفیق قبول زود رس باد۔

(مولانا حامد حسن قادری)

ٹھنڈی ہواؤں کا نزول، نزلے کا پیش خیمہ

سعالین

تو اس ذہنیت کے خلاف عوام اور خواص میں بغاوت کی ایک لہر دوڑ گئی جس کا حقیقی عروج اس وقت محسوس ہوا جب نواب آصف الدولہ کے زمانے میں ایک طرف ریذیڈنٹ جان بیلی نواب وزیر کو نظر انداز کر کے اودھ کے خانگی معاملہ میں بھی دخل دینے لگا اور دوسری طرف دلی کے دربار نے نواب کو خلعت وزارت دینے سے انکار کر دیا ان حالات میں دربار لکھنؤ کا احساس تفوق زیادہ تیز ہو گیا اور غازی الدین حیدر کے اعلان بادشاہت کے بعد تیز تر ہو گیا۔ ہر چند ادب میں علم و فضل کی نمائش سعادت علی خاں اور ان کے وزیر علامہ تفضل حسین کے اثر سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی لیکن جدید اصول کی ترویج کا غلغلہ غازی الدین حیدر ہی کے زمانہ میں لکھنؤ سے بلند ہوا۔ اب تک بعد الشادلی اور لکھنؤ کی صرف عورتوں ہی کے لباس میں فرق محسوس کر سکتے تھے اب انقلاب و تجدید کی تحریک نے دوسرے شعبوں پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ بقول حضرت اثر لکھنوی " دہلی میں نیچی چولی کا انگرکھا پہنا جاتا تھا یہاں چولی اونچی ہو گئی ایک نہیں تین تین کمر نوشیاں اضافہ کی گئیں۔ کمانیوں کا ذکر نہیں۔ وہاں صرف مغزی ہوتی تھی یہاں سنجاف نے حسن دوبالا کیا۔ کرچین ایجاد ہوئی مندیل کی جگہ تکیے دار ٹوپی لے لی اور چست مہری کا پاجامہ غرارے دار ہو گیا۔ سلیم شاہی جوتا گھیتلا بن گیا۔ ملائی بالائی اور اندھیری اند معیاری ہو گئی اور نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا[۱]۔

لکھنؤ کی یہ امتیازی خصوصیات دلی کے مقابلہ میں کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ محض سماجی رجحانات کا تقاضہ تھیں ہر چند احساس بدحالی کی لہر دہلی سے لکھنؤ بھی آئی لیکن یہاں کی مالی فراغت اور درباری عیش سامانی نے اس پر ایک ایسا ملمع چڑھا دیا کہ زندگی کا زوال فروغ حیات نظر ہونے لگا۔ مریض سماج کے اندر توانائی تو نہ تھی لیکن چہرہ پر سنگ ضرور سا رہا تھا۔ دلی اور لکھنؤ کی زندگی میں اس سے زیادہ کوئی فرق نہ تھا کہ ایک تباہی اور خستہ حالی کی تصویر تھا اور دوسرا تن آسانی اور عیش کوشی کا زوال پذیر نمونہ ہر چند نوابوں کی دریا دلی اور علم دوستی، ملک کی دولت و ثروت اور دار السلطنت کی چہل پہل نے عوام کو اس احساس سے بیگانہ کر دیا تھا کہ وہ زندگی کے زوال آمادہ دور سے گذر رہے ہیں تاہم وقت کے تقاضے اور ماحول کے نئے رجحانات لکھنؤ کے شعر و ادب پر کافی اثر انداز ہوئے۔

غازی الدین حیدر کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک حدود سلطنت، سیاسی اور سماجی حالات ایک ہی سے رہے اس تمام زمانے میں ہر شعبہ حیات کے معیار، اقدار اور دبستان فکر میں بہت کم فرق تھا۔ اس لئے بہ لحاظ ادبی تخلیقات غازی الدین حیدر سے واجد علیشاہ تک کے زمانہ کو ایک ہی دور ماننا پڑے گا۔ اس سے پہلے شجاع الدولہ .... اور آصف الدولہ کا عہد ایک علیحدہ دور تھا اور ان دونوں بڑے ادوار کے درمیان سعادت علی خاں کا عہد وہ عبوری زمانہ تھا جس میں دونوں ادوار کے حدود ایک دوسرے سے ملے بھی اور جدا بھی ہوئے۔ لیکن اگر اس تقسیم کو نظر انداز کر کے لکھنوی تخلیقات کو ایک علیحدہ دبستان فرض کر لیں تو اس کی خصوصیات کے جاننے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اودھ کے عام انسان کا مشترک ذوق متعین کرنا ہوگا اور پھر اس کے پیش نظر وہاں کے ادب کو دیکھنا ہوگا۔

لکھنؤ کے عام انسان کے مطالعہ سے اس کا ذوق متعین ہو سکتا ہے جو وہاں کی تہذیب کا نمائندہ تھا۔ جس سے وہاں کی شاعری، موسیقی اور دوسرے مجلسی ادارے متاثر ہوئے۔ لیکن اس کے تعین میں بھی ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ لکھنؤ کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات شروع سے آخر تک یکساں نہیں رہے اور شجاع الدولہ کے عہد کا آدمی واجد علی شاہ کے زمانے کے انسان

ص۱　نگار جنوری ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۰۶ مقالہ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

سے بہت مختلف تھا۔ ہر دور اپنے رجحانات کا ایک علیحدہ سانچا رکھتا تھا پھر بھی بعض ایسی مشترک خصوصیات ضرور ہیں جن سے ان کے مشترک
اخلاق و کردار کا اندازہ ہو سکتا ہے کیونکہ لکھنؤ نے بھی بغداد اور قاہرہ کی طرح اپنے عام انسان کا ایک ایسا مخصوص کردار ضرور تعمیر کر لیا تھا
جو دوسرے شہریوں کے مقابلہ میں الگ پہچان لیا جاتا تھا۔ اگرچہ کم و بیش اس نوعیت کا انسان دلی، مرشدآباد اور حیدرآباد دکن کے
درباروں میں بھی موجود تھا اور ہندوستان کے ایک دربار کا دوسرے دربار کے مقابلے میں فرق بہت خفیف سا تھا لیکن لکھنؤ کے سیاسی
حالات، ثقافتی خصوصیات، ایرانی اثرات اور مخصوص مذہب کی پابندیوں نے لکھنؤ کے باشندوں میں بعض ایسی باتیں ضرور پیدا کر دی
تھیں جو عام طور پر دوسری جگہ نہیں ملتی تھیں اور ذوق و مزاج کے اسی فرق کی وجہ سے یہاں کے شعر و ادب کا رنگ .... دوسرے علاقوں
کے مقابلہ میں کچھ مختلف تھا۔ لیکن ان کے ادب کے مطالعہ سے لکھنؤ کے مخصوص ذوق کا تعین دشوار ہے۔ کیونکہ ان کے ادب، غزل
مرثیہ، مثنوی، قصیدہ اور قصہ کہانیوں کے مطالعہ سے ان کے عقائد زندگی کا اندازہ تو ہو جاتا ہے لیکن یہ معیار عام اسلامی اور اخلاقی
نقطۂ نظر سے مختلف نہ تھا۔ زندگی کی روایات اور رسمی تصورات میں دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ یکساں تھے اور انھیں کی جھلکیاں ان کے
شعر و ادب میں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دقت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی ماحول سے شعرا کی شدید انفرادیت ان کے کلام میں
ایسا گہرا فرق پیدا کر دیتی ہے کہ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے جب ایک ہی ماحول میر کو الم پرست اور سودا کو ہنسوڑ
بنادے تو ان کے کلام سے روح عصر کے تعین میں دھوکا ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ میں انیس اور امانت ایک ہی عہد اور ایک ہی ماحول
کی شخصیتیں تھیں۔ دونوں کے عقیدے ایک تھے لیکن ان کا مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انیس کربلا جانے کی تمنا ہی کرتے رہے
لیکن امانت زیارت کربلائے معلی سے مشرف بھی ہو آئے۔ انیس غالباً معجزے کے قائل ہی ہوں گے لیکن امانت نے عملی طور پر یہ معجزہ دیکھا
کہ جس گویائی سے وہ دس سال تک محروم رہ چکے تھے وہ کربلا جا کر انھیں واپس مل گئی۔ لیکن دونوں مزاجوں کا فرق یہ تھا کہ انیس
تمام عمر نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ مذہبی نظم لکھتے رہے اور امانت کربلا سے واپس آکر بھی خالص مرثیہ نگار نہ بن سکے انھوں
نے اپنا مشہور واسوخت لکھا اور ہندو دیومالا سے ماخوذ ایک قصہ اندر سبھا کے نام سے اسٹیج کے لئے ترتیب دیا۔ خود فرماتے ہیں۔

جنت ہو بھلا خاک طلبگار امانت　　　کی بدلے عبادت کے تلاش مے پرستی

لیکن شعراء کے اس انفرادی اختلاف مزاج کے باوجود ہر دور کے ادب میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور مل جاتی ہیں جو اس ماحول
یا اس دور کے لئے مختص ہوتی ہیں اور انھیں خصوصیات کے سہارے پر ہم لکھنؤ کے ادب سے وہاں کی زندگی کی خصوصیات کا
تعین کر سکتے ہیں۔ ان کے ادب ہی کے جائزے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اہل لکھنؤ ایسی خصوصیات کے حامل تھے جن سے اس
عہد کے دوسرے باشندے محروم تھے۔ لکھنؤ کا انسان خوش حال تھا۔ اس لئے عیش پسند تھا۔ اسے آرائش اور نفاست کا بڑا احساس تھا
تصنع و تکلف اس کی فطرت میں داخل تھے۔ وہ شرافت کا ایک مخصوص تصور رکھتا تھا۔ جس کی تعمیر میں اس نے ائمہ کی سیرتوں
کے علاوہ محقق طوسی کی اوصاف الاشراف و ملا احمد نراقی کی معراج السعادت اور علامہ مجلسی کی حلیۃ المتقین اور عین الحیات سے بھی
مدد لی تھی۔ اس لئے اس کی نشست و برخاست، وضع و انداز گفتگو بھی جدا تھا۔ وہ بقول چکبست زبان کی شستگی، طبیعت داری
علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ اور حسن تقریر میں بھی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔[1]
غرض اہل لکھنؤ کو ملک کے دوسرے باشندوں سے ممتاز کرنے میں تین باتوں کا زیادہ دخل ہے۔ ایک مخصوص عقیدے کی

---

[1] مضامین چکبست ص ۴۰، ۴۱

روایات کا فروغ۔ دوسرے اودھ کی مقامی خصوصیات اور تیسرے فارغ البالی۔ انھیں تین باتوں سے ان کا مخصوص نظام تہذیب استوار ہوا اتنا انھیں خصوصیات کو ان کی ادبی تخلیقات میں تلاش کریں۔ سب سے پہلے یہاں کے مذہبی عقائد کو لیجئے۔ شاہان دہلی کے عام رجحان کے برخلاف نواب وزیر کا تمام گھرانہ خالصتہً شیعی مسلک کا قائل تھا اس لئے یہاں کی حکومت کے سائے میں شیعی رسم و رواج کو تیزی سے پھیلنے کا موقع ملا۔ دکن کی کئی مشہور ریاستوں میں اگرچہ ان معتقدات کی ترویج تقریباً دو صدی پیشتر ہو چکی تھی لیکن شمالی ہندوستان میں یہ بالکل نیا تجربہ تھا اور مزید یادہ جیتا جاگتا۔ کیونکہ نواب وزیر کا خاندان دکنی حکمرانوں کے مقابلہ میں نو آمدہ ایرانی گھرانہ تھا جس نے اودھ کو نیشاپور اور صفاہان کے شیعی کلچر سے مانوس کیا۔ ہر چند دلی بھی اس کلچر کی بعض خصوصیات سے آشنا تھی لیکن وہاں تو رانیوں کا اثر زیادہ تھا جو اصفہان کے بجائے تورانیوں سے زیادہ متاثر تھے۔

شیعیت اپنے اصول دین میں توحید، رسالت، امامت کی قائل ہے یعنی پہلے خدا۔ پھر نبی اور تیسرے نمبر پر امام۔ لکھنؤ میں جو مثنویاں لکھی گئیں ان کے آغاز میں بھی ہمیں بالکل یہی ترتیب ملتی ہے اور یہ بات محض مسلمان شعراء سے ہی مخصوص نہیں رہی بلکہ خود ہندو حضرات نے بھی یہی دستور برتا ہے مثلاً پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے اکثر حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

ان تینوں اشعار میں سے پہلے شعر میں حمد باری، دوسرے میں نعت سید المرسلین اور تیسرے میں منقبت پنجتن بیان ہوئی ہے اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہاں کے عوام میں یہ اصول و عقائد عام طور پر مقبول تھے اس میں شک نہیں کہ دلی کی بعض مثنویوں میں بھی یہ ترتیب نظر آتی ہے لیکن وہاں یہ دستور عام نہ تھا۔ لکھنؤ میں کوئی صنف سخن یہاں تک کہ نثر تک اس جذبہ سے خالی نہیں۔ انشا کی لطائف السعادت، سلک گوہر اور داستان رانی کیتکی اور سرور کی فسانۂ عجائب تک۔ میں یہ اہتمام موجود ہے۔

اصول دین کی پہلی دو شقوں یعنی وحدانیت اور نبوت پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے لکھنؤ کے ادب میں ان عناصر کی تلاش و جستجو ہمارے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے ضروری نہیں۔ البتہ تیسری شق، عقیدۂ امامت کی ضرور قابل ذکر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میر و مصحفی سے۔۔۔ واجد علی شاہ اختر تک ہر مشہور شاعر نے ہر صنف سخن میں کسی نہ کسی طرح اپنے عقیدے کا اظہار ضرور کیا ہے۔ یہ اظہار یا تو فضائل حضرت علی کی صورت میں یا مدح و توصیف آئمہ اظہار کے طور پر ہوا ہے اور ہندو مسلمان دونوں مذاہب کے شعراء نے اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے۔ اگر لکھنؤ کی غزل اور ریختی جیسی غیر مذہبی اصناف سخن کا جائزہ لیا جائے۔ تو ان میں بھی ہزارہا اشعار ایسے نظر آتے ہیں جن میں حضرت علی یا پنجتن پاک یا چہاردہ معصومین کی عقیدت مندانہ مدح کی گئی ہے۔ اہل بیت سے محبت کا یہ والہانہ جذبہ لکھنؤ میں اتنا عام تھا کہ علماء، خاندان شاہی اور اراکین دولت سے لے کر فقرا اور مردمان بازاری تک ہر شخص اسی جذبہ سے متاثر تھا اور بعد کی گفتگو میں دلائے اہل بیت کا اظہار یہاں کا معمول تھا۔ یہاں تک کہ انشاء کی دریائے لطافت میں بی نوزن اور میر فخر غنی سے خطاب کرتی ہیں "تمہیں علی کی قسم آنکھوں میں مفر چلیو"۔ یہاں کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے قصیدہ کہا ہو اور اہل بیت کی مدح نہ کی ہو۔ شیعی رسوم کے مطابق ولادت حضرت علی کی تقریب ۱۳ رجب کو، ولادت امام ثانی عشر کی تقریب ۱۵ شعبان کو اور عید غدیر ۱۸۔ ذی الحجہ کو منائی جاتی ہے۔ ان تقاریب کو میلاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ طربیہ مجلسیں ہر صاحب ثروت کے مکان پر منعقد ہوتی ہیں۔ لکھنؤ میں ان کا عام رواج تھا اور وہاں کے ہر شاعر کے کلیات میں اس طرح کے مدحیہ قصائد ملتے ہیں مثلاً جرأت

فرماتے ہیں۔

اک جام سے حل کر دے جو عقدہ جہاں کا ہوں مست مئے عشق میں اس پیر مغاں کے
جو کہیے سو لاریب علی نام خدا ہے یارا ہے کسے اس کے مراتب کے بیاں کا

مصحفی بھی تہنیت عید غدیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں[1]

قریب پہنچے جو رحلت کے دن کہہ کر بات کیا نبیؐ نے علی کو وصی بہ خم غدیر
کہ یعنی بعد مرے ہو یہ جانشین مرا کریں متابعت اس کی سبھی صغیر و کبیر
سو تہنیت اسے اس دم تو سب نے دی لیکن ہوا الطون میں بعضوں کا دل شکست پذیر
بابن خیال کہ شاہاں ہیں ہم خلافت کے کہاں یہ مردِ جراں اور کہاں یہ امر خطیر

مصحفی کے کلیات میں حضرت علی، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت امام زین العابدین اور حضرت علی اکبر کی مدح میں علیحدہ علیحدہ قصائد ملتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعراء کے یہاں بھی اہل بیت کی توصیف میں قصائد موجود ہیں جن شعراء نے قصیدے نہیں لکھے انھوں نے اپنی مثنویوں میں حق عقیدت ادا کر دیا ہے اور جنھوں نے مثنویاں بھی نہیں لکھیں انھوں نے اپنی عقیدت کے اظہار کے لئے غزل ہی میں گنجائش نکال لی۔ چنانچہ لکھنوی شعراء کے دواوین اس طرح کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں مثلاً مصحفی حضرت علی کی یکتائی کا اعتراف اس طرح فرماتے ہیں۔

اللہ رے تیری شان کہ باایں ہمہ شوکت پیدا نہ کیا پھر ید قدرت نے علی سا

ایک مقطع میں اپنے لئے دعا مانگتے ہیں۔

تو مصحفی ہے نبی و علی کا مادح سرا تجھے رکھے دو جہاں میں ترا خدا محفوظ

سید انشاء کے کلیات میں بھی اس طرح کے بہت سے اشعار ملتے ہیں مثلاً ایک مقطع میں جناب فاطمہ زہرا سے التجا کرتے ہیں۔

ہے زمانہ یہ برا اپنے غلام انشاء کا آپ رکھ لیجیے یا حضرت زہرا پردہ

حضرت علی سے سلیمان شکوہ کے لئے درخواست ہے کہ

سلیمان کی مدد کو ذوالفقار اپنی علم کیجے امیر المومنین اب اے مرے مولا کرم کیجے

اپنے متعلق احساس ہے کہ:۔

میں شاہ خراساں کے غلاموں میں ہوں انشا مصروف رہے موسیٰ و ہاروں مرے آگے

شہزادۂ سلیمان شکوہ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ:۔

تاج و تخت اپنے سلیمان کو یا شاہ نجف آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

اب لکھنؤ کے دوسرے شعراء کا خراج عقیدت دیکھیے:۔

(ناسخ) بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا
ناسخ کا ادعا ہے یہی روز باز پرس میں ہوں غلام شاہ رسل کے وزیر کا

---

[1] قلمی نسخہ کلیات مصحفی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی

(ناسخ)　لوحِ محفوظ ایک نکتہ ہے علی کے نام کا　　عرش کہتے ہیں جسے زینہ ہے اس کے بام کا

(آتش)　عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا　　دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا
　یہی اللہ سے آتش دعا ہے مردِ مومن ہوں　　حواسِ خمسہ زائل ہوں جو یادِ پنجتن بھولے

(میر دوست علی خلیل)　ولائے ساقیٔ کوثر سے دل لبالب ہے　　شراب اتر ہے اس جام میں قمر کی طرح

(محمد رضا برق)　رتبہ نہیں نظر میں زرِ آفتاب کا　　اکسیر ہے غبار درِ بوتراب کا

(آغا حسن امانت)　عاشق ہوں میں ازل سے رخِ بوتراب کا　　روشن ہے ذرہ ذرہ یہ حال آفتاب کا

(مظفر علی اسیر)　بندے جو ہم ہوئے تو علی کے ہوئے اسیر　　سجدہ کیا تو خاک درِ بوتراب پر
　نام علی ہو وردِ زباں وقتِ نزع بھی　　ہو خاتمہ بخیر الٰہی اسیر کا
　بجائے سرمہ لگاؤں اسیر آنکھوں میں　　جو مجھ کو خاک درِ ابنِ بوتراب ملے

مدحتِ آئمہ اطہار کی طرح واقعہ کربلا کے متعلق بھی کافی اشارات وہاں کے ادب میں ملتے ہیں۔ صنفِ مرثیہ تو خیر ان واقعات کے لئے مخصوص ہی تھی۔ لیکن غزل کے دامن میں بھی ان خیالات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بیشتر اردو اشعار براہ راست کربلا کے حادثات اور ان کے متعلق تاثرات کا اظہار کرتے ہیں اور لکھنوی شاعری کا یہ پہلو ایسا پسندیدہ تھا کہ منہ داد منہ، شاہ سلیمان اور شاہ نصیر وغیرہ تک۔ شاہی عہد کے بعد لکھنؤ میں جو غزل لکھی گئی اس میں غم و الم کے عناصر زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں جسے بعض لوگوں نے فضائے مرثیہ کے تاثر سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن شاہی دور میں غم کا تاثر اتنا گہرا نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ لکھنؤ کی پیداوار ضرور تھا لیکن یہ بات کسی طرح درست نہیں کہ لکھنوی ادب مرثیہ کی پیداوار تھا۔ جب تک شاہی رہی زندہ دلی اور شگفتگی سے وہاں کا دامن بندھا رہا۔ اس زندہ دلی کے آثار ان کی شاعری میں چھائے ہوئے ہیں لیکن شہدائے کربلا سے ان کی عقیدت اپنے اظہار کے لئے ایک ذریعہ چاہتی تھی۔ اس کے لئے انھوں نے مرثیے بھی کہے اور دوسری اصنافِ سخن میں بھی اپنے اظہارِ عقیدت کے لئے گنجائش نکال لی۔ حد یہ ہے کہ ان کے خلوص نے غزل کے حصار میں بھی اپنا راستہ بنا لیا اور یہاں بھی تبلیغ واقعات کربلا کہیں براہ راست اور کہیں مصطلحات، تلمیحات اور ایمائیت کے انداز میں ہوتی رہی براہ راست اظہارِ عقیدت کا اسلوب ان کی غزلوں میں یہ رہا ہے:۔

(انشا)　دل شاد رکھ انشا متفکر نہ ہو ہرگز　　عقبیٰ میں ترے حل حضرت شبیر کریں گے
"　جو شخص طالب حسین کا ہو تصدق ایسے نرگس طرح ہوں　　غلام قدری ہوں جی سے انشا شہید میدان کربلا کا
(ناسخ)　بحمد اللہ میرا مطلوب ناسخ　　جگر بند امام الانس والجان ہے
"　میری آنکھیں روتی ہیں ناسخ اسی افسوس میں　　آہ ہم تر ہیں لب آلِ پیمبر خشک ہو

زندگی اور ادب شاہان اودھ کے عہد میں

(ناسخ) فکر کر اپنی ہی ناسخ کا نہ غم کھا زاہدا — شافع اس کا بادشاہ کربلا ہو جائے گا

(آتش) آتش اہل کربلا سے چل کے اب کہتا ہوں میں — اے خوشا طالع تمہارے ساکنانِ کوئے دوست

" دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو — یہ مشت خاک ہووے کربلا کی خاک سے پیدا

(دوست علی خلیل) عشق اسکے نقش پا کا مرے دل نشین ہوا — طفلی میں جو کہ دوش نبیؐ کا مکین ہوا

(مظفر علی اسیر) آتا ہے محرم تو اسیر آہ و بکا سے — دس روز مجھے ہوش برابر نہیں آتا

لکھنوی غزل نے جہاں جہاں شہدائے کربلا کے واقعات سے اپنی تخئیل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مدد لی ہے وہ حصہ بڑی انفرادیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ عنصر دہلوی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے اور وہاں کے شعراء نے بھی اس طرح کے اشعار کافی تعداد میں کہے ہیں جن میں محسوس ہوتا ہے کہ عزائے حسین ان کے تخئیل میں بھی شامل تھی۔ مثلاً۔

(میر تقی میر) جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رلائیں — تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

(ذوق) جہاں میں عرصۂ عشرت کے سوا وہ چند ہے غم کا — اگر ہو عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

(مومن) سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے — کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

لیکن لکھنوی شعراء نے اس پہلو کو اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ یہ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت بن گیا ہے۔ ان کے دواوین میں سینکڑوں اشعار اس طرح کے موجود ہیں جو واقعات کربلا سے متاثر نظر آتے ہیں مثلاً۔

(مہاراجہ جسونت سنگھ پروانہ) تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب — ترے کوچے کو کربلا جانتا ہے

(مصحفی) ایک ہاتھ صرف سینہ زنی جسطرح ہوا — ماتم میں دل کے وقف گریباں ہے دوسرا

" مر گئے جب ہم تو اس نے اہل زینت سے کہا — اب ہمیں چالیس دن مہندی لگانا منع ہے

(ناسخ) روز مرگ آرزو ہے تا بہ کے ظلم کیجئے — تا کجا دست دعا کر وقف ماتم کیجئے

" زمانے کے ستم سے روز ناسخ — نئی اک کربلا ہے اور میں ہوں

(آتش) لالہ و گل میں زمیں پر تو فلک پر ہے شفق — رنگ کیا کیا ہوئے خون شہدا سے پیدا

(دوست علی خلیل) جھوٹی چاہت نہ جتائی کبھی میں نے اس پر — کوفہ والوں کی طرح مکر و دغا کیا کرتا

" صورتِ کعبہ سیہ پوش رہوں کیوں نہ خلیل — ایک مدت سے ہوں میں دل کے عزاداروں میں

(محمد خاں رند) اب کی تو چہلم میں آئے نہ زیارت کو اگر — علم حضرتِ عباس ہی کی مار پڑے

" مرتے تھے یوں نہ تشنۂ دیدار آن کر — قاتل گلی تھی آگے تری کربلا نہ تھی

(امداد علی بحر) سر فروشانِ محبت کی ہے مٹی بھی عزیز — دیکھو قبرِ شہدا جائے ادب ہوتی ہے

(خواجہ وزیر) بے جرم و بے گناہ نہ عاشق کو قتل کر — کعبہ تری گلی ہے کہیں کربلا نہ ہو

" دلایا فاتحہ قاتل نے اکثر آب آہن پر — پس مردن بھی یاد اس کو مری تشنہ دہانی ہے

(دبیر) خاک اپنی ہو بن کے گئی دست یار میں — شکر خدا کہ ہم بھی اب آئے شمار میں

(امان علی سحر) غول کے غول چلے آتے ہیں پرسے کے لئے — گھر میں یہ دھوم دھڑکا ہے لحد سرائی ہے

(مظفر علی اسیر) دل چاک چاک ابروئے خمدار نے کیا — کعبہ کو کربلا تری تلوار نے کیا

(مظفر علی اسیر) وہ خاکسار ہیں کہ لیں مرگ بھی اسیر — مرتے ہماری قبر میں خاک شفا کے ہیں

(محمد رضا برق) فراق یار میں محفل ہے مجلس ماتم — بھرے ہیں دیدۂ ساغر میں اشک جائے شراب

موتیوں کا ڈھیر جوش اشک سے دامن میں ہے — دامن دولت ہماری جیب پیراہن میں ہے

(محسن کاکوروی) ترے موئے مشکیں بلا در بلا — ہر اک طرۂ ہنگامۂ کربلا

غرض اس طرح کے سینکڑوں اشعار ان کے دواوین میں موجود ہیں۔

شیعی روایات میں فضائل اہل بیت، مسئلہ امامت اور عزاداری حسین کے علاوہ بعض اور رواسم بھی شامل ہیں جو محض شیعوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً میت کے دفن ہوتے وقت مرنے والے کا شانہ ہلا کر ایک دعا پڑھی جاتی ہے۔ جسے تلقین کہتے ہیں اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ فلاں بن فلاں سن لے اور سمجھ لے کہ جب تیرے پاس خدا کے مقرب فرشتے آئیں اور وہ خدا، رسول، آئمہ اور قیامت کے متعلق تجھ سے سوال کریں تو جواب دینا کہ اللہ میرا رب ہے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں اور حضرت علی سے تا امام ثانی عشر یارہ میرے امام ہیں۔ قرآن میری کتاب ہے اور قیامت، جنت اور نار حق ہیں وغیرہ یہ تمام باتیں میت کا شانہ ہلا کر کہی جاتی ہیں۔ حکیم مومن خاں دہلوی نے اسی رسم سے یہ تخئیل پیدا کی ہے۔

خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومنؔ مرا شانہ ہلاتا ہے

لکھنؤ کی شاعری میں اس طرح کے متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں ان مخصوص رسوم سے مدد لی گئی ہے مثلاً ناسخ فرماتے ہیں:۔

قبر میں بہر خدا نام بتوں کے لینا — دوستو! وقت اگر آئے مری تلقین کا

اس طرح شیعی روایات و عقائد کی بہت سی جھلکیاں لکھنوی ادب میں موجود ہیں۔ اور وہاں کی غزل سے بھی زندگی کے رسوم ورجحان پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح کے چند اشعار یہاں بطور نمونہ نقل کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مدفون ہونے کے بعد پنجتن یا آئمہ معصومین کے معتقدین پر قبر کی مشکلیں خود بخود آسان ہو جاتی ہیں یا پھر سوال و جواب کے وقت خود حضرت علی قبر میں تشریف لا کر مومنوں کی امداد فرماتے ہیں اور منکر و نکیر کے سوالوں کے جواب بتاتے ہیں۔ وزیر علی صبا کے شعر میں اس طرف اشارہ ہے۔

اے صباؔ زندۂ جاوید ہوئے ہم پس مرگ — خانۂ قبر میں تشریف جو مولا لائے

مظفر علی اسیر فرماتے ہیں۔

کب سوال قبر سے ممکن تھا چھٹکارا اسیرؔ — خیر گذری ہم کو نام پنجتن یاد آ گیا ہے

(۲) حضرت علی کی محبت انسانوں کو عذاب قبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ کیوں کہ آپ ابو تراب ہیں اسی عقیدے کے پیش نظر آتش دعا کرتے ہیں۔

آتشؔ کی التجا ہے یہی تم سے یا علی — صدمہ نہ ہو فشار لحد کے عذاب کا

(۳) کربلائے معلیٰ میں جو لوگ مدفون ہوں گے وہ سوال و جواب اور عذاب قبر سے محفوظ رہیں گے آتش لکھتے ہیں

دعائے آتشؔ خستہ یہی ہے روز حشر کو — یہ مشت خاک ہو وے کربلا کی خاک سے پیدا

دوست علی خلیل فرماتے ہیں -

اس کی گلی میں گر کر کھٹکا نہیں ہے کوئی — مومن پہ کربلا میں کیونکر عذاب ہوگا

امداد علی بحر کہتے ہیں -

شہیدان خدا تھوڑی سی مجھ کو بھی جگہ دینا — نہ ہو بیمار میری خاک ہمسائی تربت کا

(۴) کفن کے اس حصہ پر جو سینہ کی طرف ہوتا ہے خاک شفا سے شہادت نامہ لکھا جاتا ہے جس میں میت کے عقائد کی تفصیل مع گواہی کے ہوتی ہے۔ مصحفی کے ایک شاگرد کے اس شعر میں اس طرف اشارہ ہے۔

لکھا ہے خاک کوئے یار سے اے دیدۂ گریاں — قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا

نور الاسلام منتظر نے بھی یہ شعر کہا ہے۔

بہر خدا عزیزاں جائے جواب نامہ — اس بت کا نام لکھیو میرے کفن کے اوپر

(۵) ولائے اہل بیت محشر میں گناہ گاروں کی شفاعت کرتی ہے۔ اس لئے بعض شاعروں نے اس طرح کے خیالات پیش کئے ہیں۔ منور خاں غافل لکھتے ہیں۔

خوف محشر سے کیا ہمیں غافل — پیرو آل مصطفےٰ ہیں ہم

نور الاسلام منتظر فرماتے ہیں۔

ہے منتظر کے دل میں مشکل کشا کی الفت — آسان ہو اس کی مشکل روز حساب یارب

امداد علی بحر فرماتے ہیں -

اے رب کریم جب مرا دم ٹوٹے — قزاق اجل متاع ہستی لوٹے

امید یہ ہے تیری عنایت سے مجھے — پنجے سے نہ پنجتن کا دامن چھوٹے

(۶) عام عقیدہ ہے کہ حضرت رسول مقبول نے معجزہ دکھایا اور چاند کو انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے کر دیا اور حضرت علی نے سورج کو مغرب سے واپس لوٹا دیا - اس خیال کو مصحفی نے اس طرح نظم کیا تھا۔

جو علی کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں — یہ گہہ غروب آیا نکل آفتاب الٹا

ناسخ فرماتے ہیں -

رجعت خورشید اور شق القمر سے ہے عیاں — ہے نبی مالک لیالی کا علی ایام کا

(۷) حضرت علی نے کلام پاک جمع کیا۔ اس کی طرف محمد رضا برق اس طرح اشارہ کرتے ہیں -

شیرازہ کیوں نہ دفتر کونین کا کہوں — جامع جہاں میں ہے خدا کی کتاب کا

(۸) نیمۂ شعبان میں حضرت امام آخر الزماں کی پیدائش ہے۔ اس سحر کو لوگ دریا پر جا کر ایک عریضہ پانی میں ڈالتے ہیں۔ جس میں ان کے مقاصد دلی کے پورا کرنے کی دعا ہوتی ہے۔ اس سے ناسخ نے یہ خیال پیدا کیا ہے

یوں قلزم اشک میں ہے میرا نامہ — دیتے ہیں عریضہ جس طرح دریا میں

دوست علی خلیل لکھتے ہیں

جب خط لکھا ہے یار کو رو رو دیا ہوں یہ خلیل — دریا میں آنسوؤں کے عریضہ بہا دیا

گلگت ــ جہاں تیل پہونچانے کے لئے خطرناک پرواز سے دوچار ہونا پڑتا ہے

برماشیل کی لاریاں آپ نے اکثر دیکھی ہوں گی - یہ لاریاں برماشیل کی تقسیم کاری کا ایک اہم جز ہیں اور سیال ایندھن اور مزلقات کو گاؤں گاؤں اور شہر شہر بانٹتی پھرتی ہیں - لیکن پاکستان کے بعض پہاڑی علاقے ایسے بھی ہیں جو ان لاریوں کی رسائی سے باہر ہیں - مثلاً گلگت - چنانچہ گلگت کے علاقہ میں جو تیل یا تیل کی مصنوعات استعمال ہوتی ہیں انھیں برماشیل پی آئی اے کے ڈکوٹا طیاروں کے ذریعہ بھیجتی ہے - غرض ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں برماشیل تیل نہ پہونچاتی ہو -
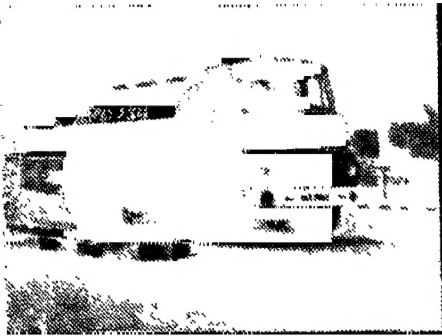
برماشیل

کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

نگار پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر (سالنامہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت:۔ تین ۳ روپے

مصحفی نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت:۔ تین ۳ روپے

نظیر نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں نظیر اکبرآبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ اس کی قدرت بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری۔ اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت:۔ تین ۳ روپے

غالب نمبر سالنامہ ۱۹۶۱ء۔ جس میں مرزا غالب کی فارسی و اردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے طلباء اور شائقین ادب کے لیے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ قیمت۔ چار روپے

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا باسط تذکرہ موجود ہے۔ قیمت۔ چار روپے

نگار پاکستان کا سالنامہ ۶۳ء

"نیاز نمبر" ہوگا

جس میں تقریباً ملک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اہل ادب شریک ہو رہے ہیں۔
اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً
ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب
نگاری، مذہبی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری، ادارتی زندگی، نیز
ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل
بحث کرکے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا
جائیگا۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت
و فن کا ایک ایسا مرقع ہوگا جو اس
سلسلے میں ایک مستند دستاویز
کی حیثیت رکھیگا اور علم
و ادب کی تاریخ
میں یاد رہیگا۔